نجوم الفرقان
من تفسیر آیات القرآن
جلد اول
از رشحات قلم
حضرت علامہ مولانا
عبد الرزاق
ناشر
ضیاء العلوم پبلی کیشنز
راولپنڈی پاکستان

نجوم الفرقان في تفسير القرآن

کتاب لاریب کی توضیحات وتشریحات، علوم عقلیہ ونقلیہ کی روشنی میں
علمی وتحقیقی ذوق رکھنے والوں کے لئے قدیم وجدید احکامات ومسائل پر ابحاث کا حسین مرقع
تفسیر القرآن بالقرآن، ارشادات نبویہ، اقوال صحابہ، تحقیقات اسلاف اور روایات صحیحہ پر مشتمل تفسیر

مسمّٰی بہ

نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

جلد اوّل

مقدمہ تفسیر وسورۂ فاتحہ

از رشحات قلم

محقق اہلسنت
استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا
عبد الرزاق بھترالوی ہزاروی
مدظلہ العالی

ناشر ضیاء العلوم پبلی کیشنز راولپنڈی پاکستان

نام کتاب: نجوم الفرقان من تفسیر آیات القرآن

تصنیف: علامہ مولانا عبد الرزاق چشتی بھترالوی

کمپوزنگ: ضیاء العلوم کمپوزنگ سنٹر سیٹلائیٹ ٹاؤن راولپنڈی

کمپیوٹر گرافکس: قاضی محمد یعقوب چشتی، اظہر اقبال اعوان

ضخامت: $\frac{20 \times 30}{8}$ 424 صفحات

پروف ریڈنگ حافظ محمد صدیق چشتی گولڑی، خواجہ وقار احمد، حافظ محمد رستم بھترالوی

بارطبع : دوم فروری 2007ء

قیمت: 160/= روپے

ناشر: سید شہاب الدین شاہ

ضیاء العلوم پبلی کیشنز راولپنڈی پاکستان

رابطہ: 0333- 5166587 - Fax 051-4580404
Email:ziauloom@isb.paknet.com.pk

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اظہارِ تشکر

راقم نے تفاسیر کے گہرے مطالعہ کی غرض سے تفاسیر سے کچھ مضامین و نکات کو قلمبند کرنا شروع کیا تا کہ متوسط درجہ کے طلباء بھی ان سے فائدہ حاصل کر سکیں۔

منتہی طلباء کرام اور علماء عظام یقیناً راقم سے بہتر عربی تفاسیر سے مضامین اخذ کر سکتے ہیں۔

بہر حال راقم کی محنت و کاوش کو سراہتے ہوئے اور جس طرح مبتدی طالب کی تقریر و تحریر پر اسے مزید محنت جاری رکھنے کے لئے کوئی محقق و مدقق ھدیہ تبریک پیش کرے۔

اسی طرح استاذ العلماء رئیس الاتقیاء حضرت علامہ پیر سید حسین الدین شاہ مدظلہ العالی شیخ الحدیث جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی نے بھی راقم کی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے۔ عظیم اور جامع و مانع تقریظ تحریر فرما کر راقم پر احسان عظیم فرمایا۔

باوجود اس کے کہ آپ گوناگوں مصروفیات میں ہمہ وقت رہتے ہیں۔ راقم آپ کا شکر گذار ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزاء خیر عطا فرمائے۔ آمین

۔راقم کی کتب کی طباعت محترم و مکرم حضرت علامہ سید شہاب الدین صاحب مدظلہ العالی ناظم اعلیٰ جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ مالی بوجھ کو اٹھانا ایک عظیم کام ہے۔ آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزاء خیر عطا فرمائے، علم و عمل و عمر میں برکت عطاء فرمائے۔ آمین

کمپوزنگ میں عزیزم مولانا محمد اسحاق ظفر صاحب مدرس جامعہ رضویہ ضیاء العلوم اور مولانا محمد یعقوب صاحب اور انکے رفقاء معاونت فرماتے ہیں۔ ان تمام کا بھی شکر گذار ہوں اللہ تعالیٰ ان کو جزاء خیر عطا فرمائے

اللھم وفقنا لما تحب و ترضی یا رب العالمین

آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

عبدالرزاق بھترالوی

1-7-2002

﴿پیش لفظ﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى اَشْرَفِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ

أما بعد ! خالقِ کائنات جل جلالہ نے اپنے پیارے حبیب ﷺ کی نسبتِ جلیلہ کا صدقہ اس اُمت کو جو ابدی پیغام قرآن مجید فرقانِ حمید کی صورت میں انعام فرمایا وہ بے مثال کلام ہے۔ یہ عظیم معجزہ ہونے کے ساتھ ساتھ علم و معرفت کا بحرِ زخار ہے۔ اس بحرِ بے کنار میں جس نے بھی نیک نیتی سے غوطہ لگایا نئے موتی نکال کر لایا۔ اس کے دُرہائے یگانہ غیر متناہی ہیں۔ نہ ختم ہونیوالے اس سلسلہ کو اُمتِ مسلمہ کے کاملین نے ہر دور میں اپنائے رکھا اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے حکمت و دانش کے عظیم باب رقم فرماتے رہے۔

باب مدینة العلم حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عظمت قرآنی اور اس کے رموز و دقائق کے دُرہائے بے بہا اور نہ ختم ہونے والی حقیقتوں کے متعلق مرفوعاً روایت فرمائی ہے۔

" قال اما انی سمعت رسول اللّٰه ﷺ يقول الا انها ستكون فتنة قلت ما المخرج منها يا رسول اللّٰه ؟ قال كتاب اللّٰه ، فيه نبأ ما قبلكم و خبرما بعدكم و حكم ما بينكم ، هو الفصل ليس بالهزل ، من تركه من جبار قصمه اللّٰه ومن ابتغى الهدىٰ فى غيره اضلّه اللّٰه ، وهو حبل اللّٰه المتين ، وهو الذكر الحكيم ، وهو الصراط المستقيم ، هو الذى لا تزيغ به الأهواء ولا تلبس به الألسنة ، ولا يشبع منه العلماء ، ولايخلق عن كثرة الرد ، ولا ينقضى عجائبه هو الذى لم تنتبه الجنُّ اذا سمعته حتى قالوا انا سمعنا قرانا عجبًا يهدى الى الرشد فامنا به من قال به صدق ، ومن عمل به اجر ، ومن حكم به عدل ، ومن عاد اليه هدى الى صراط مستقيم . "

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خبردار میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ فرماتے تھے خبردار بے شک یہ قصہ عنقریب فتنہ بنے گا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ اس کے نکلنے کی جگہ کوئی ہوگی۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ کی کتاب: کیونکہ اس میں تم سے پہلے اور بعد والی امتوں کی خبریں ہیں اور تمہارے درمیان جو حوادث ہیں ان کا بھی فیصلہ ہے۔ یہ قرآن حق و باطل کے درمیان فرق کرنیوالا ہے۔ جس نے اس کو کسی جبار کی وجہ سے چھوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو توڑ دے گا اور جس نے اس کے غیر میں ہدایت کو تلاش کیا اللہ نے اس کو گمراہ کر دیا۔ کیونکہ یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے۔ یہ ذکر، حکم اور صراط مستقیم ہے۔

یہ وہ کلام ہے کہ اہل ہواء اس کی تبدیلی پر قادر نہیں ہیں۔ اس کی وجہ سے زبانوں پر التباس نہیں آتا۔ اس سے علماء سیر نہیں ہوتے۔ اس کی قرأت کی تکرار بار بار لوٹاتے، قرأت کی لذت دوسروں سے سننے کی وجہ سے زائل نہیں ہوتی، کیونکہ اس کے عجائب ختم نہیں ہوتے، یہ وہ چیز ہے کہ جنوں نے جب اس کو سنا تو اس پر بلا توقف کہا کہ: ہم نے تعجب میں ڈالنے والے قرآن کو سنا ہے، جو بھلائی کی طرف ہدایت دیتا ہے، ہم اس پر ایمان لائے، جس نے اسکے ساتھ کلام کیا وہ سچا ہوا، اور جس نے اس پر عمل کیا اس کو اجر دیا گیا، اور جس نے اس کے ساتھ فیصلہ کیا اس نے عدل کیا، جس نے اس کی طرف بلایا اس کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت دی گئی۔

حضرت امام شعرانی اپنی مشہور زمانہ تصنیف ''الیواقیت والجواہر'' میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا وہ ارشاد گرامی نقل کرتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر سورۂ فاتحہ شریف کی تفسیر لکھوں تو اس ایک چھوٹی سورت کے رموز کی تفسیر کا حجم اونٹوں کا بوجھ بن جائے مگر پھر بھی فاتحہ شریف کے رموز باقی رہیں گے۔

تاہم جس نے بھی اپنی فکر و دانش کو غالب کر کے قرآن مجید کے مفاہیم کو بیان کرنے کی کوشش کی اس کیلئے " من قال فی القرآن برأیه فقد أخطأ " کے مصداق خائب و خاسر ہونا ہی نصیبہ بنا ہے

استاذ العلماء حضرت مولانا عبدالرزاق چشتی بھترالوی کہنہ مشق، نہائت محنتی اور فاضل مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ زود نویس اور سہل نگاری کے بھی جامع ہیں۔ آپ ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جنہیں قسام ازل نے پیارے حبیب لبیب ﷺ کی نسبت صدقہ خدمت دین کی سعادت رفیق فرمائی ہے۔

اللہ تعالیٰ جل مجدہ نے علامہ موصوف کو اسلام کی خدمت اور بالخصوص قرآن وسنت کے مفاہیم اور مطالبِ عالیہ کو قلم وقرطاس کے ذریعہ سہل انداز میں پیش کر کے عامۃ الناس کو بہرہ مند کرنے کا بہترین ملکہ ودیعت فرمایا ہے۔

حضرت مولانا فطری اور طبعی طور پر تدریسی شعبے سے متعلق ہیں۔ علمی خانوادے کا چشم و چراغ ہونے کے ناطے معقولات ومنقولات میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ زندگی کا بیشتر حصہ اسی نہج پر راہ نوردی کرتے گزار دی ہے۔ آپ کے تلامذہ میں سے کئی محقق علماء اپنے علم و تحقیق کا لوہا منوا چکے ہیں۔

درس و تدریس سے متعلق آدمی کے لئے آسان پیرائے میں لکھنا کافی مشکل کام ہوتا ہے؛ کیونکہ ایسے شخص کو...... جو ہمہ وقت فنی اصطلاحات اور علمی محاورات بولنے اور کہنے کا عادی ہو...... مشکل تراکیب کو ترک کرنا قدرے دشوار ہوتا ہے۔ مگر مولانا موصوف اپنی تحریر میں پختگی زود نویسی کے ساتھ

عامۃ الناس کے فہم وادراک کا بھی پورا خیال رکھتے ہیں۔

آپ کے قلم سے کئی علمی شہپارے منصہ شہود پر آچکے ہیں، اہل علم اور قدردان عامۃ الناس کے ہاں قبولیت کا شرف پاچکے ہیں۔ میرے خیال میں آپ کی تصنیفات میں بالخصوص نصابی کتب کی شروحات وحواشی آپ کا بہت ہی وقیع کارنامہ ہے۔ اردو خواں طبقہ کے لئے یا درمیانے درجے کے خطباء کے لئے اردو کتابیں ہی بڑا سرمایا ہیں۔ ایسی کتابوں کی مقبولیت مصنف کے لئے حوصلہ افزائی کا باعث ضرور بنتی ہے لیکن وہ پائیدار فائدہ جس سے قابل علماء ومدرسین پیدا ہوتے ہیں وہ درسی کتابوں کا فہم وادراک ہی ہے۔

مولانا موصوف کی تصانیف میں عام قاری اور زیر تعلیم طلباء کیلئے ہی نہیں بلکہ ایک استاد کی سہولت کیلئے کافی علمی مواد موجود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی عربی تصنیفات کو اہل علم کے ہاں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ چند سال پہلے مجھے ساؤتھ افریقہ جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک علمی مجلس میں انڈیا سے تشریف لائے ہوئے ایک عالم دین سے ملاقات ہوئی، جب انہیں یہ علم ہوا کہ میرا تعلق جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی پاکستان سے ہے تو بڑی خوشی کا اظہار فرمایا اور بتایا کہ حضرت مولانا عبدالرزاق چشتی بھترالوی کا نور الایضاح پر عربی حاشیہ ہمارے ہاں بڑا مقبول ہے۔ اس حاشیہ وتوضیح کو اہل علم نے بڑا پسند کیا ہے۔ ہندوستان میں اس حاشیہ کی الگ سے طباعت کرا کر دینی مدارس میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔

حضرت علامہ بھترالوی کا انداز تحریر انتہائی سادہ اور عام فہم ہے۔ آپ قلم براشتہ لکھنے کے عادی ہیں۔ ادبی موشگافیوں کی طرف کم ہی توجہ دیتے ہیں۔ تاہم مسائل ومفاہیم کا تذکرہ کرتے وقت اسلاف کرام کا تتبع کرتے ہوئے کوئی پہلو تشنہ چھوڑنے کو عار سمجھتے ہیں۔ آپ کی تحریر کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ درس نظامی کے باذوق طلباء کو دورِ اسلاف کا کوئی عظیم مدرس سبق پڑھا رہا ہے اور کتاب کی عبارت کے مالھا اور ماعلیہا سے کوئی بھی نکتہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔

حضرت مولانا ایک طویل مدت تک جامعہ رضویہ ضیاء العلوم کے تدریسی شعبہ میں عظیم الشان خدمات انجام دیتے رہے۔ ہم نے آپ کو انتہائی محب اور شفیق پایا۔ آپ کی ہمہ جہت شخصیت میں اور خوبیوں کے علاوہ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آپ وقت کی قدر کو جانتے ہیں۔ اور ضیاع وقت اور اس کے نقصانات کا انہیں بھرپور احساس ہے۔ اس لئے اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرتے۔ تدریسی خدمت بھی

بہت محنت اور محبت سے انجام دیتے ہیں ، بلکہ طلباء پر شفقت کرتے ہوئے ادارہ کے مقررہ تعلیمی وقت سے زائد اضافی اسباق پڑھاتے ہیں ۔ یہ استاد کی شفقت اور اپنے تلامذہ سے انتہائی محبت کی علامت ہے کہ زانوئے تلمذ طے کرنے والے طلباء کی تعلیم و تربیت شفقت و محبت سے انجام دے ۔

زیرِ نظر تصنیف قرآن مجید فرقانِ حمید کی تفسیر کا مقدمہ اور سورۃ فاتحہ کی تفسیر جو کہ حضرت مولانا کی تدریسی و علمی تحقیقات کا پَرتو اور مظہر ہے ۔ اگرچہ میں اس کا پورے طور پر مطالعہ نہیں کر پایا تاہم چند ایک مقامات سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ۔ دیکھ اور پڑھ کر دل سے دعا نکلتی ہے ۔ **اللھم زد فزد ۔**

مقدمہ ، تفسیر کو دیکھ کر جو تأثر قائم ہوا ہے وہ یہ کہ حضرت علامہ کی زندگی درس و تدریس کرتے گزری ہے ۔ طلباء و علماء کو پڑھانے ، سمجھانے ، ان کے ذوق طبع کے مطابق انداز بیاں اور حسب استعداد طرز تکلم اپنانے کا سلیقہ و مہارت ہے ۔ اور دوسری طرف فقہی مسائل و معاملات سے متعلق فتاوٰی کی ذمہ داری بھی ایک عرصہ سے نباہ رہے ہیں جس کے باعث عامۃ الناس کو درپیش مسائل اور ان کے افہام و تفہیم کا تجربہ بھی رکھتے ہیں ۔ بایں ہمہ دارالحکومت اسلام آباد میں امامت و خطابت کی سرکاری ذمہ داری کے باعث دورِ جدید کی ضروریات ، جدت پسند طبقہ کی مذہبی و فکری ترجیحات و رجحانات اور ذہنی ارتقاء و تنزل سے بخوبی واقف ہیں ۔ لہٰذا آپ کی تحریر میں ہر طبقہ کے لوگوں کی علمی تشفی کا ساماں ہے ۔ البتہ آپ کی حیات پر تدریسی رنگ غالب ہونے کی وجہ سے آپ کی اس تصنیف میں بھی تشریف و توضیحات کے ضمن میں یہی تدریسی ذوق غالب نظر آتا ہے ۔

اسلاف کرام کی محبت و مودت میں راسخ ہیں ۔ اختلاف آراء کی بھول بھلیوں میں بھی اسلاف کرام کی تحقیقات انیقہ سے اکتساب فیض کرنے کو اپنے لئے سعادت گردانتے ہیں ۔ انتہائی کھلی طبیعت کے مالک ہیں ۔ جی میں آئی بات کو کہہ گزرنے میں باک نہیں رکھتے ۔

حضرت علامہ کا تعلق جس علمی خانوادے سے ہے وہ اپنی عظیم تاریخ اور روشن ماضی کے اعتبار سے انتہائی اعلیٰ اقدار کا حامل ہے ۔ عصر حاضر کی ہمہ ہمی میں کئی ایک سلف صالحین کے راہِ حق کو خیر باد کہہ چکے ہیں مگر آپ کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہ آئی ۔ یہ آپ کی ثابت قدمی کا ہی مظہر ہے کہ تنہا آپ نے تحریری میدان میں وہ کام کر دکھایا جو ایک پوری جماعت کے لئے بھی مشکل نظر آتا ہے ۔

حق گوئی و بے باکی کے ساتھ ساتھ مولانا جب بھی اپنے مذہبی و مسلکی مخالفین کو مخاطب کرتے

ہیں یا کسی اختلافی مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہیں تو اسلامی و اخلاقی اقدار کا بھرپور خیال رکھتے ہوئے انتہائی شستہ انداز میں مخاطب کرتے ہیں۔ اور اصلاح و تبلیغ کے جذبہ سے سرشار ہو کر مخالفین اور ان کے پیروکاروں کو راہِ خطر سے محفوظ کرنے کا تہیہ کئے نظر آتے ہیں۔

دعا: اے ارحم الراحمین! اے **اجیب دعوۃ الداع اذا دعان** کی شان والے رب! تیرے جود و سخا کے مظہر، تیری رحمتوں کی بھرن عطا کرنے والے حبیب لبیب ﷺ نے تیری یہ شان ہمیں بتائی ہے کہ تو اپنے منگتوں کو خالی دامن نہیں لوٹاتا۔ اپنے سائل کو خالی ہاتھ لوٹاتے ہوئے تجھے حیا آتی ہے۔

الٰہی! تیری اسی کریمی کا واسطہ دے کر التجا کرتا ہوں کہ میری اس دعا کو شرف قبولیت سے نواز!

''مولائے کریم حضرت مولانا کے علم و عمل میں برکتیں عطا فرما۔ ان کی اس تصنیف کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں اپنی خصوصی نصرت عطا فرما۔ ان کے فیضان علمی کو اور زیادہ وسعتیں دے ان کی ذریت نسبی و حسبی کو ان کا حقیقی متبع بنا۔ ہم سب کو اپنے پیارے حبیب ﷺ کی حقیقی محبت سے آشنا فرما اور اسی میں زندہ رکھ اور اسی محبت میں ہمارا خاتمہ فرما۔''

ایں دعائے من واز جملہ جہاں آمین باد

ان دعوات صالحہ اور ہدیہ تحسین کے ساتھ حضرت مولانا موصوف بلکہ ہر پائیدار، نفع بخش اور محنت طلب کام میں مصروف بزرگ کو مشورہ پیش کرتا ہوں کہ کئی دفعہ معاصرانہ چشمک سے پیدا ہونے والے مرض تحاسد یا ناپختہ اذہان کی کج بحثی فروعی و غیر ضروری ابحاث کے گرداب میں پھنسا کر دانستہ یا نادانستہ طور پر مقاصد عالیہ کی راہ سے برگشتہ کر لیتے ہیں۔ مقصد رفیع کی خاطر ان سے تغافل برتنا ضروری ہے ورنہ اصلی مقصود پیش نظر رہنے کی بجائے ''شخصیت'' مقصد بن جاتی ہے۔ لہٰذا خیر خواہی اسی میں ہے کہ ایسے جذبات انگیز موقع پر نہایت صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے " **والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس** "اور" **اذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما** "کو مشعل راہ بنایا جائے۔

وصلی اللہ تعالٰی علی خیر خلقہ محمد و علی آلہ واصحابہ اجمعین

ابوالخیر حسین الدین غفرلہ (مہتمم و شیخ الحدیث)
جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی پاکستان

مقدمہ

﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾

" اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ الْقُرْآنَ عَلٰی اَفضَلِ الْاَنْبِیَاءِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَفضَلِ الْخَلْقِ مُحَمَّدِ نِ الْمُصْطَفٰی وَعَلٰی آلِهِ الْمُجْتَبٰی اَمَّا بَعْدُ !

فضائل القرآن:

قرآن پاک تمام کتب سے افضل ہے پھر قرآن کی بعض سورتیں بعض سے اور بعض آیات بعض سے مراتب، کثرتِ ثواب اور مضامین کی اہمیت کے لحاظ سے فضلیت رکھتی ہیں۔

نبی کریم ﷺ کے ارشادات سے یہ مسئلہ بہت واضح طور پر سمجھ آ سکتا ہے۔ ارشادات مصطفویہ کو دیکھیں۔

" یٰس قلب القرآن " سورۂ یٰسین قرآن پاک کا دل ہے۔ "فاتحۃ الکتاب افضل سور القرآن " سورۂ فاتحہ قرآن پاک کی سورتوں میں سے افضل ہے۔" وآیۃ الکرسی سیدۃ آی القرآن " آیت الکرسی قرآن پاک کی آیتوں کی سردار ہے۔"قل ھو اللہ احد تعدل ثلث القرآن" سورۂ قل ھو اللہ احد قرآن پاک کے تہائی حصہ کے برابر ہے۔

اس طرح بعض کی بعض پر افضلیت کے بیان میں بہت سی احادیث مبارکہ موجود ہیں:

" عن عثمان قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ " (رواہ البخاری، مشکوۃ باب فضائل القرآن)

'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے بہتر وہ ہے جس نے قرآن پاک سیکھا اور سکھایا ''۔

نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی میں "خیرکم " سے مراد آپ کی تمام امت ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا اے میری امت کے لوگو تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جس نے قرآن پاک

پڑھا اور پڑھایا۔

" والحاصل انه اذا کان خیر الکلام کلام الله فکذالک خیر الناس بعد النبیین من یتعلم القرآن ویعلمه ، لکن لابد من تقسیم التعلم والتعلیم بالاخلاص " (مرقاۃ ج ۴ ص ۳۳۳)

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ سب کلاموں سے بہتر کلام اللہ تعالیٰ کا ہے ۔تو یقیناً اس بہتر کلام کو پڑھنے والا اور پڑھانے والا ۔ انبیائے کرام کے بعد سب لوگوں سے افضل ہوگا ۔لیکن البتہ یہ ضروری ہے کہ پڑھنے اور پڑھانے والے کے دل میں خلوص پایا جائے ۔صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مندی مقصد ہو۔ریا کاری ، دنیاوی مقاصد نہ پائے جائیں۔

" عن عائشة رضی الله عنها قالت قال رسول الله صلی الله علیه وسلم الماهر بالقرآن مع السفرة الکرام البررة والذی یقرأ القرآن ویتتعتع فیه وهو علیه شاق له اجران " (بخاری ومسلم ، مشکوۃ باب فضائل القرآن)

" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قرآن پاک کے ماہر کو نیک مکرم سفرۃ کا قرب حاصل ہوگا۔وہ شخص جو قرآن پاک پڑھنے میں اٹکتا ہے کیونکہ اسے قرآن پڑھنے میں مشقت درپیش آتی ہے اسے دو اجر حاصل ہوتے ہیں "

وضاحت حدیث: ماہر قرآن سے مراد یہ ہے کہ وہ شخص قرآن پاک کو عمدگی سے یاد کئے ہوئے ہے یعنی اچھا حافظ قرآن ہے اور الفاظ کو عمدہ طریقہ سے ادا کرتا ہے۔

"السفرۃ " مسافر کی جمع ہے ۔ اگر یہ لفظ "سفر " سے بنا ہے تو اس کا معنی ہے کاتب اب اس معنی کے لحاظ پر معنی یہ ہوگا کی ماہر قرآن کو لکھنے والے نیک مکرم حضرات کا قرب حاصل ہوگا۔اس سے مراد فرشتے ہوں گے کہ انہوں نے کتب سماویہ کو لوح محفوظ سے لکھ کر منتقل کیا ہے ۔ اور کراماً کاتبین فرشتے بھی مراد ہو سکتے ہیں کہ وہ لوگوں کے اعمال لکھتے ہیں۔اور اس سے مراد نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام بھی ہو سکتے ہیں کہ انہوں نے ہی سب سے پہلے قرآن پاک کو لکھا اور جمع کیا۔

اور اگر یہ لفظ "سفارۃ " سے لیا جائے تو اب معنی یہ ہوگا کہ ماہر قرآن کو نیک مکرم سفیروں کے قریب ہونے کا شرف حاصل ہوگا ، سفیروں سے مراد بھی فرشتے ہوسکتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ اور انبیائے

کرام کے درمیان واسطہ ہوتے ہیں اور سفیر ہوتے ہیں۔اور اسی طرح سفیروں سے مراد انبیائے کرام بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ لوگوں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان سفیر ہوتے ہیں۔اور اس سے مراد نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام اور قیامت تک آنے والے علمائے ربانیین۔ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ نبی کریم ﷺ کے احکام کو بعد والے لوگوں تک پہنچانے کا ذریعہ بنے یہ ان کی سفارت ہی ہے۔

اگر یہ لفظ سِفار (سین کی زیر سے) مشتق ہو تو معنی ہوگا اصلاح کرنے والے۔ اب معنی یہ ہوگا کہ ماہر قرآن کو نیک ،مکرم اصلاح کرنے والے حضرات کا قرب حاصل ہوگا۔ اس سے مراد بھی فرشتے ،انبیاء اور علماء ہوں گے کیونکہ یہ بندوں کی اصلاح کرنے والے ہیں۔

مقصد واضح ہوا کہ قرآن پاک کا ماہر، حافظ ،عمدہ طور پر الفاظ کو پڑھنے والا دنیا میں انبیائے کرام اور علماء وصلحاء کے متبعین میں سے ہوتا ہے اور قیامت میں ان شاء اللہ تعالیٰ ان کی رفاقت اسے حاصل ہوگی۔

"ویتتعتع" کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پاک پڑھتے ہوئے اسے روانگی میں مشقت اٹھانی پڑتی ہے زبان اس کی اٹکتی ہے ۔لیکن وہ حافظہ کی کمی کی وجہ سے روانگی نہ ہونے کے باوجود قرآن پاک کو پڑھنے کی محنت جاری رکھے ہوئے ہے۔مشقت برداشت کر رہا ہے ۔تو اسے دو اجر حاصل ہوتے ہیں۔ ایک قرآن پاک پڑھنے کا اور دوسرا مشقت اٹھانے کا۔

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ماہر قرآن سے افضل ہوتا ہے۔تاہم حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ قرآن پاک کو پڑھنا باعث اجر وثواب ہے ۔خواہ وہ مہارت سے پڑھے یا مشقت سے پڑھے:

"عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ لا حسد الاعلی اثنین رجل آتاه الله القرآن فهو یقوم به آناء اللیل و آناء النهار ورجل آتاه الله مالا فهو ینفق منه آناء اللیل و آناء النهار" (بخاری ،مسلم ،مشکوۃ باب فضائل القرآن)

''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اچھا رشک صرف دو شخصوں پر کیا جائے ۔ایک وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک حفظ کرنے کی توفیق عطا فرمائی وہ دن رات اس کی تلاوت کرتا ہے اور دوسرا وہ شخص ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا ہے وہ دن رات اس سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتا رہتا ہے''۔

وضاحت حدیث: حدیث شریف میں لفظ "حسد" استعمال ہوا لیکن اس کا حقیقی معنی مراد نہیں بلکہ مجازی معنی مراد ہے۔ چونکہ حسد کی دو قسمیں ہیں حقیقی اور مجازی۔ حسد حقیقی یہ ہے کہ کسی کی نعمت کا زوال طلب کیا جائے اور خواہش کی جائے کہ اس کی نعمت اس سے زائل ہو کر مجھے مل جائے:

"وهو حرام باجماع المسلمين مع النصوص الصريحة"

مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ یہ حسد حرام ہے کیونکہ صریح نصوص اس کی حرمت پر دلالت کر رہی ہیں۔

حسد کی دوسری قسم ہے مجازی، حسد مجازی کی پھر دو صورتیں ہیں، ایک دنیاوی کاموں میں اور دوسرا دینی کاموں میں۔ حسد مجازی کو غِبطَه کہا جاتا ہے اس میں یہ خواہش تو پائی جاتی ہے کہ مجھے اس قسم کی نعمت مل جائے لیکن یہ خواہش نہیں ہوتی کہ دوسرے کی نعمت زائل ہو جائے۔

دنیاوی کاموں میں غبطہ یعنی رشک کرنا مباح ہے لیکن دینی کاموں میں مستحب ہے۔ نبی کریم ﷺ نے جن دو چیزوں کا ذکر کیا ہے وہ دونوں دینی کام ہیں لہٰذا ان میں غبطہ کرنا مستحب ہے۔ کہ اللہ کرے مجھے بھی یہ نعمتیں حاصل ہو جائیں جسے حاصل ہیں اللہ تعالیٰ اسے نصیب کرے۔

تنبیہ:

"غبطہ" ان دو چیزوں میں بند نہیں حدیث کے ظاہری الفاظ سے لوگ دھوکہ کھا لیتے ہیں۔ حدیث پاک کا مفہوم یہ ہے:

"والمراد في حديث لا غبطة محمودة الا في هاتين الخصلتين يعني فيهما وامثالها"

حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ اچھا غبطہ ان دو چیزوں میں ہے یا ان کی مثل میں ہے۔ گویا کہ یوں کہا جائے کہ ارشاد مصطفوی کا مفہوم یہ ہے کہ اچھا غبطہ اس قسم کی اچھی چیزوں میں ہے جیسے یہ دو ہیں جن کا ذکر حدیث میں کیا جا چکا ہے۔

اسی وجہ سے علامہ مظہر رحمہ اللہ نے فرمایا:

"انسان کے لئے یہ لائق نہیں کہ وہ کسی نعمت کی تمنا کرے ہاں مگر یہ کہ وہ نعمت اللہ تعالیٰ کا تقرب عطاء کرے جیسے قرآن پاک کی تلاوت، مال کا صدقہ کرنا اور ان کی

طرح بھلائی کے کام، یعنی عبادات بدنیہ، طاعات مالیہ کے حصول کی تمنا مستحب ہے "۔

(مرقاۃ ج ۴ ص

" عن ابی موسی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثل المؤمن الذی یقرأ القرآن مثل الاترجة ریحها طیب وطعمها طیب ومثل المؤمن الذی لا یقرأ القرآن مثل التمرة لا ریح لها وطعمها حلو مثل المنافق الذی لا یقرأ القرآن کمثل الحنظلة لیس لها ریح وطعمها مر ومثل المنافق الذی یقرأ القرآن مثل الریحانة ریحها طیب وطعمها مر "

(بخاری، مسلم، مشکوٰۃ باب فضائل القرآ

"حضرت ابوموسی (اشعری) رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن جو قرآن پڑھتا ہے وہ ایسے ہے جیسا کہ اُتْرُجَه (ہمزہ اور را پر پیش، ایک پھل کا نام ہے) اس کی خوشبو بھی اچھی ہے اور اس کا ذائقہ بھی اچھا ہے۔ اور وہ مومن جو قرآن نہیں پڑھتا اس کی مثل ایسے ہے جیسا کہ کھجور ہے، اس کی خوشبو نہیں لیکن ذائقہ اس کا میٹھا ہے۔ اور منافق جو قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال ایسے ہے جیسا کہ ریحانہ (پودا ہے غالباً نیازبو اسے کہا جاتا ہے) اس کی خوشبو اچھی ہے لیکن ذائقہ کڑوا ہے۔"

حدیث پاک کے ترجمہ سے ہی واضح ہے کہ مومن میں اس وقت ایک خاص کمال آ جاتا ہے جب وہ قرآن پڑھتا ہے وہی مومن جب قرآن پاک نہیں پڑھتا تو اس خصوصی کمال سے محروم رہتا ہے۔ اور منافق جب قرآن پڑھتا ہے تو ظاہری طور پر لوگ اس کے قرآن پڑھنے کو اچھا سمجھتے ہیں لیکن وہ اندر سے کالا ہی ہوتا ہے۔ اور منافق جب قرآن بھی نہ پڑھے تو وہ اس ظاہری اچھائی سے بھی محروم ہوتا ہے جو اسے قرآن پڑھنے سے حاصل ہو رہی تھی۔

قرآن باعث رفعت اور قرآن سے دوری باعث ذلت:

" عن عمر بن الخطاب قال قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ یرفع بهذا الکتاب اقواما ویضع به آخرین " (رواہ مسلم، مشکوٰۃ باب فضائل القرآن)

حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ اس کتاب (قرآن پاک) کے ذریعے بعض قوموں کو بلندی درجات عطاء کرتا ہے اور اسی کے ذریعے بعض کو پست کرتا ہے۔

قرآن کو کتاب کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ قرآن پاک کو بہت بلندی مقام حاصل ہے اس میں وہ بزرگی پائی گئی ہے جو کسی اور کتاب میں نہیں۔ اس کے دلائل اتنے واضح ہیں جو دوسری کتابوں میں اتنے واضح دلائل نہیں خواہ وہ آسمانی کتابیں ہی کیوں نہ ہوں۔ گویا کہ قرآن پاک کو کتاب کہہ کر یہ بتایا کہ جو اسے مقام حاصل ہے وہ کسی اور کتاب کو حاصل نہیں۔

قرآن کے ذریعے بلندی درجات اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب قرآن پر ایمان ہو اور قرآن کی تعظیم شان اس سے پائی جائے اور قرآن پر عمل اس کا ہو۔

بلندی درجات سے مراد یہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی کثیر مراتب سے نوازتا ہے۔ اور ان کو حیات طیبہ سے زندہ رکھتا ہے۔ اور یہی حیاۃ طیبہ ان کو قبر اور حشر میں بھی حاصل ہوگی بلکہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے خاص قرب والے لوگوں کا اسے تقرب حاصل ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ قرآن پاک کی عظمت کا لحاظ نہیں کرتے اس کے مطابق عمل نہیں کرتے ان کا مرتبہ کم اور پست ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگ ''اسفل السافلین'' کے مقام تک پہنچ جاتے ہیں کیونکہ وہ قرآن پاک کے منکر ہو جاتے ہیں۔

رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ''يُضِلُّ بِهِ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهِ كَثِيْرًا'' (گمراہ ہوتے ہیں اسی کے ذریعے بہت اور ہدایت حاصل کرتے ہیں اس کے ذریعے بہت) کا بھی یہی مطلب ہے۔

''فهو ماء للمحبوبين و دماء للمحجوبين'' قرآن پاک اللہ کے محبوب بندوں کیلئے پانی کی طرح مفید ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے دور رہنے والوں کیلئے ایسے ہے جیسا کہ ان کو خون پلا دیا جائے۔

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴾

''اور ہم قرآن میں اتارتے ہیں وہ چیز جو ایمان والوں کے لئے شفاء اور رحمت ہے اور اس سے ظالموں کو نقصان ہی بڑھے گا''۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا:

"من قراه وعمل به مخلصا رفعه الله ومن قراه مرائيا غير عامل به وضعه الله"

''جس شخص نے قرآن پاک پڑھا اور اس پر خلوص سے عمل کیا اللہ تعالیٰ اس کے مدارج کو بلند کرتا ہے اور جس شخص نے قرآن پاک ریاکاری کے لئے پڑھا اور اس پر عمل نہ کیا رب تعالیٰ اسے پست کرتا ہے''۔

علامہ بغوی نے اسناد کے ساتھ ''معالم التنزیل'' میں ذکر کیا ہے کہ حضرت نافع بن حارث، حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ کو عسفان میں ملے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو مکہ مکرمہ میں عامل بنایا تھا تو ان کے عسفان میں موجود ہونے پر آپ نے پوچھا۔ مکہ والے لوگوں پر تم نے کسے خلیفہ بنایا انہوں نے عرض کیا ''ابن ابزیٰ'' کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا ابن ابزیٰ کون ہے؟ انہوں نے عرض کیا وہ ہمارے غلاموں میں سے ایک غلام ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تعجب سے پوچھا غلام کو تم نے ان پر خلیفہ بنا دیا۔ تو انہوں نے عرض کیا اے امیر المؤمنین!

" انه رجل قاری القرآن عالم بالفرائض قاض فقال عمر اما ان نبیکم ﷺ قال ان اللہ تعالیٰ یرفع بهذا القرآن اقواما ویضع به آخرین "

وہ شخص قرآن کا قاری ہے، فرائض کا عالم ہے، قاضی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، بیشک اللہ تعالیٰ اس قرآن پاک کے ذریعے بعض قوموں کے مدارج بلند فرماتا ہے اور اسی قرآن کے ذریعے بعض لوگوں کا مقام پست کرتا ہے۔

صحابی سے فرشتوں کا قرآن سننا:

" عن ابی سعید الخدری ان اسید بن حضیر قال بینما هو یقرأ من اللیل سورة البقرة وفرسه مربوطة عنده اذ جالت الفرس فسکت فسکنت فقرأ فجالت فسکت فسکنت ثم قرأ فجالت الفرس فانصرف وکان ابنه یحیٰ قریبا منها فاشفق ان تصیبه ولما اخره رفع رأسه الی السماء فاذا مثل الظلة فیها امثال المصابیح فلما اصبح حدث النبی ﷺ فقال اقرأ یاابن حضیر اقرأ یا ابن حضیر قال فاشفقت یا رسول اللہ ان تطأ یحیٰ وکان منها قریبا فانصرفت الیه ورفعت رأسی الی السماء فاذا مثل

الظلة فیها امثال المصابیح فخرجت حتی لااراها قال وتدری ماذاک قال لا قال تلک الملائکة دنت لصوتک ولو قرات لاصحبت ینظر الناس الیها لاتتواری منهم (متفق علیه) واللفظ للبخاری وفی مسلم عرجت فی الجو بدل فخرجت علی صیغة المتکلم "

(مشکوۃ باب فضائل القرآن)

'' حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا بیشک اسید ابن حضیر (دونوں نام مصغر ہیں) نے بتایا وہ ایک رات کو سورہ بقرہ پڑھ رہے تھے اور ان کی گھوڑی ان کے پاس ہی باندھی ہوئی تھی وہ چکر لگانے لگی، گھومنے لگی وہ خاموش ہو گئے گھوڑی بھی پرسکون ہوگئی۔ انہوں نے پھر پڑھنا شروع کیا گھوڑی نے پھر گھومنا شروع کر دیا پھر وہ خاموش ہو گئے گھوڑی کو پھر سکون آ گیا انہوں نے پھر پڑھنا شروع کیا گھوڑی نے پھر گھومنا شروع کیا وہ وہاں سے پھر گئے۔ اس لئے کہ ان کا بیٹا یحیٰ قریب ہی تھا ان کو یہ خوف ہوا کہ گھوڑی کہیں یحی کو روند نہ ڈالے انہوں نے بیٹے کو وہاں سے ہٹایا اور سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا کہ وہاں ایک بادل کا ٹکڑا ہے۔ جس میں چراغوں کی طرح چمک دار چیزیں ہیں جب صبح ہوئی نبی کریم ﷺ کو بتایا۔ آپ نے فرمایا اے ابن حضیر تم پڑھتے رہتے، اے ابن حضیر تم پڑھتے رہتے انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں ڈر گیا تھا کہ کہیں یحی کو روند نہ دے جو اس کے قریب ہی تھا۔ اس لئے میں اس (بچے) کی طرف ہو گیا اور سر کو میں نے آسمان کی طرف اٹھایا تو مجھے ایک بادل کے ٹکڑے کی طرح کوئی چیز نظر آئی گویا کہ اس میں چراغ ہیں۔ پھر میں نکلا یہاں تک کہ میں ان کو نہ دیکھ سکا نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو وہ کیا تھا۔ انہوں نے عرض کیا نہیں (میں نہیں جانتا) آپ نے فرمایا وہ فرشتے تھے جو تمہاری آواز کے قریب آ گئے تھے۔ اگر تم پڑھتے رہتے اسی حال میں صبح ہو جاتی لوگ ان فرشتوں کو دیکھ لیتے وہ لوگوں سے نہ چھپتے ''۔

وضاحت حدیث: "فرس" کا لفظ مذکر اور مؤنث دونوں پر بولا جاتا ہے یہاں سے مراد مؤنث ہے یعنی گھوڑی اس لئے کہ مؤنث کے دوسرے صیغے (**مربوطة،جالت ، سکنت**) اس کی وضاحت کر رہے ہیں۔

"**فجالت**" وہ گھوڑی گھومنے لگی، چکر کاٹنے لگی، یعنی اسے قرار نہیں آ رہا تھا۔ اسے قرار نہ آنے

کی دو وجہ تھیں۔

" قیل تحرک الفرس کان لنزول الملائکۃ لا ستماع القرآن خوفا منھم "

بعض حضرات نے کہا کہ گھوڑی کی بے قراری فرشتوں کو دیکھ کر ان سے خوف تھا جب کہ وہ قرآن پاک سننے کے لئے نازل ہوئے تھے۔

جب وہ واپس آسمانوں پر چلے گئے یا یہ کہ جب ابن حضیر پڑھنا چھوڑتے تو فرشتے غائب ہو جاتے تو گھوڑی کو بھی قرار مل جاتا۔

"او تحرک الفرس لو جدان الذوق بالقراءۃ " یا گھوڑی کی بے قراری کی وجہ یہ تھی کہ اسے قرآن پاک کی قراءت کو سن کر ذوق آ رہا تھا۔یعنی اس پر یہ کیفیت تھی کہ وہ خوشی سے جھوم رہی تھی۔ جب ابن حضیر پڑھنا چھوڑ دیتے اس کی یہ کیفیت ذوق والی بھی جاتی رہتی اور جھومنا چھوڑ دیتی۔

خیال رہے کہ شارحین نے تو اس طرح بیان کیا ہے کہ ان دو وجہ میں سے ایک تھی۔لیکن راقم کے نزدیک دونوں کے اجتماع میں کوئی مانع (رکاوٹ)نہیں۔اس لئے کہ فرشتوں کو دیکھ کر گھوڑی کو خوف ہوا اس خوف کی وجہ صرف فرشتوں کی نورانیت نہ ہو بلکہ قرآن پاک سن کر ذوق آیا ہو جس کی وجہ سے گھوڑی نے جھومنا شروع کر دیا ہو۔اور فرشتوں کو دیکھ کر خوف باری تعالیٰ اور بڑھا ہو جس نے ذوق کو اور بڑھا دیا ہو۔ (واللہ اعلم)

"ولما اخرہ " اسکا مطلب ہے کہ اسید ابن حضیر نے اپنے بیٹے یحیٰی پر ڈر محسوس کیا کہیں اسے روند نہ دے کیونکہ یحیٰی گھوڑی کے قریب تھے۔لہٰذا وہ بیٹے کے پاس گئے اور اسے وہاں سے ہٹایا۔

" الظلۃ " ہر وہ چیز جو دھوپ سے بچائے ،بادل،چھت ،چھتری وغیرہ البتہ یہاں مراد یہ ہے کہ وہ بادل کی طرح کوئی ٹکڑا نظر آ رہا تھا۔

"اقرأ یا ابن حضیر" اگرچہ " اقرأ "امر کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے پڑھ ۔لیکن اس کی نسبت ماضی کی طرف ہے اور اس میں ایک کام کو جاری رکھنا اور ہمیشگی کا معنی پایا گیا ہے۔جس کا مطلب یہ ہے اے ابن حضیر تم پڑھتے رہتے۔

"ظلة اور مصابیح" سے مراد فرشتے ہی ہیں۔ یعنی فرشتوں کا قرآن پاک سننے کے لئے ہجوم کی شکل میں آنا اور ایک ساتھ ہی واپس لوٹنا ان کے جسم بادل کی طرح نظر آرہے تھے اور ان کے چہرے کی نورانیت چراغوں کی طرح نظر تو آ رہی تھی:

"ولا مانع من ان الاجسام النورانية اذا ازدحمت تكون كالظلة"

کوئی یہ خیال نہ کرے کہ نورانی مخلوق بادل کی طرح کیسے نظر آ رہی تھی اس لئے کہ اس میں کوئی مانع موجود نہیں کہ نورانی جسم جب کثیر تعداد میں جمع ہو جائیں تو وہ بادل کی طرح نظر آئیں۔
(مراقاۃ ج ۴ ص ۳۳۹)

سورۂ فاتحہ کی عظمت:

" وعن ابی سعيد بن المعلی قال كنت اصلی فی المسجد فدعانی النبی ﷺ فلم اجبه ثم اتيته فقلت يا رسول الله انی كنت اصلی قال الم يقل الله استجيبوا لله وللرسول اذا دعاكم ثم قال الا اعلمك اعظم سورة فی القرآن قبل ان تخرج من المسجد فاخذ بيدی فلما اراد ان نخرج قلت يارسول الله انك قلت لا علمنك اعظم سورة من القرآن قال الحمد لله رب العلمين هی السبع المثانی والقرآن العظيم الذی اوتيته " (رواه البخاری، مشكوة باب فضائل القرآن)

''ابوسعید ابن معلیٰ فرماتے ہیں میں مسجد میں نماز ادا کر رہا تھا۔ مجھے نبی کریم ﷺ نے بلایا میں نے آپ کو کوئی جواب نہ دیا کچھ دیر کے بعد میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے کہا یارسول اللہ میں نماز پڑھ رہا تھا آپ نے فرمایا کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا ''اللہ اور رسول کے بلانے پر حاضر ہو'' پھر آپ نے فرمایا کیا میں تمہیں مسجد سے نکلنے سے پہلے ایک عظیم سورۃ نہ سکھاؤں؟ پھر آپ نے میرا ہاتھ پکڑا جب ہم نے نکلنے کا ارادہ کیا تو میں نے کہا یارسول اللہ بیشک آپ نے فرمایا تھا میں تمہیں قرآن کی ایک عظیم سورۃ سکھاؤں گا۔ آپ نے فرمایا " اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ " ہے جو سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے جو مجھے عطاء کی گئی ہے''۔

وضاحت حدیث: " استجيبوا " کا معنی ہے مطیع ہو جاؤ، حکم کو قبول کرو، تسلیم کرو۔ آیت

کریمہ میں ہے "اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ" (جب رسول تمہیں اس چیز کے لئے بلائیں جو تمہیں زندگی بخشے)۔ یہاں زندگی سے مراد دین اور شریعت کا علم ہے اس لئے کہ علم حیات ہے اور جہالت موت ہے اسی وجہ سے کہا گیا ہے:

" لا تعجبن الجهول حلته فذاک میت وثوبه کفن" (جاہل کے کپڑوں کا (شاندار) جوڑا تمہیں تعجب میں نہ ڈالے اس لئے کہ جاہل مردہ ہے اور اس کے کپڑے اس کا کفن ہیں)۔

" قال الطیبی دل الحدیث علی ان اجابة الرسول لا تبطل الصلوة کما ان خطابه بقولک السلام علیک ایها النبی لا یبطلها "

علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا حدیث پاک سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کو تسلیم کرنے اور آپ کے پاس حاضر ہونے سے نماز باطل نہیں ہوتی جس طرح کہ آپ کو "السلام علیک ایها النبی" سے خطاب کرنے سے نماز باطل نہیں ہوتی حالانکہ اور کسی کو نماز میں خطاب کریں تو نماز باطل ہو جاتی ہے۔

تاہم خیال رہے کہ اس مسئلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے کہ دوران نماز نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے سے نماز باطل ہوتی، یا کہ باطل نہ ہوتی۔ اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ اتفاق ہے:

"والظهر من الحدیث ان الاجابة واجبة مطلقا فی حقه صلی الله علیه وسلم کی یفهم من اطلاق الأیة ایضا"

کہ زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ حدیث پاک سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ حضور ﷺ کا حکم ماننا واجب تھا حدیث پاک اور آیت کریمہ سے حکم مطلقاً سمجھ آ رہا ہے۔

" السبع المثانی والقرآن العظیم " کی تفصیل سورۃ فاتحہ کے ناموں کی بحث میں مذکور ہے جو ترتیب کے لحاظ سے آگے آئے گی۔

حافظ قرآن کی شان:

" عن معاذ الجهنی قال قال رسول الله ﷺ من قرا القرآن وعمل بما فیه البس والداه تاجا یوم القیامة ضوءہ احسن من ضوء الشمس فی

بیوت الدنیا لو کانت فیکم فماظنکم بالذی عمل بهذا "

(رواہ احمد و ابو داؤد، مشکوٰۃ کتاب فضائل القرآن)

" حضرت معاذ جہنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے قرآن پڑھا اور اس پر عمل کیا تو اس کے والدین کو قیامت کے دن تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی سورج کی روشنی جو گھروں پر پڑتی ہے اس سے بھی زیادہ حسین ہوگی۔ (یعنی بالفرض وہ سورج تمہارے گھروں میں ہوا) جو قرآن پر عمل کرے گا اس کے مطابق تمہارا کیا گمان ہے؟"

وضاحت حدیث: "من قرأ القرآن قال ابن حجر ای حفظه عن ظهر قلب"

جس نے قرآن پڑھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے قرآن حفظ کیا اور زبانی پڑھا۔

اگرچہ پختہ طریقہ سے قرآن پڑھنے والا معنی بھی مراد لیا گیا ہے تاہم زیادہ مناسب معنی پہلا ہی ہے کہ مراد حفظ قرآن ہی لیا جائے۔

حافظ قرآن جبکہ قرآن پاک کے مطابق عمل بھی کرے تو قیامت کے دن اس کے والدین کو تاج پہنایا جائے گا۔ جس کے ہیرے اور جواہر ایسے چمکدار ہوں گے اور ایسے خوبصورت، زیب و زینت میں ہوں گے جس طرح سورج اپنی چمک اور روشنی کے ساتھ بالفرض گھروں میں داخل ہو جائے تو اس کی روشنی باہر سے اور زیادہ نظر آئے اس سے بھی بڑھ کر تاج کی روشنی ہوگی۔

" فماظنکم بالذی عمل بهذا ". یعنی جب حافظ کے والدین کی یہ شان ہوگی تو تمہارا کیا خیال ہے کہ قرآن پر عمل کرنے والے حافظ وقاری کا اپنا کیا مرتبہ ہوگا:

" یعطی للقاری العامل به من الکرامة والملک ما لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر "

" یعنی قرآن پڑھ کر اس پر عمل کرنے والے کو وہ کرامت اور بادشاہی حاصل ہوگی جو کسی آنکھ نے دیکھی نہیں ہوگی اور کسی کان نے سنی نہیں ہوگی اور کسی انسان کے دل پر کھٹکی نہیں ہوگی"۔ (مرقاۃ)

تلاوت قرآن دلوں کو جلاء عطاء کرتی ہے:

" عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ھذہ القلوب تصدأ کما یصدأ الحدید اذا اصابہ الماء قیل یا رسول اللہ وماجلاؤھا قال کثرۃ ذکر الموت وتلاوۃ القرآن "

(رواہ البیھقی ، مشکوۃ کتاب فضائل القرآن)

'' حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک یہ دل زنگ آلود ہو جاتے ہیں جس طرح لوہا پانی پڑنے سے زنگ آلود ہو جاتا ہے آپ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ ﷺ ان دلوں کی جلاء کس چیز سے ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا موت کو زیادہ یاد کرنے سے اور قرآن پاک کی تلاوت سے''۔

واضح ہوا کہ تلاوت قرآن سے دلوں کا زنگ دور ہو جاتا ہے۔اور دل روشن اور چمکدار ہو جاتے ہیں ان کی یہی جلاء ہے۔

قرآن پاک پڑھنے میں کثرت کرے:

" یستحب الاکثار من قراءۃ القرآن وتلاوتہ "

'' قرآن پاک کو زیادہ سے زیادہ پڑھنا اور زیادہ سے زیادہ تلاوت کرنا مستحب ہے''۔

کیونکہ رب تعالیٰ نے قرآن پڑھنے والوں کی شان میں یہ ارشاد فرمایا:

﴿ یَتْلُوْنَ آیَاتِ اللہِ آنَاءَ اللَّیْلِ ﴾ (وہ اللہ کی آیتیں رات بھر تلاوت کرتے رہتے ہیں)۔

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے نبی کریم ﷺ کا ارشاد بیان فرمایا:

" لا حسد الا فی اثنین رجل آتاہ اللہ القرآن فھو یقوم بہ آناء اللیل وآناء النھار "

'' صرف دو شخصوں سے رشک کیا جائے ایک وہ شخص جسے رب تعالیٰ نے قرآن کا علم دیا وہ اس پر دن رات قائم رہے''

یعنی دن رات اس کی تلاوت کرتا ہے اور اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ (متفق علیہ)

☆ حضرت ابن مسعود سے روایت کردہ حدیث پاک میں ہے:

" من قرأ حرفا من کتاب الله فله به حسنة والحسنة بعشر امثالها "

''جس شخص نے قرآن پاک کے ایک حرف کو پڑھا اسے اس کی وجہ سے نیکی حاصل ہوگی ، وہ نیکی دس نیکیوں کے برابر ہوگی'' (ترمذی)

یعنی قرآن پاک کے ایک حرف پڑھنے سے دس نیکیاں حاصل ہوتی ہیں۔

☆ ابوامامہ سے مروی حدیث میں ذکر ہے:

" اقرؤا القرآن فانه یأتی یوم القیامة شفیعا لاصحابه " (مسلم)

''قرآن پاک پڑھو۔ بیشک قیامت کے دن یہ پڑھنے والوں کی شفاعت کرے گا''۔

مذکورہ احادیث سے واضح ہوا کہ قرآن پاک جتنا زیادہ پڑھ سکے، اتنا ہی زیادہ ثواب ہے تین دنوں میں ختم کرنے کا ذکر ملتا ہے چار دنوں کا ذکر ملتا ہے کہیں پانچ دن، کہیں چھ دن، کہیں سات دن، کہیں پندرہ دن، کہیں ایک ماہ، کہیں چالیس دن، کہیں دو ماہ کا ذکر ملتا ہے کہ اتنے دنوں میں ختم کیا جائے۔ یہ سب مختلف شخصوں کا اعتبار کرتے ہوئے ذکر کیا گیا ہے۔(ماخوذ از الاتقان ج ا ص ۱۰۴)

قرآن پاک یاد کر کے بھلا دینا بہت بڑا گناہ ہے:

''نسیانه کبیرة صرح به النووی فی الروضة وغیرها''

قرآن پاک یاد کر کے بھلا دینا گناہ کبیرہ ہے جیسا کہ علامہ نووی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں صراحۃً ذکر فرمایا ہے۔

یعنی تلاوت کرنا چھوڑ دیا تو بھول گیا تو گناہ ہوگا۔ لیکن حافظہ کی کمی کی وجہ سے بھول جانے کو گناہ سے تعبیر نہیں کیا جا سکے گا۔

☆ حدیث شریف میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" عرضت علی ذنوب امتی فلم ارذنبا اعظم من سورة القرآن او آیة اوتیها رجل ثم نسیها " (ابوداؤد)

''مجھ پر میری امت کے گناہ پیش کیے گئے میں نے کوئی گناہ اس سے بڑا نہیں دیکھا کہ کسی کو

قرآن کی سورۃ یا آیۃ کا علم دے دیا گیا پھر اس نے اسے بھلا دیا۔"

☆ اور ایک حدیث میں ارشاد مصطفوی ہے:

" من قرأ القرآن ثم نسیه لقی الله یوم القیامة اجذم "

"جس نے قرآن پڑھا اور پھر اسے بھلا دیا وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے تو وہ شخص کوڑھی ہوگا"۔ (ماخوذ از الاتقان ج ا ص ۱۰۵)

آداب تلاوت:

تلاوت قرآن پاک میں چند چیزیں مستحب ہیں جن پر عمل کرنے سے ثواب حاصل ہوتا ہے اور نہ عمل کرنے پر کوئی گناہ نہیں۔ یعنی جواز ہوگا اگر چہ زیادہ ثواب نہیں ہوگا۔

مستحب یہ ہے کہ قرآن پاک باوضوء ہو کر پڑھے، کیونکہ قرآن پاک بھی اللہ تعالیٰ کے ذکروں میں سے افضل ذکر ہے نبی کریم ﷺ بغیر وضوء کے اللہ تعالیٰ کے ذکر کو بہتر نہیں سمجھتے تھے۔ تاہم آپ نے بیان جواز کے لئے بے وضوء قرآن پاک پڑھا ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ بغیر وضوء کے قرآن پاک پڑھنا جائز ہے۔

لیکن یہ خیال رہے کہ یہ مسئلہ زبانی پڑھنے کا ہے قرآن پاک کو ہاتھ لگانے اور ہاتھ سے اوراق کو پلٹنے کے لئے وضوء کرنا ضروری ہے بغیر وضوء کے قرآن پاک کو ہاتھ لگانا جائز نہیں۔

جنبی شخص (جس پر غسل کرنا فرض ہو) اور حیض والی عورت یا نفاس والی عورت کے لئے قرآن پاک کو ہاتھ لگانا بھی ناجائز ہے اور پڑھنا بھی ناجائز ہے۔ البتہ وہ قرآن پاک کو دیکھ سکتے ہیں اور زبان چلانے کے بغیر دل پر قرآن کو جاری کریں تو جائز ہے۔

(۱) صاف ستھری جگہ قرآن پاک کا پڑھنا مستحب ہے بلکہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ مسجد میں قرآن پڑھے عورت اپنی نماز کی جگہ قرآن پاک کی تلاوت کرے یہ اس کے لئے افضل ہے۔

(۲) مستحب یہ ہے کہ تلاوت کرنے کے لئے قبلہ کی طرف منہ کر کے بیٹھے، بڑے خشوع، بڑے آرام اور پروقار طریقے سے بیٹھے اور سر کو جھکا کر بیٹھے۔

(۳) مستحب ہے کہ قرآن پاک پڑھنے کے لئے مسواک کرے کیونکہ اس سے منہ کو خصوصی نظافت حاصل ہوگی ۔اور قرآن پاک کی تعظیم بھی پائی جائے گی۔

ابن ماجہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے موقوف حدیث بیان کی اور مسند بزار نے سند جید سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہی مرفوع حدیث بیان کی:

" ان افواھکم طرق للقرآن فطیبوھا بالسواک "

''بے شک تمہارے منہ قرآن پڑھنے کا ذریعہ ہیں ان کو مسواک سے صاف ستھرا کرلیا کرو''۔

(۴) قرآن پاک کی تلاوت سے پہلے تعوذ پڑھنا مستحب ہے بلکہ سنت ہے اس لئے کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴾

''جب تم قرآن پڑھنے کا ارادہ کرو تو مردود شیطان سے اللہ کی پناہ پکڑ لیا کرو''

تعوذ کے لئے **''الصیغة المختارة''** سب سے بہتر اور مختار الفاظ وہی ہیں جو سب سے زیادہ مشہور بھی ہیں۔ یعنی ان الفاظ سے پڑھے " اَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ "۔

تاہم مختلف الفاظ سے پڑھنا بھی ثابت ہے ،وہ تمام بھی جائز ہیں :

" اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطن الرجیم ، اعوذ باللہ القادر من الشیطان الغادر ، اعوذ باللہ القوی من الشیطن الغوی ، اعوذ باللہ العظیم من الشیطن الرجیم ، اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم انه هو السمیع العلیم "

(۵) اگر کوئی شخص قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے چھوڑ کر کسی کام کے لئے گیا ،پھر دوبارہ تلاوت کرنے کی غرض سے لوٹ آیا، تو اسے چاہئے کہ دوبارہ تعوذ پڑھ کر تلاوت شروع کرے۔

(۶) جب بلند آواز سے قراءت کرنا چاہے تو تعوذ بھی بلند آواز سے پڑھے جس طرح تلبیہ بلند آواز سے پڑھا جاتا ہے اور تکبیرات تشریق بلند آواز سے پڑھی جاتی ہیں اسی طرح تعوذ بھی بلند آواز سے پڑھے۔

(۷) تلاوت کے شروع میں تعوذ کے بعد تسمیہ پڑھے اسی طرح دوران تلاوت جب کوئی نئی سورة

شروع ہو تو تسمیہ پڑھے البتہ سورہ براءۃ کے شروع میں بسم اللہ نہیں پڑھنی، نہ پڑھنے کی وجہ یا یہ ہے کہ وہ پہلی سورۃ کا ہی حصہ ہے مستقل علیحدہ سورۃ نہیں۔ یا یہ کہ اس میں کفار کا زیادہ ذکر ہے اس لئے تسمیہ نہیں پڑھنی۔

(۸) یہ بھی خیال رہے کہ اگر کوئی شخص سورۃ براءۃ سے ہی تلاوت کی ابتداء کر رہا ہو تو وہ ابتداء تلاوت میں بسم اللہ پڑھے گا قرآن پاک کو ترتیل سے پڑھے کہ الفاظ علیحدہ علیحدہ سمجھ میں آئیں کیونکہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ﴾ (قرآن کو ترتیل سے پڑھو)۔

(۹) قرآن پاک کی تلاوت کا مقصد عظیم قرآن میں تدبر کرنا اور اپنی طاقت کے مطابق سمجھنے کی مکمل کوشش کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْا اٰيٰتِهٖ ﴾ (یہ ایک کتاب ہے کہ ہم نے تمہاری طرف اتاری برکت والی تا کہ اس کی آیتوں کو سوچیں)۔

اسی طرح اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ﴾

''قرآن میں (یہ لوگ) تدبر کیوں نہیں کرتے''۔

مقصد یہ ہے کہ قرآن پاک کو پڑھتے ہوئے اس کے معانی میں غور و فکر کرے، قرآن پاک کو سمجھے کہ اس میں یہ اوامر ہیں اور یہ نواہی۔ تا کہ ان کو قبول کرنے کا عقیدہ رکھے اور ان پر عمل کرے۔

(۱۰) قرآن پاک کو خشوع و خضوع سے پڑھے۔ اگر قرآن پاک پڑھتے ہوئے رونا بھی آجائے تو یہ بڑی ہی خوش قسمتی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ☆ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ☆ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ☆ ﴾

'' تم فرماؤ کہ تم لوگ ایمان اس پر لاؤ یا نہ لاؤ۔ بے شک وہ جنہیں اس کے اترنے سے پہلے علم ملا جب ان پر پڑھا جاتا ہے۔ ٹھوڑی کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں

اور کہتے ہیں پاک ہے ہمارے رب کو بیشک ہمارے رب کا وعدہ پورا ہونا تھا اور ٹھوڑی کے بل گرتے ہیں روتے ہوئے اور یہ قرآن ان کے خشوع کو بڑھاتا ہے''۔

بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے سامنے قرآن پاک کی تلاوت کی تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

بیہقی میں سعد ابن مالک رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث ہے:

'' ان هذا القرآن نزل بحزن و كآبة فاذا قرأتموه فابكوا فان لم تبكوا فتباكوا ''

'' بیشک یہ قرآن غم اور مصائب ساتھ لا کر نازل ہوا ہے جب تم قرآن پڑھو تو روؤ۔ اگر رو نہ سکو تو رونے کی شکل بنالو''۔

مسند ابی یعلیٰ میں ہے:

'' اقرؤا القرآن بالحزن فانه نزل بالحزن ''

'' قرآن غمناک حال میں پڑھو، کیونکہ قرآن غم کو ساتھ لایا ہے''۔

طبرانی میں ہے:

'' احسن الناس قراء ة من اذا قرأ القرآن يتحزن ''

''لوگوں میں سے قرآن پاک کو اچھا پڑھنے والا وہ شخص ہے کہ جب وہ قرآن پڑھے تو اس پر غم طاری ہو جائے''۔

(۱۱) قرآن پاک اچھی آواز سے مزین کر کے پڑھنا مستحب ہے ابن حبان کی حدیث میں ہے۔

''زينوا القرآن باصواتكم '' (اپنی اچھی آوازوں سے قرآن کی زینت سے پڑھو)۔

دارمی میں ہے:

'' حسنوا القرآن باصواتكم فان الصوت الحسن يزيد القرآن حسنا ''

''اپنی اچھی آواز سے قرآن پاک کو حسین بناؤ۔ بیشک اچھی آواز سے قرآن پاک میں زیادہ حسن آتا ہے''۔

(۱۲) بعض احادیث میں آہستہ قرآن پاک پڑھنے کی فضیلت ملتی ہے اور بعض احادیث میں بلند آواز سے قرآن پاک پڑھنے کی فضیلت سمجھ میں آتی ہے علامہ نووی رحمہ اللہ نے ان میں تطبیق اس طرح دی ہے۔ ریاء کا خوف ہو، نمازیوں کو تکلیف ہو رہی ہو، سوئے ہوئے لوگوں کو تکلیف

ہو ان صورتوں میں آہستہ پڑھنا افضل ہے۔اگر ایسی کوئی صورت نہ ہو تو بلند آواز سے پڑھنا افضل ہے کیونکہ اس میں زیادہ عمل پایا گیا ہے۔یعنی پڑھنا ایک عمل ہے اور بلند آواز سے پڑھنا دوسرا عمل ہے اور بلند آواز سے پڑھنے کی وجہ سے سننے والوں کو بھی فائدہ حاصل ہو گا۔پڑھنے والے کا دل بیدار رہے گا اور اس کا ارادہ فکر کی طرف زیادہ ہو گا اور پڑھنے والا خود بھی اپنی قراءت کی طرف کان لگائے گا اس کی نیند دور ہو گی اسے چستی حاصل ہو گی۔

ابوداؤد نے حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی:

" اعتکف رسول الله صلى الله عليه وسلم فى المسجد فسمعهم يجهرون بالقراء ة فكشف الستر وقال الاكلكم مناج لربه فلا يؤذين بعضكم بعضا ولا يرفع بعضكم على بعض فى القراء ة "

''رسول اللہ ﷺ مسجد میں اعتکاف بیٹھے ہوئے تھے آپ نے سنا کہ کچھ حضرات بلند آواز سے قرآن پڑھ رہے ہیں آپ نے پردہ ہٹایا اور ارشاد فرمایا خبردار تم میں سے ہر شخص مناجات کر رہا ہے ایک دوسرے کو ہرگز تکلیف نہ پہنچاؤ، اور تم میں بعض حضرات دوسرے بعض پر قراءت کو بلند نہ کریں''۔

(۱۴) قرآن پاک کو ترتیب وار پڑھنا مستحب ہے اسی طرح لگاتار پڑھنا مستحب ہے۔اگر ترتیب کو الٹ کر دے، مثلاً پہلے " قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ " پڑھ لے پھر " قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ " پڑھ لے۔یا اسی طرح متفرق طور پر سورتوں کی تلاوت کرے تو یہ جائز ہے خیال رہے کہ نماز میں بھی قرآن پاک کے پڑھنے میں ترتیب مستحب ہے۔بھول کر ترتیب الٹ ہو جائے تو کوئی حرج نہیں جان بوجھ کر ترتیب کو الٹا کرنا بہتر نہیں۔

طبرانی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی:

" انه سئل عن رجل يقرأ القرآن منكوسا قال ذاك منكوس القلب "

''کہ ان سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص قرآن پاک الٹی ترتیب سے پڑھتا ہے اس کا کیا حکم ہے آپ نے فرمایا وہ الٹے دل والا ہے''۔

راقم کہتا ہے خیال رہے کہ بچوں کو بعض اوقات چھوٹی چھوٹی سورتیں پہلے یاد کرانی مقصود ہوتی

ہیں ان کو آخری پارہ سے یاد کرانا شروع کرایا جاتا ہے اس میں کوئی خاص حرج نظر نہیں آتی کیونکہ مقصد اس میں نیک ہوتا ہے کہ بچہ پہلے چھوٹی چھوٹی سورتیں شوق سے یاد کرتا ہے اور کہتا ہے میں نے اتنی سورتیں یاد کر لی ہیں۔اس مقصد کے لئے آخر سے پیچھے آنے میں کوئی حرج نہیں۔

(ماخوذ از الاتقان ج ۱ ص ۱۰۴ تا ص ۱۰۸)

(۱۴) حافظ قرآن کو چاہئے کہ وہ قرآن اکثر اوقات پڑھتا رہے۔اگر وہ قرآن پڑھتا رہے تو اسے یاد رہے گا۔اور اگر اس نے پڑھنا چھوڑ دیا تو اسے بھول جائے گا۔مسلم نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت بیان کی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" انما مثل صاحب القرآن كمثل صاحب الابل المعلقة ان عاهد عليهما امسكها وان اطلقها ذهبت واذا قام صاحب القرآن فقرأه بالليل والنهار ذكره واذا لم يقم به نسيه "

" حافظ قرآن، اونٹ والے شخص کی طرح ہے اگر اس نے اونٹ کو باندھ کر رکھا تو وہ رکا رہے گا اور اگر اس نے اس کی رسی کو کھول دیا تو وہ چلا جائے گا۔اسی طرح اگر حافظ قرآن نے دن رات تلاوت کو جاری رکھا تو اسے یاد رہے گا اور اگر اس نے اس کی تلاوت کو جاری نہ رکھا تو اسے بھول جائے گا "۔

عوام الناس کے لئے بھی یہ حکم ہے لیکن حافظ قرآن، قاری قرآن، عالم قرآن کے لئے بالخصوص یہ حکم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا رہے اور اس کی نعمت کا شکریہ ادا کرتا رہے اور رب تعالیٰ کا ذکر کرتا رہے اور اسی پر توکل رکھے، اور اسی سے امداد طلب کرے، اور اسی کی طرف رغبت کرے، اور اسی پر سہارا رکھے، اور موت کو یاد کرتا رہے، اور موت کی تیاری رکھے، گناہوں سے خوف رکھے لیکن رب تعالیٰ کی رحمت کی امید بھی رکھے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا " لا يموتن احدكم الا وهو يحسن بالله الظن " (تم میں سے ہر شخص پر موت صرف اسی حال میں آئے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اچھا گمان رکھے)۔یعنی وہ امید رکھے کہ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے گا۔ (از قرطبی ج ۱ ص ۲۰)

(۱۵) حافظ قرآن، قاری قرآن، عالم قرآن کو چاہئے کہ جاہل جھگڑا کریں تو یہ ان سے جھگڑا نہ

کرے بلکہ معاف کر دے اس لئے کہ یہ تو قرآن پاک کا علم رکھنے والا ہے۔ اسی طرح شبہات کے طریقوں سے اپنے آپ کو بچا کر رکھے کم ہنسے اور محافل قرآن میں بالخصوص اور عام محافل میں بالعموم لا یعنی کلام سے گریز کرے، حلم اور وقار سے رہے، فقراء غرباء کے سامنے بھی عجز اختیار کرے، تکبر سے دور رہے، فتنہ کے خوف سے دنیا اور دنیاداروں سے دور رہے۔ (از قرطبی ج ا ص ۲۱)

آداب تلاوت قرآن:

☆ قرآن پاک پڑھنے کے دوران بغیر کسی ضرورت کے دنیاوی باتوں سے اجتناب کرے:

☆ قرآن پاک پڑھتے ہوئے اگر جمائی آجائے تو قراءت سے رک جائے، اس لئے کہ قرآن پڑھنے والا رب سے مناجات کر رہا ہے۔ اور جمائی شیطان کی طرف سے ہے۔

☆ قرآن پاک پڑھتے ہوئے اگر کسی کام کے لئے اٹھنا پڑے تو قرآن پاک کو بند کر کے جائے کھلا نہ چھوڑے۔

☆ قرآن پاک کے اوپر کوئی اور کتاب نہ رکھے، تاکہ قرآن پاک کی عظمت کا لحاظ پایا جائے کہ سب سے بلند ہے۔

☆ قرآن پاک کو پڑھتے ہوئے گود میں رکھے، یا کسی تکیہ، رحل وغیرہ پر رکھے، زمین پر نہ رکھے۔

☆ قرآن پاک کے الفاظ مبارکہ کو تھوک سے کسی تختی، کاغذ وغیرہ سے نہ مٹائے بلکہ پانی سے دھوئے اور وہ پانی بھی ناپاک جگہ پر نہ بہائے۔ اور راستہ پر بھی نہ بہائے کیونکہ وہ پانی بھی حرمت والا ہے :

" وكان من قبلنا من السلف منهم من يستشفي بغسالته "

''ہم سے پہلے ہمارے سلف صالحین قرآن پاک کے الفاظ مبارکہ کو دھو کر اس پانی سے شفا حاصل کرتے تھے''

☆ قرآن پاک کے اوراق کو دوسری کتب کی جلد کی حفاظت کے لئے ان پر نہ چڑھائے اگر ایسا کرے گا تو یہ ظلم عظیم ہوگا ہاں اگر قرآن پاک کے سیاہی سے لکھے ہوئے الفاظ پانی سے مٹ جائیں پھر کاغذ کو استعمال کرے تو جائز ہوگا۔

☆ قرآن پاک کی ہر دن میں ایک مرتبہ ضرور زیارت کیا کرو۔ کیونکہ قرآن پاک کو دیکھنا بھی عبادت ہے قرآن پاک کو دیکھنے سے دل پر ایک عجیب پر اسرار کیفیت طاری ہوتی ہے:

" عن ابی سعید الخدری قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اعطوا اعینکم خظها من العبادة قالوا یا رسول الله وما حظها من العبادة قال النظر فی المصحف والتفکر فیه والاعتبار عند عجائبه"

" حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی آنکھوں کو عبادت کا حصہ دو، صحابہ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ آنکھوں کا عبادت میں کیا حصہ ہے؟ آپ نے فرمایا قرآن پاک کو دیکھنا اور اس میں تفکر کرنا اور اس کے عجائب کو دیکھ کر عبرت پکڑنا"۔

سبحان اللہ نبی کریم ﷺ کو جوامع الکلم (بات مختصر، مطالب زیادہ) کا کیسا عظیم معجزہ حاصل تھا سوال ایک تھا کہ آنکھوں کا عبادت میں کیا حصہ ہے؟ آپ نے جواب تین مختصر الفاظ میں دیئے کہ قرآن پاک کو دیکھنا آنکھوں کی عبادت ہے قرآن پاک میں تفکر کرنا دل کی عبادت ہے قرآن پاک کے عجائب کو دیکھ کر عبرت پکڑنا منصب عظیم کا حصول ہے۔

"عن عبادة بن الصامت قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم افضل عبادة امتی قراء ة القرآن نظرا "

میری امت کی افضل عبادت قرآن پاک کو دیکھ کر پڑھنا ہے۔ یعنی قرآن پاک کے پڑھنے کا علیحدہ ثواب ہوگا۔ قرآن پاک کو دیکھنے کا ثواب علیحدہ حاصل ہوگا۔

☆ جب لوگ جمع ہو کر قرآن پاک پڑھ رہے ہوں تو آہستہ آہستہ پڑھیں بلند آواز سے نہ پڑھیں۔ اس لئے کہ ایک تو شور وغل نظر آئے گا جو قرآن پاک کے ادب کے منافی ہے دوسرا ایک دوسرے کی توجہ کا ادھر ادھر بٹ جائے گی۔ قرآن پاک کی طرف کامل توجہ نہیں ہوگی۔ (بعض حضرات کے نزدیک مطلقاً نماز کے اندر یا باہر قرآن پاک کی تلاوت کا سننا فرض ہے)۔ بے وقوف، جہلاء کی محافل میں قرآن پاک نہ پڑھا جائے جب وہ قرآن پاک کو نہ سنیں بلکہ اپنی باتوں میں مشغول رہیں ایسے ہی بازاروں میں جہاں لوگ اپنی خوش گپیوں میں

لگے ہوں وہاں قرآن پاک نہ پڑھے۔

☆ قرآن پاک کو تکیہ نہ بنائے قرآن پاک پر بازو وغیرہ کا سہارا نہ لے۔قرآن پاک جب دوسرے کو پکڑانا ہو تو بڑے ادب واحترام سے پکڑائے دوسرے کی طرف پھینکے نہیں۔

☆ قرآن پاک چھوٹے چھوٹے خط میں جیبی سائز کے لکھنے منع ہیں ۔اس لئے کہ اس میں قرآن پاک کی عظمت نظر نہیں آتی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا" **لایصغر المصحف**" قرآن پاک کے نسخوں کو چھوٹا نہ بنایا جائے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کے ہاتھ میں قرآن پاک کا ایک چھوٹا سا نسخہ دیکھا آپ نے پوچھا "**من کتبہ**" یہ کس نے لکھا ہے؟ اس شخص نے کہا "**انا**" میں نے لکھا ہے "**فضربه بالدرة**" آپ نے اسے کوڑا مار دیا۔ اور فرمایا "**عظموا القرآن**" "قرآن پاک کو عظیم بناؤ ۔یعنی قرآن پاک کی تعظیم کرو اور اسے بڑے سائز میں لکھنا اس کی عظمت ہے اور چھوٹے سائز میں لکھنا عظمت نہیں:

" **روی عن رسول الله صلى الله عليه وسلم انه نهى ان يقال مسيجد او ر مصيحف** "

" نبی کریم ﷺ نے مسجد کو مسیجد (چھوٹی سی مسجد) کہنے سے اور مصحف کو مصیحف (چھوٹا سا قرآن) کہنے سے منع فرمایا"۔

☆ " **روى ليث عن مجاهد قال لا بأس ان تكتب القرآن ثم تسقيه المريض** "

(لیث مجاہد سے روایت کیا ہے کہ قرآن پاک لکھ کر (دھوکر) مریض کو پلانے میں کوئی حرج نہیں۔

بلکہ اس میں شفا ہے جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ سلف صالحین قرآن پاک کے الفاظ مبارکہ کو دھوکر پانی سے شفا حاصل کرتے رہے:

" **عن ابی جعفر قال من وجد فی قلبه قساوة فليكتب " يس" فی جام بزعفران ثم یشربه**"

(ابوجعفر کہتے ہیں جس شخص کے دل میں سختی ہو اسے پیالہ (برتن) میں زعفران سے سورۃ یٰسین لکھ کر پلائی جائے یعنی اسے قساوۃ قلب (سختی دل) سے نجات حاصل ہوگی۔

ہاں البتہ یہ خیال رہے کہ قرآن پاک کے الفاظ مبارکہ سے تعویذ لکھے تو اسے چمڑے میں یا چاندی میں یا اس طرح کی کسی چیز میں بند کر کے گلے میں ڈالے تو بیت الخلاء میں جانا جائز ہوگا۔کھلا تعویذ گلے میں ڈال کر، بیت الخلاء میں جانا جائز نہیں اس میں قرآن پاک کی توہین ہے۔

(ماخوذ از قرطبی ج ۱ ص ۲۸ تا ص ۳۱)

ختم قرآن مجید:

قرآن پاک جب ختم کرے تو مستحب یہ ہے کہ ساتھ ابتداء سے پھر پانچ آیات کی مقدار پڑھ لے تاکہ پتہ چلے کہ اس نے قرآن کو ختم کر کے چھوڑ نہیں دینا بلکہ پھر پڑھتے رہنا ہے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ایک شخص آیا اس نے پوچھا یارسول اللہ کون سا عمل افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

"علیک الحال والمرتحل" تم اپنے آپ پر حال ومرتحل کو لازم کرلو صحابی نے عرض کیا "ماالحال والمرتحل ؟" یارسول اللہ حال و مرتحل کیا ہے؟ آپ نے فرمایا:

"صاحب القرآن یضرب من اولہ حتی یبلغ آخرہ ثم یضرب فی اولہ کلما حل ارتحل"

قرآن پاک پڑھنے والا اول سے شروع کر کے جب آخر تک پہنچ جائے تو پھر سے شروع کرے۔یعنی جب پہنچے پھر کوچ کرلے یعنی وہاں ختم پر ہی قرار نہ پکڑے۔

(قرطبی ج ۱ ص ۳۰)

" اخرج الدارمی بسند حسن عن ابن عباس عن ابی بن کعب ان النبی ﷺ کان اذا قرأ قل اعوذ برب الناس افتتح من الحمد ثم قرأ من البقرۃ الی واولئک ھم المفلحون ثم دعا بدعاء الختمۃ ثم قام "

''ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ جب بھی " قل اعوذ برب الناس" پڑھتے (یعنی قرآن پاک ختم فرماتے) تو پھر سے الحمد کو شروع فرما لیتے اور سورۃ بقرہ کی ابتدائی آیات " اولئک ھم المفلحون "تک پڑھتے پھر آپ ختم قرآن کی دعاء فرماتے پھر کھڑے ہوتے (یعنی ختم قرآن کی دعاء کے بعد مجلس برخاست فرماتے)

سبحان اللہ ! اہل سنت و جماعت کا مسلک کیا جگمگاتا ہوا سنت مصطفیٰ ﷺ کے مطابق ہے۔ لوگ اپنی بے سمجھی سے ختم قرآن کی محافل میں ''چہار قل ، فاتحہ ، سورۃ بقرہ کی ابتدائی آیات'' پڑھنے پر معترض ہوتے رہتے ہیں۔ کاش کہ ضد، عناد کو چھوڑ کر کتب کا مطالعہ کر کے اپنی اصلاح فرمائیں۔

☆ ختم قرآن کے بعد دعاء کرنا مستحب ہے طبرانی وغیرہ نے عرباض ابن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث بیان کی ہے ''من ختم القرآن فله دعوة مستجابة '' جو شخص قرآن پاک ختم کرے اس کی دعاء کو قبول کیا جاتا ہے۔

☆ '' وفي الشعب من حديث انس مرفوعا من قرأ القرآن وحمد الرب وصلي على النبي ﷺ واستغفر ربه فقد طلب الخير مكانه ''

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے مرفوع حدیث بیان کی کہ جس شخص نے قرآن پاک پڑھا اور رب تعالیٰ کی حمد کی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھا اور رب تعالیٰ سے بخشش طلب کی تو اس نے خیر طلب کر لی۔

واضح ہوا کہ ختم قرآن کے بعد انسان کو مقام خیر حاصل ہو جاتا ہے اسے قبولیتِ دعاء کا شرف حاصل ہو جاتا ہے۔

☆ ''اخرج ابن ابی داؤد عن جماعة من التابعين وان يحضر اهله واصدقاءه ''

ابن ابو داؤد نے بیان فرمایا کہ تابعین کی ایک جماعت (یعنی کئی لوگوں) کا طرز عمل یہ تھا کہ وہ ختم قرآن پر اپنے اہل و اعیال کو اور اپنے احباب کو جمع کرتے تھے وجہ یہی تھی کہ یہ مقام قبولیتِ دعا ہے لہٰذا زیادہ احباب کی شرکت اجتماعی دعاء کے لئے اور زیادہ مفید ہے۔

☆ '' اخرج الطبراني عن انس انه كان اذا ختم القرآن جمع اهله ودعا ''

طبرانی نے بیان کیا حضرت انس رضی اللہ عنہ سے جب قرآن پاک ختم فرماتے تو اپنے اہل و عیال کو جمع کر کے دعاء کرتے۔

☆ ''واخرج ابن ابی داؤد عن الحكم بن عتيبة قال ارسل الى مجاهد وعنده ابن ابی امامة وقالا انا ارسلنا اليک لانا اردنا ان نختم القرآن والدعاء يستجاب عند ختم

القرآن"

ابن ابوداؤد کہتے ہیں کہ حکم ابن عتیبہ کے پاس ابوامامہ بھی موجود تھے انہوں نے مجاہد کو بلوایا پھران دونوں (حکم اور ابوامامہ) نے کہا کہ ہم قرآن پاک ختم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں چونکہ ختم قرآن پر دعاء مقبول ہوتی ہے اس لئے ہم نے تمہیں بھی بلایا ہے کہ تم بھی دعاء میں شریک ہو جاؤ۔

☆ "واخرج عن مجاهد قال كانوا يجتمعون عند ختم القرآن ويقول عنده تنزل الرحمة"

مجاہد کہتے ہیں کہ (تابعین حضرات) ختم قرآن پر سب مل کر دعاء کرتے کیونکہ ختم قرآن پر رحمت کا نزول ہوتا ہے۔

(ماخوذ از الاتقان ج ا ص ١١٠، ١١١)

" عن حميد الاعرج قال من قرء القرآن وختمه ثم دعا امن على دعائه أربعة آالاف ملك ثم لا يزالون يدعون له ويستغفرون ويصلون عليه الى المساء اوالى الصباح"

حضرت حمید اعرج کہتے ہیں جو شخص قرآن پاک ختم کرے پھر دعا کرے اس کی آمین پر چار ہزار فرشتے آمین کہتے ہیں پھر وہ دعاء کرتے رہتے ہیں اور اس کے لئے بخشش طلب کرتے رہتے ہیں۔ اور اس کے لئے دعا و رحمت کرتے رہتے ہیں صبح تک یا شام تک۔

یعنی اگر دن کو وہ ختم قرآن پر دعاء کرے تو فرشتے اس کے لئے شام تک دعاء کرتے ہیں اور اگر رات کو ختم قرآن پر دعاء کرے تو فرشتے اس کے لئے صبح تک دعاء کرتے رہتے ہیں۔

قرآن پاک کی ترتیب:

صحابہ کرام نے قرآن پاک کو جمع کرنے میں بہت بڑی کوشش کی۔ مختلف چیزوں پر لکھا ہوا قرآن جو چمڑے کے ٹکڑوں پر، کھجور کے پتوں وغیرہ پر اسے جمع کرنے میں ایک جگہ لکھنے میں کتنی محنت کی گئی ہر صاحب عقل سمجھ سکتا ہے لیکن یہ محنت صرف اسی درجہ کی تھی۔ قرآن پاک کی ترتیب کوئی صحابہ کرام نے اپنی طرف سے نہیں دی بلکہ وہی ترتیب تھی جو نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائی

تھی۔ اور وہ لوح محفوظ کے مطابق تھی وہی ترتیب بفضلہٖ تعالیٰ ہمارے پاس موجود ہے۔

" کتبوہ کما سمعوہ من رسول اللہ ﷺ من غیر ان قدموا او اخروا شیئا او وضعوا لہ ترتیبا لم یاخذوہ من رسول اللہ ﷺ "

صحابہ کرام نے قرآن پاک اسی طرح لکھا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا اس میں ذرا بھر کوئی تقدیم، کوئی تاخیر نہیں پائی گئی۔ اور نہ ہی کوئی ایسی ترتیب صحابہ کرام نے اپنی طرف سے دی جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہ ہو۔

" کان رسول اللہ ﷺ یلقن اصحابہ ویعلمھم ما ینزل علیہ من القرآن علی الترتیب الذی ھو الآن فی مصاحفنا بتوقیف جبریل علیہ السلام ایاہ علی ذلک واعلامہ عند نزول کل آیۃ ان ھذہ الآیۃ تکتیب عقب آیۃ کذا فی سورۃ کذا "

" نبی کریم ﷺ اپنے صحابہ کرام کو تلقین فرماتے تھے اور ان کو بتاتے تھے کہ ترتیب اس طرح ہے یہ وہی ترتیب تھی جو آج بھی ہمارے پاس قرآن پاک کتابی شکل میں موجود ہے یہ ترتیب درحقیقت جبرائیل علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حکم سے بیان فرمائی۔ کیونکہ جب کوئی آیت لاتے تو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کرتے کہ اس آیت کو فلاں آیت کے بعد لکھا جائے اور فلاں سورۃ میں لکھا جائے "

" فثبت ان سعی الصحابۃ کان فی جمعۃ فی موضع واحد لا فی ترتیبہ فان القرآن مکتوب فی اللوح المحفوظ علی النحو الذی ھو فی مصاحفنا الآن "

واضح ہوا کہ صحابہ کرام نے صرف اس میں کوشش کی کہ انہوں نے قرآن پاک کو ایک جگہ جمع کر دیا انہوں نے خود اپنی طرف سے قرآن پاک کو کوئی ترتیب نہیں دی۔ بیشک قرآن پاک لوح محفوظ میں اسی ترتیب پر ہے جو ترتیب ہمارے پاس موجود ہے۔ (خازن ج ۱ ص ۸)

ابھی تفسیر خازن کے حوالہ سے جو بحث ذکر کی ہے تقریباً وہی علامہ بغوی نے شرح السنۃ میں بیان کی ہے اسے نقل کرنے کے بعد علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

" فان القرآن مکتوب فی اللوح المحفوظ علی ھذا الترتیب انزلہ اللہ جملۃ الی السماء الدنیا ثم کان ینزلہ مفرقا عند الحاجۃ وترتیب النزول غیر ترتیب التلاوۃ "

بیشک قرآن پاک لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے اسی ترتیب کے مطابق تمام کا تمام ایک مرتبہ ہی آسمان دنیا پر نازل کر دیا گیا پھر ضرورت کے مطابق آہستہ آہستہ نبی کریم ﷺ پر نازل ہوتا رہا۔

ہاں یہی بات سمجھنے کے قابل ہے کہ قرآن پاک کے نزول کی ترتیب اور ہے اور قرآن پاک کی تلاوت کے لحاظ پر اور لوح محفوظ پر ہونے کے لحاظ سے اور آسمان دنیا پر ہونے کے لحاظ سے ترتیب اور ہے

" وقال ابن الحصار ترتيب السور ووضع الآيات مواضعها انما كان بالوحي كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول ضعوا آية كذا في موضع كذا وقد حصل اليقين من النقل المتواتر بهذا الترتيب من تلاوة رسول الله صلى الله عليه وسلم ومما اجمع الصحابة على وضعه هكذا في المصحف "

ابن حصار نے بیان فرمایا ہے سورتوں کی ترتیب، آیات کی ترتیب، ہر آیت کا اپنی جگہ میں رکھا جانا، یہ وحی سے ثابت ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ یہ آیت فلاں جگہ پر رکھو متواتر طور پر یہ منقول ہوتا آ رہا ہے کہ یہ یہی ترتیب رسول اللہ ﷺ کی تلاوت کی تھی اور اسی پر صحابہ کرام کا اجماع ہے اب یقینی علم حاصل ہو گیا۔ کہ ہمارے پاس قرآن پاک اسی ترتیب پر ہے جو لوح محفوظ میں۔ اور جسے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا:

" وقال الطيبي انزل القرآن اولا جملة واحدة من اللوح المحفوظ الى السماء الدنيا ثم نزل مفرقا على حسب المصالح ثم اثبت في المصاحف على التاليف والنظم المثبت في اللوح المحفوظ "

" علامہ طیبی رحمہ اللہ نے بھی یہی بیان کیا کہ قرآن پاک تمام کا تمام ایک مرتبہ ہی لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر نازل ہو گیا پھر مصلحت کے مطابق یعنی بحسب ضرورت آہستہ آہستہ اس کا نزول ہوتا رہا لیکن قرآن پاک جو کتابی صورت میں جمع ہے یہ وہی ترتیب ہے جو لوح محفوظ پر ہے۔

(ماخوذ از الاتقان ج ص ۲۱، ۲۳)

قرآن پاک شک وشبہ سے بالاتر ہے:

علامہ زرقانی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ قرآن پاک کو لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر اتارا۔ پھر

نبی کریم ﷺ کے قلب مبارک پر اتارا۔ یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ قرآن پاک شک وشبہ سے بالاتر ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کے قلب مبارک کے علاوہ دو اور جگہ بھی قرآن پاک محفوظ ہے۔

(مناهل العرفان ج ۱ ص ۳۹، معارف القرآن)

سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات:

جب آپ کی عمر مبارک چالیس سال تھی غارِ حرا میں پہلی بار سورۃ " اقرا " کی پانچ آیتیں نازل ہوئیں۔اس کے بعد کچھ دیر تک یہ سلسلہ رُکا رہا۔محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ سلسلہ وحی کے رک جانے کے بعد سب سے پہلے سورۂ مدثر کی آیتیں نازل ہوئیں۔آپ حرا سے واپس آرہے تھے کہ ایک آواز سنائی دی آپ نے ادھر ادھر دیکھا کچھ نظر نہ آیا اوراوپر دیکھا تو وہی فرشتہ جبریل نظر آیا۔(جو پہلے اقرأ کی آیات لاچکا تھا)۔حضور ﷺ حضرت خدیجہ کے پاس آئے فرمایا مجھے چادر دو اور مجھے ٹھنڈا پانی ڈال دو۔ اسی حالت میں یہ آیتیں نازل ہوئیں ﴿ یاایها المدثر، قم فانذر، وربک فکبر﴾

(فیوض الباری شرح بخاری ج ۱ ص ۶۹)

وحی کے مراتب: علماء کرام نے وحی کے کئی مراتب بیان کئے ہیں:

اول مرتبہ : رؤیاء صالحہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنھا کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ابتدا میں جو چیز سب سے پہلے ظاہر ہوئی وہ رؤیاء صالحہ ہے۔اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ "وکان لا یری الاجاء ت مثل فلق الصبح " یعنی حضور کی رؤیا ایسی ہوتی جیسے صبح صادق کا طلوع ہونا کتابوں میں مذکور ہے یہ کیفیت چھ مہینہ رہی۔چنانچہ اس عرصہ میں نبوت میں کلام ہے۔(صحیح یہ ہی ہے کہ نبوت کا اعلان کرنے کا حکم نزول آیات اقرأ سے ہوا)۔

دوسرا مرتبہ : وحی کا یہ تھا کہ جبرائیل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے قلب شریف میں القاء کرتے تھے بغیر اس کے کہ حضور علیہ السلام جبرائیل کو دیکھیں جیسا کہ آپ نے فرمایا کہ میرے دل میں روح قدس نے القاء والہام کیا ہے کہ ہرگز اس وقت تک کوئی نہیں مرے گا جب تک کہ اپنا رزق پورا نہ کرے (آخر حدیث تک) اس حدیث کو حاکم نے روایت کر کے صحیح کہا ہے۔

تیسرا مرتبہ: وحی کا یہ تھا کہ جبرائیل علیہ السلام کسی آدمی کی صورت اختیار کر کے حضور ﷺ کے پاس آتے تھے اور اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے تھے تا کہ آپ اسے یاد کر لیں اکثر طور پر حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی صورت میں آتے تھے۔

چوتھا مرتبہ: وحی کا یہ تھا کہ صلصلۃ الجرس یعنی رہٹ (یا گھنٹی) کی مانند آواز سنائی دیتی تھی اور نبی کریم ﷺ کے سوا کوئی دوسرا وحی کے کلمات اور معانی کو نہیں سمجھ سکتا تھا وحی کی تمام قسموں سے یہی قسم آپ پر زیادہ سخت تھی یہاں تک کہ شدید سردی کے دنوں میں آپ کی پیشانی مبارک سے پسینہ ٹپکنے لگتا تھا اور اگر آپ اونٹ پر سوار ہوتے تو وہ شدید بوجھ محسوس کرتے ہوئے بیٹھ جاتا تھا ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ پر اس طرح وحی آئی اس وقت آپ اپنا سر مبارک زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی ران پر رکھے ہوئے تھے ان کی ران اتنی وزنی ہوگئی کہ قریب تھا کہ وہ ٹوٹ جائے۔

طبرانی نے زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ پر وحی آنے کی حالت لکھتا ہوں کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ پر اتنی شدت وسختی ہوتی کہ چہرے پر چاندی کے دانوں کی مانند پسینہ ٹپک آتا تھا ایک دن آپ میری ران پر سر رکھے ہوئے تھے اسی حالت میں وحی آئی میری ران اتنی وزنی ہوگئی کہ قریب تھا کہ میرا پاؤں ٹوٹ جائے۔ اور میں نے گمان کیا کہ اب میں کبھی اپنے پاؤں پر نہ چل سکوں گا۔ اسی طرح جس وقت سورۂ مائدہ نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئی تو قریب تھا کہ نبی کریم ﷺ کی اونٹنی کی ٹانگیں اس سے ٹوٹ جائیں۔

وحی میں مطلقاً ثقل وبوجھ بھی آیا ہے۔ چنانچہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ اس کی وجہ سے سختی محسوس فرماتے اور آپ کے روئے تابان کا رنگ متغیر ہوجاتا۔ اور خاکستری رنگ کی مانند ہوجاتا اور آپ کا سر مبارک جھک جاتا آپ کے اصحاب بھی اپنے سر جھکا لیتے جب یہ کیفیت ختم ہوتی تو اپنا سر مبارک جھکا لیتے۔

عجیب حکمت: علماء محققین نے اس کی وجہ بیان فرمائی کہ ایسا کیوں ہوتا کہ کبھی جبرائیل انسانی شکل میں آتے اور کبھی نبی کریم ﷺ پر یہ کیفیت طاری ہوتی اس کی وجہ یہ ہے فیض حاصل کرنے اور فیض پہنچانے میں یکسانیت ومناسبت شرط ہے۔ اسی لئے جبرائیل جب کبھی اپنی اصلی نورانی حالت

میں حاضر ہوتے تو حضور ﷺ پر بھی نورانیت غالب ہو جاتی اس وقت یہ شدت والی کیفیت ہوتی تھی کیونکہ اس وقت نورانیت بشریت پر غالب ہوتی تھی۔ اور بعض اوقات نبی کریم ﷺ کی بشریت جبرائیل کی نورانیت پر بھی غالب ہو جاتی تھی۔ اس وقت جبرائیل کو بھی بشری شکل میں آنا پڑتا۔

پانچواں مرتبہ: یہ تھا کہ کبھی جبرائیل علیہ السلام اپنی اصلی صورت میں (مع تین سو یا چھ سو پروں کے) آتے اور وحی پہنچاتے اس صورت میں جبرائیل صرف دو بار حاضر ہوئے۔

چھٹا مرتبہ: وحی کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر اس حالت میں وحی فرمائی جب کہ آپ آسمانوں کے اوپر شب معراج کو تشریف لے گئے نماز وغیرہ کی وحی اسی طرح فرمائی تھی۔

اسی وحی کی حالت میں رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو علوم کے وہ خزانے عطاء فرمائے جن کو صرف رب تعالیٰ یا اس کے رسول ﷺ ہی جانتے ہیں دوسرے کسی انسان کو معلوم نہیں وہ کیا دیا، کتنا دیا حقیقت یہی ہے کہ بہت بہت کچھ عطا فرمایا رب تعالیٰ نے فرمایا ۞ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ۞ وحی کی اپنے بندے کی طرف جو وحی کی۔

اے غافل انسان! جب رب تعالیٰ نے یہ نہیں بتایا کہ میں نے کیا دیا ہے صرف اتنا فرمایا جو دینا تھا دیا۔ تو تجھے کیا ہوا تو اپنی عاقبت کیوں برباد کر رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے علم کو پیمانوں سے ناپ رہا ہے۔

ساتواں مرتبہ: وحی کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نبی کریم ﷺ سے براہ راست کلام فرمانا جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا یعنی حجاب میں کلام فرمایا۔

یعنی شب معراج کو بعض چیزیں بلاواسطہ جبرائیل آپ کے دل پر القاء کی گئیں اور کچھ براہ راست کلام سے عطاء ہوئیں، سبحان اللہ کیا مقام ہے میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کا کتنی عظمت ہے لیکن ایمان ہو تو سمجھ میں آئے۔ معاملہ قسمت کا ہے کوئی علم کی وسعت بیان کر رہا ہے کوئی بے علم اس ذات کے علم کا ناپ تول کر رہا ہے جس ذات کے علم کے سمندر کے مقابلہ میں ساری مخلوق کا علم ایک قطرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

آٹھواں مرتبہ: وحی کا یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ سے اللہ تعالیٰ نے بغیر حجاب کے اپنے دیدار

سے مشرف فرما کر کلام فرمایا یہی حق مذہب یہی قول تحقیق پر مبنی ہے کہ حضور ﷺ شب معراج کو دیدار باری تعالیٰ سے مشرف ہوئے۔ (ماخوذ از مدارج النبوۃ ج ۲ بعنوان مراتب وحی)

آیات کا مکی اور مدنی ہونا:

آیات کے مکی ہونے یا مدنی ہونے میں تین قول ہیں لیکن ان میں زیادہ مشہور، زیادہ صحیح اور زیادہ معتبر قول یہ ہے:

"ان المکی ما نزل قبل الھجرۃ والمدنی ما نزل بعدھا"

مکی وہ ہیں جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئیں اور مدنی وہ ہیں جو ہجرت کے بعد نازل ہوئیں۔

یعنی ہجرت کے بعد فتح مکہ کے سال مکہ میں نازل ہونے والی آیات اسی طرح حجۃ الوداع کے سال مکہ میں نازل ہونی والی آیات یا وہ آیات جو دوران سفر نازل ہوئیں بعد از ہجرت وہ سب مدنی ہیں۔ اس معتبر قول کے مطابق سب آیات یا مکی ہیں یا مدنی۔ کوئی آیت ایسی نہیں جو نہ مکی ہو اور نہ ہی مدنی ہو۔

دوسرا قول: مکی وہ آیات ہیں جو مکہ میں اتریں خواہ ہجرت کے بعد ہی کیوں نہ اتری ہوں۔ اور مدنی وہ ہیں جو مدینہ میں اتریں اس قول کے مطابق مکہ اور مدینہ سے باہر دوران سفر نازل ہونے والی آیات نہ مکی ہوں گی اور نہ ہی مدنی۔

تیسرا قول: جن آیات میں اہل مکہ کو خطاب ہے وہ مکی ہیں اور جن آیات میں خطاب اہل مدینہ کو ہے وہ مدنی ہیں۔ (از اتقان ج ۱ ص ۹)

تنبیہ: چونکہ مکی اور مدنی آیات کون سی ہیں؟ جب ان کی تعریف میں مختلف قول ہیں تو بعض آیات کے مکی اور مدنی ہونے میں بھی اختلاف نظر آئے گا لیکن پہلے معتبر قول کے مطابق ہی مکی اور مدنی ہونے کا تعین ہی بہتر ہے۔

مکی اور مدنی سورتوں کی تعداد:

" عن ابی سلمة الحضرمی سمعت ابن عباس قال سألت ابی بن کعب عما نزل من القرآن بالمدنیة فقال نزل بها سبع وعشرون سورة وسائرها بمكة "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ مدینہ میں کتنا قرآن پاک نازل ہوا انہوں نے کہا ستائیس سورتیں یہاں نازل ہوئیں باقی مکہ میں نازل ہوئیں یہ بھی خیال رہے بعض نے انتیس سورتیں مدنی بیان کی ہیں۔

بعض سورتیں مکی لیکن کچھ آیات مدنی ہیں:

مثلاً سورۃ انعام مکی ہے لیکن اس میں تین آیتیں " قل تعالوا اتل ...... الخ "مدنی ہیں اسی طرح سورۃ حج مکی ہے اس میں تین آیتیں " هذان خصمان ...... الخ " مدنی ہیں۔ اسی طرح اور مکی سورتوں میں بھی کچھ آیات مدنی ہیں اس بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہی بعض لوگ غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ سورۃ مکی ہے اس میں وہ احکام کیسے جن کا تعلق ہجرت کے بعد ہے۔

مدنی سورتیں:

" ویل للمطففین ، البقرة ، آل عمران ، الانفال ، الاحزاب ، المائدة ، الممتحنة النساء ، اذازلزلت ، الحدید ، محمد ، الرعد ، الرحمن ، هل اتی علی الانسان الطلاق ، لم یکن ، الحشر ، اذجاء نصر الله ، النور ، الحج ، المنافقون ، المجادلة ، الحجرات ، یاایها النبی لم تحرم ، الصف ، الجمعة ، التغابن ، الفتح ، براءة "

یہ بھی خیال رہے کہ بعض سورتوں کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف بھی پایا گیا ہے۔ الاتقان خازن وغیرہ کو دیکھا جائے۔

اعتراض: تم نے بیان کیا ہے کہ سورۃ اقرأ کی ابتدائی آیات سب سے پہلے نازل ہوئیں پھر سورۃ مدثر کی پہلی آیات حالانکہ ذکر کیا گیا ہے " اول ما انزل من القرآن اقرأ باسم ربک ثم ن ثم یاایھا المزمل ثم یا ایھا المدثر" . سب سے پہلے ﴿اقرأ باسم ربک﴾ نازل ہوئی پھر سورۃ "ن" پھر "یاایھا المزمل" پھر "یاایھا المدثر" سورۃ" مدثر" کو دوسرے نمبر پر رکھنا کس طرح صحیح ہے؟

جواب: یہاں جو ترتیب میں سورۃ مدثر کو چوتھے نمبر پر بیان کیا گیا ہے اس سے مراد پہلی آیات کے بعد والی سورۃ ہے اور جو دوسرے نمبر پر ذکر کیا ہے اس سے مراد پہلی آیات "فکبر" تک ہیں۔

مکی سورتوں کی پہچان کے لئے قاعدہ کلیہ:

ہر وہ سورۃ جس میں احناف کے مسلک کے مطابق سجدہ کی آیت پائی جائے وہ مکی ہے ہر وہ سورۃ جس میں لفظ "کلا" آیا ہوا ہے وہ مکی ہے یہ بھی خیال رہے کہ یہ لفظ پندرہ سورتوں میں تینتیس مرتبہ استعمال ہوا ہے جن آیات میں یہ لفظ استعمال ہوا وہ تقریباً قرآن پاک کے آخری نصف حصہ میں ہیں۔ ہر وہ سورۃ جس میں آدم علیہ السلام اور شیطان کا ذکر ہے البتہ سورۃ بقرہ میں یہ ذکر ہونے کے باوجود وہ مدنی ہے۔

مدنی سورتوں کی پہچان کے لئے قاعدہ کلیہ:

وہ آیات جن میں منافقین کا ذکر ہے وہ مدنی ہیں ۔خواہ وہ مدنی سورتوں میں ہوں یا مکی میں ہوں۔ اسی طرح وہ آیات جن میں جہاد کا حکم کیا گیا ہے یا جہاد کے متعلق کوئی احکام ذکر ہیں وہ بھی مدنی ہیں۔

مکی سورتوں کی پہچان کے لئے اکثر یہ قاعدہ:

پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ قاعدہ کلیہ وہ ہوتا ہے جو ہر جگہ جاری ہوتا ہے اور قاعدہ اکثر یہ وہ ہوتا ہے جو زیادہ جگہ پر جاری ہوتا ہے لیکن کبھی اس کے خلاف بھی پایا جاسکتا ہے۔ عام طور چھوٹی چھوٹی آیتیں اور

چھوٹی سورتیں مکی ہیں۔وہ آیتیں جو "یاایھا الناس " سے شروع ہیں وہ زیادہ طور پر مکی ہیں۔وہ آیات جن میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی کریم ﷺ کی رسالت کا ذکر ہے۔یا قیامت کے احوال کا ذکر پہلی امتوں کے حالات ،واقعات کا ذکر ہے وہ مکی ہیں۔اسی طرح مکی سورتوں میں مثالیں ،تشبیہات وغیرہ زیادہ ذکر ہیں۔اسی طرح مکی سورتوں میں کفار،مشرکین ،بت پرست لوگوں کا زیادہ ذکر ہے۔

مدنی سورتوں کی پہچان کے لئے قاعدہ اکثریہ:

مدنی آیات بڑی ہیں اسی طرح مدنی سورتیں بھی بڑی ہیں۔زیادہ طور پر مدنی آیات "یاایھا الذین امنوا " سے شروع ہیں مدنی سورتوں یا مدنی آیات میں زیادہ طور پر احکامات پائے گئے ہیں جیسے سورۃ بقرہ کو ہی دیکھا جائے کہ اس سورۃ میں کتنے احکامات موجود ہیں۔روزہ، حج ،ھدی ، جہاد ، چاند، نکاح ،طلاق ،قسم وغیرہ کے احکام موجود ہیں مکی سورتوں میں اس طرح بساطت سے احکام مذکور نہیں۔مدنی سورتوں میں تمثیلات وتشبیہات وغیرہ تقریباً نہیں پائے گئے بلکہ عام سا طریقہ استعمال کیا گیا ہے۔اسی طرح مدنی سورتوں میں زیادہ طور پر منافقین کا ذکر ہے اور یہود ونصاریٰ کا ذکر ہے۔

یہ مسئلہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں:

یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ مکہ مکرمہ میں مشرکین سے واسطہ تھا اس لئے وہاں نزول آیات میں وہی منافقین تھے۔

اور مدینہ طیبہ میں یہود نصاریٰ زیادہ تعداد میں تھے لہذا مخاطبین وہی تھے خصوصاً عبداللہ ابن ابی جو منافقوں کا سردار تھا نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے اسے مدینہ کا رئیس بنانے اور اس کی تاج پوشی کا انتظام مکمل ہو چکا تھا آپ کے آنے سے اس کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تو وہ منافق ہو گیا کیونکہ ظاہر طور پر مخالفت وہ کر نہیں سکتا تھا۔تو اوپر سے مسلمان بن کر مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا تھا۔چونکہ منافقین کا ٹولہ بھی مدینہ طیبہ میں ہی تھا اس لئے وہاں نازل ہونے والی آیات میں ان کو بھی مخاطب بنایا گیا۔

قرآن پاک کا سات حروف پر ہونا:

تقریباً اکیس صحابہ کرام سے یہ حدیث روایت کی گئی " نزل القرآن علی سبعة احرف " (قرآن پاک کو سات حروف پر نازل کیا گیا)۔"وقد نص ابو عبیدہ علی تواترہ " ابوعبیدہ نے بیان کیا ہے کہ یہ حدیث تواتر سے مروی ہے۔راقم کے خیال میں اکیس صحابہ کرام کی تعداد سے ہی تواتر سمجھ آ رہا ہے کیونکہ تواتر کا مطلب ہی یہ ہے کہ اتنے راوی ہوں جو جھوٹ پر متفق نہ ہوسکیں۔

بخاری مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

" انا رسول الله صلى الله عليه وسلم قال اقرأ نی جبریل علی حرف فراجعته فلم ازل استزیده ویزدنی حتی انتهی الی سبعة احرف "

"نبی کریم ﷺ نے فرمایا جبرائیل نے مجھے ایک حرف پر پڑھنے کے متعلق کہا میں اسے لوٹاتا رہا اور زیادہ حروف پر پڑھنے کا مطالبہ کرتا رہا وہ (ایک ایک حرف) کو زیادہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ سات حروف تک انتہاء کی"۔

مسلم میں ابی کی حدیث میں ہے:

" ان ربی ارسل اقرأ القرآن علی حرف فرددت الیه ان هون علی امتی فارسل الی ان اقرأه علی حرفین فرددت ان هون علی امتی فارسل ان اقرأه علی سبعة احرف "

" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے پاس رب تعالیٰ نے پیغام بھیجا کہ میں ایک حرف پر قرآن پڑھوں میں نے پیغام رساں کو اس کی طرف لوٹایا۔اور عرض کیا کہ میری امت پر آسانی فرما پھر مجھے دو حرفوں پر پڑھنے کے متعلق کہا میں نے پھر امت کے لئے آسانی کی درخواست کی (اس طرح میں عرض کرتا رہا یہاں تک کہ) مجھے سات حرفوں پر پڑھنے کی اجازت دی گئی"۔

سات حرفوں والی احادیث سے مراد کیا؟

اگرچہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ اس میں چالیس اقوال ہیں تاہم ان سے مشہور اقوال یہاں نقل کر رہا ہوں تقریباً وہ تمام ہی مراد ہو سکتے ہیں ان میں کوئی اختلاف نہیں۔

پہلا قول: سات حروف سے مراد سات وجوہ ہیں۔

(۱) مختلف حرکات پڑھنے کی اجازت جو کہ لفظ معنی اور شکل نہ بدلے جیسے "ولا یضار کاتب" میں راء پر زبر بھی جائز ہے اور پیش بھی۔

(۲) فعل بدل جائے بعض قراءتوں میں ماضی ہو اور بعض میں امر وغیرہ ہو جیسا کہ "باعد بین اسفارنا" میں ماضی اور امر کی دونوں قراءتیں پائی گئی ہیں اور اسی طرح "باعد" اور "بعد" میں بھی دونوں صورتیں پائی گئی ہیں۔

(۳) دونوں قراءتوں میں لفظ بدلے ہوئے ہوں معنی ایک ہو جیسا کہ "ننشزھا" میں ایک قراءت راء مہملہ سے ہے اور دوسری قراءت زاء معجمہ سے ہے۔

(۴) ایک قراءت میں ایک حرف استعمال ہے جب کہ دوسری قراءت میں دوسرا قریب المخرج لفظ استعمال ہے جیسا کہ "طلح منضود" میں حاء سے بھی ہے اور عین سے بھی "طلع منضود" پڑھا گیا ہے۔

(۵) تقدیم و تاخیر پائی گئی ہو جیسا "وجاءت سکرۃ الموت بالحق" میں "وسکرۃ الحق بالموت" بھی آیا ہوا ہے۔

(۶) زیادتی یا نقصان سے تغیر پایا جائے جیسا کہ ایک قراءت میں "والذکر والانثی" اور دوسری میں "وما خلق الذکر والانثی" ہے۔

(۷) الفاظ مختلف ہوں جیسا کہ ایک جگہ کا لعھن المنفوش ہے اور دوسری قراءت میں کالصوف المنفوش ہے۔ خیال رہے کہ یہ قول ابن ابی قتیبہ کا ہے اس پر قاسم بن ثابت نے اعتراض بھی کیا ہے تاہم جواب یہ دیا گیا ہے کہ ہوسکتا ہے ابن ابی قتیبہ ان تمام صورتوں کے جواز پر قراء کے اتفاق پر مطلع ہوئے ہوں۔ اور قاسم بن ثابت اس پر مطلع نہ ہو سکے ہوں۔

دوسرا قول: یہ قول تقریباً پہلے قول کے کچھ قریب ہے جو ابو الفضل رازی کا ہے کہ سات حروف سے مراد سات وجوہ ہیں:

(۱) اسماء میں اختلاف یعنی افراد، تثنیہ، جمع اور تذکیر، تانیث میں مختلف قراءتوں میں اختلاف ہو۔

(۲) افعال کی گردانوں میں اختلاف ہو ماضی ہو ،مضارع ہو، یاامر ہو یعنی کسی قراءت میں ماضی ہو اور کسی میں مضارع ہو۔

(۳) مختلف حرکات ہوں کسی قراءت میں ایک حرکت ہو اور کسی میں دوسری۔

(۴) کمی اور زیادتی کسی قراءت میں لفظ کم ہوں اور کسی میں زیادہ ہوں۔

(۵) تقدیم وتاخیر کسی قراءت میں بعض لفظ پہلے ہوں اور کسی قراءت میں وہی لفظ بعد میں ہوں۔

(۶) ابدال بعض قراٗتوں میں جو لفظ ہو دوسری قراٗت میں وہ لفظ نہ ہوں بلکہ اسی معنی میں اور لفظ ہو۔

(۷) اختلاف لغات ،یعنی ادغام واظہار وغیرہ میں اختلاف کسی قراءت میں ایک لفظ مدغم ہے تو دوسری میں وہی مظہر یعنی غیر مدغم ہے اسی طرح امالہ اور فتح (غیر امالہ) ترقیق اور تفخیم وغیرہ کا اختلاف پایا جائے۔

تیسرا قول: " ان المراد سبع لغات " سات حروف سے مراد سات لغات ہیں ابوعبید اور زہری اور ان کے علاوہ کئی حضرات کا یہی قول ہے۔

فائدہ: سورۃ فاتحہ ، اخلاص ، کوثر ، تبت ، لم یکن ، نصر ، فلق ، الناس ، انعام۔ یہ تمام سورتیں مکمل مکمل نازل ہوئیں ۔اس طرح نہیں جس طرح "اقراء " کی پہلی آیات " ما لم یعلم " تک پہلے نازل ہوئیں اور بعد والی بعد میں نازل ہوئیں اسی طرح "والضحی" کی پہلی آیات " فترضی " تک پہلے نازل ہوئیں باقی بعد میں۔ زیادہ سورتیں متفرق ،متفرق طور پر ہی نازل ہوئیں۔

(ماخوذ از اتقان ج ۱ ص ۳۷)

فائدہ: " ان احرف القرآن فی اللوح المحفوظ کل حرف منها بقدر جبل قاف ان تحت کل حرف منها معانی لا یحیط بها الا الله "

''لوح محفوظ میں قرآن پاک کے حروف میں ہر حرف کوہ قاف کی طرح ہے اور ہر حرف کے نیچے کتنے معانی ہیں ۔ان کا احاطہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کرسکتا ہے''۔

(الاتقان ج ۱ ص ۳۳)

• اسی سے ایک اور فائدہ حاصل ہوگیا کہ نبی کریم ﷺ پر جب قرآن پاک نازل ہوا تو یقیناً آپ کوتمام حروف کے معانی کا علم عطا کیا گیا ہے ۔تو آپ کے علوم کوبھی اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

خیال رہے کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے یہ قول نقل کیا ہے اس بحث میں کہ قرآن پاک کے الفاظ ومعانی نازل ہوتے ہیں، یا صرف معانی تاہم جو فائدہ راقم نے نقل کیا ہے وہ بھی واضح ہے اس میں کوئی اخفاء نہیں۔

فائدہ: "عن سفیان الثوری قال لم ینزل وحی الا بالعربیة ثم ترجم کل نبی لقومه"

سفیان ثوری رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ ہر نبی پر وحی عربی میں ہی نازل ہوئی۔ بعد میں ہر نبی نے اپنی اپنی قوم کے لئے ان کی زبان میں ترجمہ کیا۔

فائدہ: اکثر سورتوں کا ایک ایک نام ہے لیکن بعض سورتوں کے دو یا دو سے زیادہ نام ہیں جیسا کہ سورۃ فاتحہ کے پچیس نام بیان کئے گئے ہیں۔

قرآن پاک تین مرتبہ جمع ہوا:

پہلی مرتبہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں۔ لیکن یہ لوگوں کے سینوں میں جمع ہوا۔ اگرچہ آیات مبارکہ کی ترتیب نزول کے لحاظ پر اور تھی۔ لیکن پڑھنے کے لحاظ پر ترتیب نبی کریم ﷺ نے جو بیان فرمائی وہی آج بھی ہے۔ (از اتقان ج ا ص ۵۹)

اعتراض: "عن زید بن ثابت قال قبض النبی ﷺ ولم یکن القرآن جمع فی شی"

حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ جب دنیا سے تشریف لے گئے۔ تو اس وقت تک قرآن پاک کسی چیز میں جمع نہیں تھا۔

اس سے تو یہ ثابت ہو رہا ہے کہ قرآن پاک نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے بعد جمع ہوا کس طرح کہا جاتا ہے کہ پہلی مرتبہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں جمع ہوا۔

جواب: حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پاک کتابی شکل میں آپ کے زمانہ میں جمع نہیں ہوا۔ بلکہ مختلف چیزوں پر نزول کے لحاظ پر آیات لکھی ہوئی تھیں یہ جو بیان کیا گیا ہے کہ آپ کے زمانہ میں جمع ہوا اس کا مطلب پہلے ہی واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ پڑھنے کی ترتیب کے لحاظ پر لوگوں کے سینوں میں جمع کیا گیا تھا کتابی شکل میں تمام قرآن پاک کو ایک جگہ نہیں لکھا گیا تھا۔

" قال مسروق عن عائشة رضی الله عنها عن فاطمة علیها السلام اسر الی النبی ﷺ ان جبریل کان یعارضنی بالقرآن کل سنة وانه عارضنی العام مرتین ولااراه الا حضراجلی "

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ میرے ساتھ نبی کریم ﷺ نے راز کے طور پر یہ بات فرمائی کہ بیشک جبرائیل میرے ساتھ ہر سال ایک مرتبہ قرآن پاک کا دور کرتے تھے اس مرتبہ انہوں نے میرے ساتھ دو مرتبہ دور کیا ہے۔ مجھے یہی یقین ہو رہا ہے کہ میرے وصال کا وقت آ چکا ہے۔

" عن ابن عباس رضی الله عنهما قال کان النبی ﷺ اجود الناس بالخیر واجود مایکون فی شهر رمضان لان جبریل کان یلقاه فی کل لیلة فی شهر رمضان حتی ینسلخ یعرض علیه رسول الله ﷺ القرآن **فاذا لقیه جبریل کان اجود بالخیر من الریح المرسلة "**

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ سب لوگوں سے بھلائی کے کاموں میں زیادہ سخی تھے آپ رمضان شریف میں بہت زیادہ سخاوت فرماتے تھے اس لئے کہ جبرائیل آپ سے رمضان کے مہینے میں ہر رات ملاقات فرماتے تھے یہاں تک کہ اسی حال میں رمضان گزر جاتا۔ نبی کریم ﷺ ان سے قرآن کا دور کرتے تھے جب آپ کو جبرائیل ملتے تو آپ بارش کی خوشخبری لانے والی ہوا سے بھی زیادہ سخاوت فرماتے تھے۔

" عن ابی هریرة قال کان یعرض علی النبی ﷺ القرآن کل عام مرة فعرض علیه مرتین فی العام الذی قبض فیه وکان یعتکف فی کل عام عشرا فاعتکف عشرین فی العام الذی قبض فیه "

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں (جبرائیل) نبی کریم ﷺ سے ہر سال ایک مرتبہ دور کرتے تھے۔ جس سال نبی کریم ﷺ کا وصال ہوا اس سال دو مرتبہ دور کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال دس دن اعتکاف بیٹھتے تھے جس سال آپ کا وصال ہوا اس سال بیس دن اعتکاف بیٹھے۔

(احادیث ثلاثه من بخاری باب کان جبرایل یعرض القرآن علی النبی صلی الله علیه وسلم)

مختصر وضاحت احادیث:

"یعرض بکسر الراء ای یقرأ والمراد یستعرضه"

" ما اقرأه ایاه " یعرض کا معنی ہے پڑھنا یہاں مراد ہے کہ کسی کو پڑھ کر سنانا۔ چونکہ بعض احادیث میں باب مفاعلہ سے "عارض" لفظ استعمال ہے۔ جو جانبین سے فعل کے پائے جانے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لئے معنی یہ ہوگا کہ جبرائیل مجھے پڑھ کر سناتے اور میں انہیں پڑھ کر سناتا۔

" اجود الناس" حدیث شریف پہلے مطلق ذکر کیا کہ آپ تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے تا کہ یہ وہم نہ ہو کہ آپ صرف رمضان میں ہی سخاوت فرماتے تھے۔

جبرائیل کی ملاقات اور رمضان شریف میں نبی کریم ﷺ بہت زیادہ سخاوت فرماتے تھے:

" وذلک انه اثبت له اولا وصف الاجودیة ثم اراد ان یصفه بازید من ذالک فشبه جود بالریح المرسلة "

پہلے مطلقاً نبی کریم ﷺ کا تمام لوگوں سے زیادہ سخی ہونے کا ذکر کیا کہ آپ ہر زمانہ میں، ہر وقت، ہر شخص سے زیادہ سخی تھے پھر رمضان شریف میں جبرائیل کی ملاقات پر بہت زیادہ سخاوت کو "ریح مرسلہ " سے تشبیہ دی۔

" الریح المرسله " یہ وہ ہوا ہے جس کے متعلق رب تعالیٰ نے فرمایا:

"وهو الذی یرسل الریاح بشرا بین یدی رحمته " (وہ اللہ تعالیٰ جو ہواؤں کو اپنی رحمت کی بشارت بنا کر بھیجتا ہے)۔ یعنی وہ ہوائیں جو بارش سے پہلے آ کر بارش کا پتہ دیتی ہیں ان کو "مرسله " کہا جاتا ہے۔

فائدہ: نبی کریم ﷺ کی سخاوت کو ہوا سے تشبیہ دے کر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ آپ کی سخاوت ہوا سے بھی زیادہ تھی۔ اس لئے کہ ہوا کبھی رک جاتی ہے اور نبی کریم ﷺ کی سخاوت کبھی رکتی نہیں تھی۔ ہوا کبھی نقصان دہ بھی ہوتی ہے لیکن نبی کریم ﷺ کے سخاوت نفع مند ہی ہوتی تھی نقصان دہ ہونے کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے " الریح " کے ساتھ "المرسلہ" کو ذکر کیا کہ آپ کی سخاوت میں فقط اس

طرح نفع ہوتا جیسا کہ بارش کی بشارت دینے والی ہوا میں ہوتا ہے۔

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ بارش کی خبر دینے والی ہوا کے متعلق کبھی انسان کا گمان غلط نکلتا ہے۔ وہ نفع مند سمجھتا ہے اور واقع میں وہی اس کے لئے عذاب ہوتی ہے۔جیسا کہ قوم عاد کے متعلق رب تعالی نے ارشاد فرمایا:

﴿ فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾

''پھر جب انہوں نے عذاب کو دیکھا بادل کی طرح آسمان کے کنارے میں پھیلا ہوا ان کی وادیوں کی طرف آتا ہے بولے یہ بادل ہے کہ ہم پر برسے گا (اللہ نے فرمایا) بلکہ وہ تو ہے جس کی تم جلدی کر رہے تھے۔ایک آندھی ہے جس میں درد ناک عذاب ہے''۔

لیکن نبی کریم ﷺ کے جود میں ہمیشہ نفع ہی نفع ہے اسی لئے آپ کے جود کو تشبیہ دینے میں "الریح المرسله" کہا گیا ہے،کہ حقیقت میں وہ ہوا بارش کی خوشخبری دینے والی ہو نہ کہ صرف گمان کے مطابق ہو۔

اسی طرح یہ بھی ذہن میں رہے کہ "الریح المرسله" وہ ہوا ہے جو لگاتار چند دن برسے اسے سے یہ بھی واضح ہو گیا "وکذا کان عمله صلی الله علیه وسلم فی رمضان دیمة لا ینقطع" کہ نبی کریم ﷺ کا عمل رمضان میں لگاتار جاری رہتا اس میں انقطاع نہیں ہوتا تھا۔اس تشبیہ سے ایک اور بات یہ سمجھ میں آئی۔" ان الجود من النبی ﷺ حقیقة و من الریح مجاز" بیشک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت حقیقی ہے اور ہوا کی مجازی ہے کیونکہ ہوا جب خیر کی ہو تو اس میں جود پایا جاتا ہے۔لیکن جب خیر کی نہ ہو تو اس میں کوئی جود نہیں۔

احادیث مذکورہ سے حاصل ہونے والے فوائد:

۱) رمضان شریف کی فضیلت سمجھ میں آئی کہ اس میں قرآن پاک کا نزول ہوا یعنی لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر نزول رمضان میں ہوا۔

(۲) نبی کریم ﷺ اور جبرائیل کے قرآن پاک کا دور کرنے سے اور ہی زیادہ فضیلت رمضان کو حاصل ہوگئی۔

(۳) جبرائیل نبی کریم ﷺ کے پاس جتنا زیادہ رمضان شریف میں حاضر ہوتے اتنا اور کسی مہینہ میں نہیں آتے تھے۔

(۴) رمضان میں بہت زیادہ خیرات و برکات کا نزول ہوتا ہے۔ جتنا اور مہینوں میں نہیں ہوتا۔

(۵) رمضان شریف میں حفاظ کرام کا قرآن پاک کا دور کرنا سنت رسول اللہ ﷺ اور سنت جبرائیل ہے۔

(۶) " **ان فضل الزمان انما یحصل بزیادة العبادة** " عبادت کی زیادتی سے زمانہ کو بھی فضیلت حاصل ہوجاتی ہے۔ چونکہ رمضان میں عبادت زیادہ ہوتی ہے لہذا رمضان کو بھی فضیلت حاصل ہوجاتی ہے۔

(۷) قرآن پاک کی جتنی زیادہ تلاوت کی جائے اتنی ہی زیادہ خیر و برکت حاصل ہوتی ہے۔

(۸) آخری عمر میں زیادہ سے زیادہ عبادت کرنا مستحب ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اپنی عمر کے آخری سال قرآن پاک کا دور دو مرتبہ کیا جب کہ پہلے ایک مرتبہ کرتے تھے۔ اور آپ نے اپنی عمر کے آخری سال اعتکاف بیس دن کیا جب کہ پہلے آپ کا اعتکاف دس دنوں کا ہوتا۔

(۹) " **ومذاکرة الفاضل بالخیر والعلم وان کان ھو لا یخفی علیه ذلک لزیادة التذکرة والاتعاظ** " جس کو علم اور بھلائی عطاء کر کے فضیلت عطاء کی گئی ہو اس کا ذکر خیر کرتے رہنا چاہئے۔ بیشک اس کے کمالات واضح ہوں کسی سے مخفی نہ ہوں اس لئے کہ نیک لوگوں کے تذکرہ سے نصیحت حاصل ہوتی ہے۔ اور دوسروں کو بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کا موقع مل جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے اوصاف کا تذکرہ فرمایا۔

(۱۰) " **وفیه ان لیل رمضان افضل من نھارہ** " اور یہ بھی واضح ہوا کہ رمضان کی رات دن سے افضل ہے کیونکہ جبرائیل نبی کریم ﷺ کے پاس رات کو حاضر ہوتے اور قرآن پاک کا دور کرتے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک کی تلاوت میں مقصد عظیم قرآن پاک سمجھنا اور تدبر کرنا ہے وہ

رات میں زیادہ حاصل ہوسکتا ہے کیونکہ دن میں انسان کو اور مشاغل بھی حاصل ہوتے ہیں اس لئے کامل توجہ اس طرف نہیں ہوسکتی۔ (ماخوذ از فتح الباری ج ۸ ص ۲۵۹ تا ص ۲۶۲)

دوسری مرتبہ قرآن پاک کا جمع کرنا:

" ان زید ابن ثابت رضی الله عنه قال ارسل الی ابوبکر الصدیق مقتل اهل الیمامة فاذا عمر بن الخطاب عنده ،قال ابوبکر رضی الله عنه ان عمر اتانی فقال ان القتل قد استحر یوم الیمامة بقرا ء القرآن وانی اخشی ان استحر القتل بالقراء بالمواطن فیذهب کثیر من القرآن وانی اری ان تامر بجمع القرآن ، قلت لعمر کیف نفعل شیأ لم یفعله رسول الله صلی الله علیه وسلم قال عمر هذا والله خیر فلم یزل عمر یراجعنی حتی شرح الله صدری لذلک ورأیت فی ذلک الذی رأی عمر قال زید قال ابوبکر انک رجل شاب عاقل لا نتهمک وقد کنت تکتب الوحی رسول الله ﷺ فتتبع القرآن فاجمعه فو الله لو کلفونی نقل جبل من الجبال ماکان اثقل علی مما امرنی به من جمع القرآن ،قلت کیف تفعلون شیأ لم یفعله رسول الله ﷺ قال هو والله خیر لم یزال ابوبکر یراجعنی حتی شرح الله صدری الذی شرح له صدر ابی بکر وعمر رضی الله عنه فتتبعت القرآن اجمعه من العسب واللخاف وصدور الرجال حتی وجدت آخر سورة التوبة مع ابی خزیمة الانصاری لم اجدها مع احد غیر (لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم) حتی خاتمة براء ة فکانت الصحف عند ابی بکر حتی توفاه الله ثم عنده عمر حیاته ثم عند حفصة بنت عمر رضی الله عنه "

(بخاری باب جمع القرآن)

" حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اہل یمامہ کے شہید ہونے کے بعد میری طرف پیغام بھیجا۔ (میں حاضر ہوا) تو آپ کے پاس حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا بیشک عمر میرے پاس آئے ہیں انہوں نے کہا ہے کہ بیشک یمامہ کے دن بہت زیادہ حفاظ قرآن شہید ہو گئے مجھے یہ ڈر ہے کہ ایسانہ ہو کہ لڑائیوں میں اسی

طرح حفاظ قرآن کی کثرت سے شہادت پر کہیں قرآن پاک کا کثیر حصہ ضائع ہی نہ ہوجائے۔ بیشک میری رائے یہ ہے کہ آپ قرآن پاک کو ایک جگہ جمع کرنے کا حکم نافذ فرمائیں۔ (حضرت ابوبکر کہتے ہین) میں نے عمر کو کہا ہم وہ کام کیسے کریں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا لیکن عمر میری طرف ہمیشہ رجوع کرتے رہے (یعنی قران پاک کو جمع کرنے کا مطالبہ کرتے رہے) یہاں تک اللہ تعالیٰ نے میرے سینہ کو بھی اس کام کے لئے کھول دیا۔ میرے رائے بھی عمر کی رائے کے مطابق ہوگئی۔ حضرت زید کہتے ہیں حضرت ابوبکر نے کہا تم ایک جوان اور عقل مند شخص ہو (اور تمہاری سستی اور عدم توجہ کی وجہ سے آیات کے چھوٹ جانے پر) ہمیں تم پر کوئی بدگمانی نہیں۔ اس لئے کہ تم رسول اللہ ﷺ کے کاتب وحی ہو اس لئے تم قرآن پاک میں تتبع (غور و فکر) کرو اور اسے جمع کردو۔ حضرت زید کہتے ہیں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اگر مجھے یہ حضرات کسی پہاڑ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی تکلیف دیتے تو میں اسے بھاری نہ سمجھتا۔ جتنا کہ قرآن پاک کے جمع کرنے کا جو حکم دیا گیا وہ میں نے بھاری سمجھا۔ میں نے کہا تم وہ کام کیسے کرنا چاہتے ہو جو کام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ حضرت ابوبکر نے کہا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی یہ بہتر کلام ہے۔ ابوبکر ہمیشہ میری طرف رجوع کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سینہ کو اس کام کے لئے کھول دیا جس کے لئے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سینہ کو کھولا۔ میں نے قرآن پاک کو بڑے تدبر سے مختلف جگہوں سے جمع کرنا شروع کر دیا۔ جو کھجور کے پتوں، کھجور کی چھڑیوں، پتھروں (ہڈیوں لکڑیوں) وغیرہ پر لکھا ہوا تھا سورۃ توبہ کی آخری آیت "لقد جاء کم رسول" مجھے حضرت ابوخزیمہ انصاری سے ملی۔ اس طرح سورۃ توبہ کی تکمیل بھی ہوگئی مکمل قرآن پاک مجتمع شکل میں جب تیار ہوگیا تو وہ نسخہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس تاحیات رہا۔ آپ کے وصال کے بعد وہ نسخہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس زندگی بھر رہا۔ پھر ان کی وفات کے بعد وہ نسخہ ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمر بن خطاب کے پاس محفوظ رہا"۔

مختصر وضاحت حدیث:

مسیلمہ کذاب نے اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری ایام میں دعوی نبوت کر دیا تھا۔ لیکن آپ کی ظاہری حیات میں اسے قتل نہ کیا جا سکا۔ آپ کے وصال کے بعد کئی عرب "العیاذ

باللہ " مرتد ہوکر اس سے مل گئے تھے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورخلافت میں حضرت خالد ابن ولید رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت اس سے شدید لڑائی ہوئی آخر کار وہ قتل ہو کر جہنم میں پہنچ گیا۔اس لڑائی میں صحابہ کرام بھی کثیر تعداد میں شہید ہو گئے۔

" والمراد باھل الیمامة ھنا من قتل بھا من الصحابة فی الوقعة مع مسلیمة الکذاب "

" حدیث شریف میں جو لفظ اہل یمامہ کا استعمال ہے اس سے مراد وہ صحابہ کرام ہیں جو مسیلمہ کذاب کے ساتھ لڑائی میں شہید ہوئے "۔

" قد استحر " سے مراد بہت زیادہ حرارت ، اصل میں حرارت کا استعمال ناپسندیدہ چیز کے لئے کیا جاتا تھا اور برودت کا لفظ پسندیدہ چیز کے لئے۔

جس طرح کہا جاتا " اسخن اللہ عینہ واقر عینہ " جس کے لئے بددعاء کرنی مقصود ہوتی اس کے لئے کہاجاتا "اسخن اللہ عینہ" اللہ اس کی آنکھ کو گرم کرے۔اور جس کے لئے دعاء کرنی مقصود ہوتی تھی اس کے لئے کہاجاتا تھا " اقر اللہ عینہ" اللہ اس کی آنکھ کو ٹھنڈا کرے۔لیکن کبھی "استحر " صرف شدت اور کثرت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے حدیث شریف میں اسی معنی میں استعمال ہے۔

"عسب" عین پر پیش ہے عسیب کی جمع ہے۔"وھو جرید النخل " کھجور کی شاخ (اور پتے) مراد ہے۔

"اللخاف" لام کے نیچے زیر ہے۔"ھی الحجارة الرقاق " اس سے مراد پتلے پتلے پتھر ہیں۔

حدیث سے حاصل ہونے والے فوائد:

" وقد کان القرآن کلہ کتب فی عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم لکن غیر مجموع فی موضع واحد ولا مرتب السور "

" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی مکمل قران پاک لکھا جاچکا تھا لیکن ایک

جگہ پر یعنی کتابی شکل میں جمع نہیں تھا۔اور نہ ہی سورتوں کو ترتیب وار لکھا گیا تھا"۔

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جیسے جیسے قرآن پاک نازل ہوتا رہا ایسے ایسے لکھا جاتا رہا۔البتہ پڑھنے اور یاد کرنے کی ترتیب آپ بیان فرماتے رہے جس ترتیب سے ہمارے پاس ہے اسی ترتیب سے صحابہ کرام نے یاد کیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تمام قرآن پاک کو ایک جگہ جمع کر کے لکھا گیا۔سورتوں کو ترتیب وار لکھا گیا:

"وکان القرآن مکتو با في الصحف لکن کانت متفرقة فجمعها ابو بکر في مکان واحد"

قرآن پاک مختلف اشیاء میں لکھا ہوا تھا لیکن متفرق تھا اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک جگہ جمع کیا۔

ابتدائی طور پر حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ نے قرآن پاک کے جمع کرنے کو ناپسند سمجھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام نہیں کیا۔لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مستقبل کے فوائد پر مطلع فرمایا تو ان دونوں نے اپنے قول سے رجوع کر لیا:

" ودل ذلک علی ان فعل الرسول اذا تجرد عن القرائن وکذا ترکه لایدل علی وجوب ولاتحریم"

یہاں سے یہ واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ نے کوئی کام کیا یا چھوڑا اس کے وجوب اور تحریم پر جب قرائن موجود نہ ہوں تو اسے واجب یا حرام نہیں کہا جا سکتا۔

" وقد فهم عمر ان ترک النبی ﷺ جمعه لا دلالة فیه علی المنع "

" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سمجھا کہ نبی کریم ﷺ کا قرآن پاک کے جمع کرنے کو چھوڑنے سے ممانعت پر کوئی دلیل نہیں پائی گئی"۔

کاش کہ جھوٹے محبان صحابہ کو یہ بات سمجھ آ جائے ادھر دعویٰ کہ ہم حضرت عمر کے محب ہیں ادھر حضرت عمر کے دلائل سے انکار بات بات پر، یہ کام نبی کریم ﷺ نے نہیں کیا لہذا حرام ہے۔یہ جہالت نہیں تو اور کیا ہے یہ مخالفت صحابہ نہیں تو اور کیا ہے کیا میں ان لوگوں کی بات کو مانوں۔یا جلیل القدر صحابہ کرام حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہم کے دلائل کو مانوں۔یقیناً دلائل صحابہ ہی سے مجھے پیار ہو سکتا ہے۔"اللھم انا نعوذ بک من الجاھلین "

اعتراض: حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ جب خود حافظ تھے تو آپ کے غور وفکر اور دوسروں سے پوچھنے اور سورۃ توبہ کی آخری آیت ابوخزیمہ انصاری سے حاصل کرنے کا کیا مطلب ہے؟

جواب: "**وکان یفعل ذلک مبالغة فی الاحتیاط**" آپ بہت ہی زیادہ احتیاط سے کام لے رہے تھے کہ کوئی آیت کوئی حرف چھوٹنے نہ پائے، ترتیب میں فرق نہ آئے اور تمام صحابہ کرام کی تائید حاصل رہے۔

(ماخوذ از فتح الباری ج ۸ از ص ۶۲۷ تا ۶۳۱)

فائدہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حکم سے جب قرآن پاک جمع ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس مجموعہ کا کوئی نام رکھو مختلف نام تجویز کئے گئے بعض آپ نے رد فرمائے لیکن حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا۔" **رأیت بالحبشة کتابا یدعونه المصحف فسموه به**" میں نے حبشہ میں ایک کتاب دیکھی جسے وہ مصحف کہتے تھے ان کے اس قول کے مطابق قرآن پاک کے نسخے کا نام بھی مصحف رکھ لیا گیا:

" **وکان ابوبکر اول من جمع کتاب الله وسماه المصحف** "

"حضرت ابوبکر پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو جمع کیا اور اس کا نام مصحف رکھا"۔ (الاتقان ج ۱ ص ۵۱)

تیسری مرتبہ قرآن پاک کا جمع کرنا:

" عن انس بن مالک ان حذیفة بن الیمان قدم علی عثمان وکان یغازی اهل الشام فی فتح ارمینیة واذر بیجان مع اهل العراق فافزع حذیفة اختلافهم فی القراء ة فقال حذیفة لعثمان یاامیر المؤمنین ادرک هذه الامة قبل ان یختلف فی الکتاب اختلاف الیهود والنصاری فارسل عثمان الی حفصة ان ارسلی الینا بالصحف ننسخها فی المصاحف ثم نردها الیک فارسلت بها حفصة الی عثمان فامر زید بن ثابت وعبد الله بن الزبیر وسعید بن العاص وعبد الرحمن بن الحارث بن هشام فنسخوها فی المصاحف وقال عثمان للرهط القرشیین الثلاثة اذا اختلفتم انتم وزید بن ثابت فی شیء من القرآن فاکتبوه بلسان قریش

فانما نزل بلسانهم ففعلوا حتی اذا نسخوا الصحف فی المصاحف رد عثمان الصحف الی حفصة فارسل الی کل افق بمصحف مما نسخوا وامر بما سواہ من القرآن فی کل صحیفة او مصحف ان یحرق ''

(بخاری باب جمع القرآن)

'' حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ حذیفہ ابن یمان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے جب کہ اہل شام اہل عراق سے مل کر ارمینیہ اور آذربیجان کو فتح کرنے کے لئے جنگ کر رہے تھے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا اے امیر المؤمنین اس امت کو اللہ کی کتاب (قرآن پاک) میں اختلاف سے بچا لیں ایسا نہ ہو کہ ان میں اختلاف یہود ونصاریٰ کے اختلاف کی طرح ہو جائے ۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی طرف پیغام بھیجا کہ آپ ہماری طرف قرآن پاک کا نسخہ بھیج دیں (یعنی وہ نسخہ جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لکھوایا تھا اور وہ آپ کے پاس موجود ہے) ہم اور نسخے لکھوا کر تمہیں وہ نسخہ واپس کر دیں گے۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے وہ نسخہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف بھیج دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے زید ابن ثابت، عبد اللہ ابن زبیر، سعید ابن عاص، عبد الرحمن ابن حارث ابن ھشام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ اس نسخہ کو دیکھ کر چند نسخے تیار کر لو انہوں نے مختلف نسخے تیار کرنے کا کام شروع کر دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تینوں قریشی حضرات کو کہا کہ اگر تمہارا قرآن پاک کے کسی مقام پر زید ابن ثابت سے اختلاف ہو جائے تو قریش کی زبان (لغت) کے مطابق لکھنا۔ کیونکہ قرآن قریش کی لغت کے مطابق نازل ہوا ہے۔ تو ان حضرات نے اسی نصیحت کے مطابق عمل کیا۔ جب مختلف نسخے تیار ہو گئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا نسخہ ان کے حوالے کر دیا۔ مختلف نسخے آپ نے مختلف علاقوں میں بھیج دیئے۔ باقی تمام نسخوں کو جلا دینے کا حکم دیا''۔

مقصد بیان: ابتدائی طور پر قرآن کی قراءت کرنے کی مختلف علاقوں کی مختلف عربی زبانوں میں اجازت تھی ۔یعنی جس طرح اپنی پنجابی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک ہی مقصد کو کئی الفاظ سے بیان کیا جاتا ہے اگر چہ ہوتی وہ پنجابی ہی ہے لیکن ہر علاقہ کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ اسی طرح شروع میں

قران پاک کے قریش کی لغت میں اترنے کے باوجود عربی زبان کے دوسرے الفاظ میں ادا کرنے کی اجازت تھی لیکن جب لوگوں نے اختلاف کرنا شروع کردیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام زبانوں کی ادائیگی ختم کردی صرف قریش کی زبان کو جاری رکھا۔ کیونکہ قرآن پاک نازل ہی قریش کی زبان میں ہوا۔

" فلما انقض نزوله بوفاته صلى الله عليه وسلم الهم الله الخلفاء الراشدين ذلک وفاء لوعد الصادق بضمان حفظه على هذه الامة المحمدية زادها الله شرفا "

(فتح الباری ج ۸ ص ۶۲۹)

اللہ تعالیٰ نے چونکہ وعدہ فرمایا کہ قرآن پاک کی حفاظت میرے اپنے ذمہ ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَه' لَحٰفِظُوْنَ ﴾

'' بیشک ہم نے ذکر (قرآن) کو نازل کیا اور بیشک ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔''

اسی وعدہ کے مطابق جب نبی کریم ﷺ کا وصال ہوگیا قرآن پاک کا نازل ہونا ختم ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے خلفاء راشدین میں سے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے دل میں القاء کیا کہ قران پاک پڑھنے کی ترتیب پر ایک جگہ جمع کر کے اسے کتابی شکل دے دی جائے۔

پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دل میں القاء کیا کہ صرف ایک لغتِ قریش کو جاری رکھا جائے۔ اور باقی تمام لغات کو ختم کردیا یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور منشاء کے مطابق ہی ہوا۔ اس سے ایک اور بات سمجھ میں آ گئی کہ سات حروف کا اگر یہ معنیٰ لیا جائے کہ سات لغات کی اجازت تھی تو وہ ختم ہوگئی اب سات حروف کا معنیٰ سات صفات ہی صحیح رہے گا جو ''دوسرا قول'' کے عنوان سے پہلے بیان ہو چکا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا جبرائیل سے آخری دور بھی صرف لغت قریش کے مطابق ہی تھا۔ مسند احمد، ابوداؤ، طبری میں عبیدہ ابن عمر وسلمانی سے روایت بیان کی گئی ہے:

" ان الذى جمع عليه عثمان الناس يوافق العرضة الاخيرة "

'' بیشک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جس لغت پر لوگوں کو جمع کیا یہ نبی کریم ﷺ کے آخری دور کے مطابق ہے۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۶۲۱)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نسخوں کی تعداد:

اس میں اگر چہ اختلاف تو ہے کہ جو نسخے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تیار کروا کر مختلف علاقوں میں بھیجے وہ کتنے تھے بعض حضرات نے کہا وہ نسخے کل چار تھے جو باہر بھیجے گئے اور بعض نے کہا کل پانچ نسخے لکھوائے گئے اور بعض نے کہا کل سات نسخے لکھوائے گئے ایک مکہ میں بھیجا گیا۔ دوسرا شام میں ،تیسرا یمن میں ،چوتھا بحرین میں ،پانچواں بصرہ میں اور چھٹا کوفہ میں اور ساتواں مدینہ میں رکھا گیا۔لیکن راقم کے نزدیک تمام اقوال کا مطلب ایک ہے کوئی اختلاف نہیں اس لئے کہ کل پانچ نسخے لکھوائے گئے ان میں سے ایک مدینہ طیبہ میں رکھ لیا گیا اور چار باہر علاقوں میں بھیج دیئے گئے۔

چونکہ چار کی تعداد والوں نے یہ کہا "**ارسل عثمان اربعة مصاحف**" حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چار نسخے باہر بھیجے انہوں نے پانچویں نسخے کا انکار نہیں کیا جو مدینہ طیبہ میں تھا کیونکہ وہ باہر بھیجا نہیں گیا بلکہ "**حبس بالمدينة واحدا**" ایک نسخہ مدینہ طیبہ میں روک لیا گیا وہ کہیں نہیں بھیجا گیا۔

سات والوں کا قول بھی درست ہے کیونکہ اسناد صحیح سے حضرت ابراہیم نخعی سے ایک روایت آتی ہے آپ فرماتے ہیں:

> " **قال لی رجل من اهل الشام مصحفنا و مصحف اهل البصرة اضبط من مصحف اهل الكوفة** "
>
> " مجھے شام کے لوگوں میں سے ایک شخص نے بتایا کہ ہمارا مصحف (قرآن کا نسخہ) اور بصرہ والوں کا نسخہ کوفہ والے نسخہ سے ہی ضبط کیا گیا "۔

راقم کے نزدیک "اضبط" کا یہی معنی کیا جائے تو بہت سے الجھنوں سے نجات مل جاتی ہے اور تین قول ایک ہی نظر آئیں گے صرف انداز بیان مختلف ہوگا۔کسی نے ابتدائی طور پر لکھوانے کی تعداد کو دیکھ کر پانچ کہا اور کسی نے باہر علاقوں میں بھیجنے کی تعداد کو دیکھ کر چار بیان کیا۔اور کسی نے پہلے پانچ جو لکھوائے گئے ان کو دیکھ کر اور کوفہ کے نسخہ سے دو اور جو لکھوائے گئے ان تمام کی مجموعی تعداد کو دیکھتے

ہوئے سات بیان کر دیا۔ واللہ اعلم بالصواب

" وامر بما سواہ من القرآن فی کل صحیفة او مصحف ان یحرق "

آپ نے جو نسخے لغت قریش کے مطابق اس نسخہ سے لکھوائے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لکھوایا تھا اور انکے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس وہ نسخہ محفوظ رہا پھر وہی نسخہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی حفاظت میں تھا وہی نسخہ ان سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حاصل کیا۔

یہ نسخے جب تیار ہو گئے تو مختلف علاقوں میں بھیج دیئے گئے باقی لغات میں جو نسخے موجود تھے ان کو جلا دینے کا حکم دیا اس مسئلہ کو علامہ حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی (المتوفی ۸۵۲ھ) نے تفصیل سے ذکر کیا آئے دن اختلافات حرام کے ارتکاب اور کفر کے فتاوی کے پیش نظر اس تفصیل کو ذکر کیا جا رہا ہے۔

" فی روایة الاکثر ان یخرق بالخاء المعجمة " اکثر حضرات نے نقطے والی خاء سے " ان یخرق " بیان کیا ہے جس کا معنی یہ ہے کہ آپ نے باقی تمام نسخوں کو پھاڑ دینے کا حکم دیا۔

" وللمروزی بالمهملة " لیکن مروزی کی روایت میں حاء بغیر نقطہ کا ہی ذکر ہے۔ جس کا معنی یہ ہے کہ آپ نے باقی تمام نسخوں کو جلا دینے کا حکم دیا۔

" ورواہ الاصیلی بالوجهین والمعجمة اثبت " اصیلی کی روایت میں دونوں طرح آیا ہوا ہے نقطہ کے ساتھ خاء اور بغیر نقطہ کے حاء البتہ نقطہ والی روایت کو زیادہ معتبر سمجھا گیا۔

اب مطلب یہ ہوگا کہ آپ نے باقی نسخوں کو ختم کر دینے کا حکم دیا خواہ وہ پھاڑ کر ختم کر دیئے جائیں یا جلا کر ختم کئے جائیں تاہم جلانے والی روایت کا ہی زیادہ اعتبار کیا گیا ہے۔

"وفی روایة الاسماعیلی ان تمحی او تحرق " اسماعیلی کی روایت میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ آپ نے باقی نسخوں کے الفاظ مٹا دینے یا جلا دینے کا حکم دیا۔

" وقد فی روایة شعیب عند ابن ابی داؤد والطبرانی وغیرهما ، وامرهم ان یحرقوا کل مصحف یخالف المصحف الذی ارسل به "

شعیب کی روایت ابو داؤد نے اور طبرانی نے اور دیگر حضرات نے بیان کی اس میں یہ ذکر گیا ہے کہ آپ نے جو مصحف بھی کسی علاقہ میں بھیجا۔ اس مصحف کے بغیر باقی تمام نسخوں کو جلا دینے کا حکم دیا یعنی جو لغت قریش کے مخالف ہو اسے جلا دیا جائے۔

" قال فذالک زمان حرقت المصاحف بالعراق بالنار "

'' اس زمانہ میں لغت قریش کے مخالف قران پاک کے تمام نسخے عراق میں آگ سے جلا دیئے گئے تھے''۔

" وفی روایة سوید بن غفلة علی قال لا تقولوا لعثمان فی احراق المصاحف الاخیرا "

'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قرآن پاک جلا دینے کے حکم کو سوائے اچھے الفاظ کے نہ ذکر کرو''۔

مطلب یہ تھا کہ آپ کی نیت میں خلوص تھا۔ مقصد قرآن پاک میں اختلاف کو ختم کرنا تھا۔ جب تک دوسرے تمام نسخے ختم نہ کئے جاتے اس وقت تک یہ اختلاف ختم نہیں ہوسکتا تھا۔

راقم کا خیال ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آنے والے حالات سے مطلع ہو کر فرمایا کہ میری محبت کے جھوٹے دعویدار کہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخی نہ کریں۔ اور یہ نہ کہیں کہ انہوں نے قرآن پاک کے نسخوں کو جلا دیا تھا لوگ ان کی بات کو نہ مانیں بلکہ میری طرف توجہ کریں۔

" وفی روایة بکیر بن الاشج فامر بجمع المصاحف فاحر قها ثم بث فی الاجناد التی کتب "

- بکیر ابن اشج کی روایت میں ہے کہ آپ نے تمام نسخے جمع کرنے کا حکم دیا پھر ان کو جلا دیا پھر وہ نسخے جو آپ نے لکھوائے تھے وہی باہر اطراف میں پھیلا دیئے۔

" ومن طریق مصعب بن سعد قال ادرکت الناس متوافرین حین حرق عثمان المصاحف فاعجبهم ذلک اوقال لم ینکر ذلک منهم احد "

مصعب ابن سعد سے مروی ہے کہ میں نے بہت سے لوگوں کو تعجب کرتے ہوئے پایا جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام نسخوں کو جلا دیا یا راوی نے یہ بیان کیا کہ کسی نے آپ کے اس فعل کا انکار نہیں کیا۔

دوسرے قول سے یہ پتہ چلا کہ تعجب بوجہ انکارنہیں تھا بلکہ آپ کے فعل کو قابل تحسین سمجھتے ہوئے تعجب کیا گیا تھا۔

" وفی روایة ابی قلابة فلما فرغ عثمان عن المصحف کتب الی اهل الامصار ،انی قد صنعت کذا و کذا ومحوت ماعندی فامحوا ما عندکم والمحوا عم من ان یکون بالغسل او التحریق "

ابو قلابہ کی روایت میں ہے جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قرآن پاک کے لکھوانے سے فارغ ہوئے تو آپ نے مختلف شہروں میں خطوط لکھے کہ میں نے لغت قریش کے مطابق قرآن پاک کے چند نسخے لکھوا لئے ہیں اور میرے پاس جو نسخہ قریش کی لغت کے خلاف تھا میں نے اسے مٹادیا۔تمہارے پاس بھی جو نسخے ہیں ان کومٹادو محو کرنا(مٹا دینا) عام ہے چاہے تو ان کو دھو دیا جائے اور چاہے تو ان کوجلا دیا جائے۔

"واکثر الروایات صریح فی التحریق فهو الذی وقع "اکثر روایات میں واضح طور پر جلا دینے کا ہی ذکر ہے۔"ویحتمل وقوع کل منهما بحسب مارأی من کان بیده شئی من ذلک " یہ بھی احتمال ہے کہ آپ نے حکم فرمایا ہو کہ دوسرے نسخے ختم کردیئے جائیں تو آپ کے اس حکم پر کسی نے جلا دیا ہو اور کسی نے پانی سے دھو دیا ہو۔

"وقد جزم عیاض بانهم فسطوها بالماء ثم احرقوها مبالغة فی اذهابها "
قاضی عیاض رحمہ اللہ نے صرف اسی قول پر کامل وثوق کیا ہے کہ پہلے پانی سے تمام نسخے دھوئے گئے پھر ان کوجلا دیا گیا مقصد یہ تھا کہ وہ کامل طور پر ختم ہوجائیں:

" قال ابن بطال فی هذا الحدیث جواز تحریق الکتب التی فیها اسم الله بالنار وان ذلک اکرام لها وصون عن وطنها بالاقدام "
ابن بطال نے کہا ہے کہ اس حدیث سے یہ سمجھ آیا کہ وہ کتابیں جن میں اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی لکھا ہوا ہو ان کو آگ میں جلانا جائز ہے اس لئے کہ یہ عزت ہے مبارک ناموں کی اور ان کو قدموں سے روندے جانے کو محفوظ کرنا تھا۔

" وقد اخرج عبدالرزاق من طریق طاؤس انه کان یحرق الرسائل التی فیها البسملة اذا اجتمعت و کذا فعل عروة و کرهه ابراهیم "

مصنف عبد الرزاق میں ہے کہ حضرت طاؤس کے پاس جب رسالے جمع ہوجاتے جن میں "بسم الله" لکھی ہوتی تو آپ ان کو جلا دیتے تھے اور حضرت عروہ بھی اسی طرح کرتے تھے البتہ حضرت ابراہیم نخعی ناپسند سمجھتے تھے۔

"وقال ابن عطية الرواية بالحاء المهملة اصح" ابن عطیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں بغیر نقطہ کے حاوالی روایت زیادہ صحیح ہے یعنی یہی صحیح ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام نسخے جلا دینے کا حکم دیا۔

" وهذا الحكم هو الذى وقع فى ذلک الوقت واما الآن فالغسل اولى لما دعت الحاجة الى ازالته "

یہ وہ حکم ہے جو اس وقت واقع ہوا لیکن اب اگر قرآن پاک کے الفاظ کو زائل کرنا مقصود ہو تو دھو دینا زیادہ بہتر ہے۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۲۳۷تا۲۳۸)

" اذا انخرق القرآن العزيز وبليت الاوراق يدفن فى اللحد او يحرق ويلقى رماده فى البحر كما ثبت ان ذوالنورين احرق الصحائف "

(حاشیہ ترمذی ۳ باب ماجاء قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم اللحد لنا والشق لغیرنا)

جب قرآن پاک پھٹ جائے اور اوراق بوسیدہ ہوجائیں تو ان کو لحد (قبر کی سامی) میں دفن کر دیا جائے۔ یا ان کو جلا کر ان کی راکھ دریا میں بہادی جائے جیسا کہ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے قرآن پاک کے نسخوں کو جلا دینے کے حکم سے ثابت ہے۔

" المصحف اذا صار خلقا لا يقرأ منه ويخاف ان يضيع يجعل فى خرقة طاهرة ويدفن ودفنه اولى من وضعه موضعا يخاف ان يقع عليه النجاسة او نحو ذلک ويلحد له لانه لوشق ودفن يحتاج الى اهالة التراب عليه وفى ذلک نوع تحقير الا اذا جعل فوقه سقف بحيث لايصل التراب اليه فهو حسن ايضا كذا فى الغرائب المصحف اذاصار خلقاو تعذرت القراء ة منه لا يحرق بالنار اشاراليه شيبانى الى هذا فى السير الكبير وبه نأخذ كذا فى الذخيرة "

" قرآن پاک جب پرانا ہوجائے اس سے پڑھنے کا مقصد حاصل نہ ہو اور یہ خوف ہو کہ یہ ضائع ہوجائے گا تو اسے کسی پاک کپڑے میں لپیٹ کر دفن کر دیا جائے ان کو

اسی طرح رکھے رہنے سے دفن کرنا بہتر ہے کیونکہ ان بوسیدہ اوراق پر نجاست کے واقع ہونا کا خطرہ ہے پاؤں کے نیچے روندنے جانے کا خطرہ ہے۔البتہ ان کو دفن کرنے کے لئے بھی قبر کی طرح گڑھا کھودا جائے ایک طرف لحد (بغلی قبر، یا قبر کی سامی کہا جاتا ہے) بنائی جائے تاکہ مٹی براہ راست ان اوراق پر نہ پڑے قبر بھی شق (چیرویں قبر، درمیانی جگہ میں مردہ کے لئے جگہ بنانا) نہ بنائی جائے کیونکہ اس میں مٹی براہ راست بوسید اوراق پر پڑے گی۔اس میں بھی تحقیر ہے ہاں البتہ اگر ان پر چھت بنادی جائے (جس طرح مردہ شخص پر پتھروں وغیرہ کی چھت بناتے ہیں) پھر اس پر مٹی ڈالی جائے تو بہتر ہے۔قرآن پاک جب بوسیدہ ہوجائے۔اور پڑھنا متعذر ہوجائے تو اسے آگ میں نہ جلایا جائے۔امام محمد ابن حسن شیبانی رحمہ اللہ نے سیر کبیر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے ہم بھی اسی پر عمل کرتے ہیں ذخیرہ میں اسی طرح مذکور ہے"۔

(عالمگیری ج ۵ ص ۳۲۳)

راقم کی علماء کرام کو دعوتِ فکر:

علماء کرام کی خدمت میں بصد ادب واحترام عرض ہے کہ وہ اس سے ہٹ کر کہ فلاں نے یہ لکھا ہے لہذا میں نے اس کی مخالفت ضرور کرنی ہے، میرا دل یہ کہتا ہے لہذا میں نے اس کے خلاف کو حرام کہنا ہے، میرے جیسا کوئی علامہ نہیں فلاں کو کیا پتہ ہے، وہ تو جاہل ہے، ان چیزوں سے ہٹ کر سوچیں اور بتائیں کیا راقم کا موقف درست ہے یا غلط پہلے ان چند چیزوں کو مدنظر رکھیں پھر راقم اپنا موقف بیان کرے گا اسی کی طرف دعوتِ فکر ہے۔

(۱) علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی وفات ۸۵۲ھ میں ہے۔اس وقت اختلاف ضد کی وجہ سے نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ صرف تحقیقی اختلاف ہوتا تھا۔

(۲) فتح الباری سے تفصیلی بحث کی کہ سلف صالحین میں سے بعض نے بوسیدہ اوراق کو جلانا پسند کیا اور بعض نے ناپسند۔

(۳) جواز اور عدم اولی کا جمع ہونا کوئی محال نہیں یہ ہوسکتا ہے کہ ایک کام جائز ہو لیکن بہتر نہ ہو۔

(۴) یہ کوئی ضروری نہیں کہ جو کام اولی (بہتر) نہیں وہ جائز بھی نہیں۔ ناجائز ہونا اور ہے عدم اولی (بہتر نہ ہونا) اور ہے۔

(۵) نیت کے فرق سے احکام بدل جاتے ہیں مسجد کو کوئی شہید کر دے کہ یہاں سڑک ہونی چاہئے مسجد کیوں ہے یہاں نمازیوں کو دیکھ کر میرا دل جلتا ہے کہ یہ نماز کیوں ادا کرتے ہیں۔ نمازیوں کی کثرت سے میرے آقا امریکی صدر ناراض ہوتے ہیں۔ لہذا مسجد کو گرادو ایسا بیہودہ شخص مسجد کی توہین کر رہا ہے۔ اور اگر مسجد کو اس لئے شہید کر دیا جائے کہ دوبارہ اسی جگہ پر خوبصورت بنائیں گے، کشادہ بنائیں گے، یہی مسجد کی تعظیم ہے۔

" وضع المصحف تحت رأسه في السفر للحفظ لابأس به وبغير الحفظ يكره كذا في خزانة الفتاوى "

سفر میں چوروں کے خوف یا گر جانے کے خوف کے پیش نظر قرآن پاک کے نسخہ کو حفاظت کے لئے سر کے نیچے رکھنا جائز ہے اور حفاظت کی نیت نہ ہو صرف تکیہ بنانا مقصود ہو تو ناجائز ہوگا۔

(عالمگیر ج۵ ص ۳۲۲)

" رجل وضع رجله على المصحف ان كان على وجه الاستخفاف يكفر والافلا كذا في الغرائب "

اگر کوئی شخص قرآن پاک کو گھٹیا سمجھ کر (معاذ اللہ) اس پر پاؤں رکھے تو وہ کافر ہو جائے گا۔ اگر قران پاک کو گھٹیا تو نہیں سمجھا لیکن پاؤں پھر بھی اس پر رکھ دیا تو وہ کافر نہیں ہوا بلکہ صرف گنہگار ہوگا۔

(۶) پہلے زمانہ میں قرآن پاک ہاتھ سے لکھا جاتا تھا اسے پانی سے مٹانا آسان تھا۔ اور قرآن پاک کے نسخے بہت کم مقدار میں ملتے تھے اب پریس کی وجہ سے ہر مسجد میں سینکڑوں کی تعداد میں قرآن پاک نظر آتے ہیں۔

(۷) شہری آبادی میں دفن کے لئے زمین کا ملنا بہت مشکل ہے۔ ہر شہر میں کوئی بڑا دریا نہیں کہ قرآن پاک کے بوسیدہ اوراق کو دریا میں ڈال دیا جائے۔

اس تمہید کے بعد راقم کا موقف یہ ہے کہ اگر قرآن پاک کے بوسیدہ اوراق کے دفن کے لئے

زمین مل جائے تو سب سے بہتر دفن کرنا ہی ہے کوئی بڑا دریا ہو اور اوراق کو بوری وغیرہ میں ڈال کر ان میں کوئی پتھر بھی ڈال دیا جائے تا کہ وہ بوری سطح زمین پر رہے۔اس طرح دریا میں ڈال دینا بھی بہتر نظر آتا ہے۔

اگر کوئی اور صورت نہ ہو تو اس نیت سے کہ قرآن پاک کے اوراق کی بے حرمتی ہو رہی ہے پاؤں کے نیچے آ رہے ہیں۔بکھرے پڑے ہیں پیٹھ آ رہی ہے جن بوریوں اور تھیلیوں میں ہیں ان کے پیچھے لوگ اپنے جوتے بھی رکھ لیتے ہیں۔اس طرح کی بے حرمتیوں سے بچانے کے لئے اگر کوئی شخص قرآن پاک کے اوراق کو جلا کر راکھ کر دفن کر دے یا کسی دریا میں بہا دے تو جائز ہے۔راقم خود جلانے پر عمل کرنے سے ڈرتا رہتا ہے دل نہیں مانتا جہلا کے ہنگاموں کا ڈر، جاہل اور مولویوں کے خلاف ہونے اور پولیس کا ڈر بھی ذہن پر سوار رہتا ہے۔لیکن عجیب مشکل یہ ہے کہ جس مسجد میں امام وخطیب ہوں وہ بہت چھوٹی سی ہے۔اوراق سے بھری پڑی ہے کبھی کبھی کوئی دوست بوسیدہ اوراق کو لے جاتے رہے۔راول ڈیم میں بھی دو تین مرتبہ اوراق کو ڈالا۔لیکن اب اس پر پابندی لگا دی گئی ایک مرتبہ راول ڈیم کے بھر جانے اور کھولے جانے سے ہمارے ڈالے ہوئے اوراق دریائے سواں میں پہنچ گئے جہاں نالہ لئی سواں سے ملتا ہے وہاں کنارے پر لگ گئے ان اوراق میں مسجد میں پڑھنے والے بچوں کا ایک رجسٹر حاضری تھا جس پر'' مسجد غوثیہ F 6.1 '' اسلام آباد تحریر تھا۔کسی منچلے نے ہمارے خلاف مقدمہ دائر کرا دیا۔اخبار میں دیکھا دعاء کی اے اللہ تعالیٰ شر سے بچا ہم نے تو اوراق راول ڈیم میں ڈالے تھے۔رب تعالیٰ نے دعاء کو قبول کیا شائد کوئی تھانیدار نیک تھا اس نے ہمیں مجرم نہ سمجھتے ہوئے بغیر بلانے کے معاف کر دیا۔

راقم نے اپنا موقف بیان کر دیا ہے۔ہوسکتا ہے کوئی اتفاق کرے گا کوئی مخالفت لیکن خدا را مخالفت برائے مخالفت سے ہٹ کر کچھ سوچیں آئے دن اخبارات میں یہ شائع کرانا فلاں جگہ پر قرآن جلا دیئے گئے لوگوں کو اشتعال دلانا کون سا دینی کام ہے۔ہاں البتہ قرآن پاک کے بوسید اوراق کو ادب واحترام سے کسی گتہ اور کاغذ بنانے والی فیکٹری میں پہنچا دیا جائے ان سے گتہ یا نیا کاغذ بن جائے تو یہ بھی ایک بہتر حل نکل سکتا ہے۔

صحابہ کرام میں حفاظ:

صحابہ کرام میں حفاظ کی تعداد بہت زیادہ تھی علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا:

" قد قتل یوم الیمامۃ سبعون من القراء وقتل فی عهد النبی ﷺ ببیر معونۃ مثل هذا العدد "

یمامہ کی جنگ میں شہید ہونے والے صحابہ کرام میں ستر حفاظ کرام تھے۔اسی تعداد کے مطابق حفاظ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں بئر معونہ پر شہید ہوئے۔

البتہ زیادہ مشہور حفاظ سات تھے۔ حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت زید ابن ثابت، حضرت ابی ابن کعب، حضرت عبداللہ ابن مسعود، حضرت ابو الدرداء اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنھم تھے۔

(الاتقان ج ۲ ص ۶۰ م ۶۱)

اعتراض: مشہور تو یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صرف چار حفاظ تھے اس پر خود نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے عبداللہ ابن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

" سمعت النبی ﷺ یقول خذوا القرآن من اربعۃ من عبد اللہ بن مسعود وسالم ومعاذ وابی بن کعب "

(بخاری باب القراء من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا قرآن چار حضرات سے حاصل کرو وہ یہ ہیں۔عبداللہ ابن مسعود، سالم، معاذ اور ابی ابن کعب رضی اللہ عنہم۔

جواب: عوام میں جو یہ مشہور ہے کہ صحابہ کرام میں یہی چار حفاظ تھے یا یہ مشہور ہے کہ یہ چار پہلے حفظ کرنیوالے تھے۔یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ان چار کا ذکر اس لئے کیا گیا تھا کہ یہ عام طور پر دوسروں کو محبت سے پڑھاتے تھے اور حفظ میں ماہر بھی تھے۔اور یہ سب نبی کریم ﷺ کے بعد بھی زندہ رہے۔شائد اس طرف بھی اشارہ ہو کہ ان حضرات سے لوگ دیر تک فائدہ حاصل کرسکیں گے۔کیونکہ ان میں سے سالم یمامہ کی جنگ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں شہید ہوئے۔اور معاذ خلافتِ عمر (رضی اللہ عنہما) میں فوت ہوئے۔ابی ابن کعب اور ابن مسعود خلافتِ عثمان (رضی اللہ عنہم) میں فوت ہوئے۔"ولا یلزم من ذالک ان لایکون احد فی ذلک الوقت شارکھم فی

حفظ القرآن" حدیث پاک سے یہ لازم نہیں آ رہا کہ اس وقت ان کے ساتھ کوئی اور حفظِ قرآن میں شریک نہیں تھا۔ یعنی یہ کہنا غلط ہے کہ اس وقت ان چار کے بغیر اور حافظ ہی نہیں تھا۔ "بل كان الذين يحفظون مثل الذين حفظوه وازيد منهم جماعة من الصحابة" بلکہ بہت تعداد میں صحابہ کرام کی ایک جماعت حفاظ کی تھی۔ ان جیسے یا ان سے بھی زیادہ ماہر کئی اور حفاظ موجود تھے۔

(فتح الباری ج ۸ ص ۲۲۲)

اعتراض: تم نے یہ بیان کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی زمانہ میں کثیر صحابہ کرام حفاظ تھے تو ان دو حدیثوں کا کیا مطلب ہے۔

(۱) حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "حتى وجدت آخر سورة التوبة مع ابی خزيمة الانصاری لم اجدها مع احد غيره لقد جاء كم رسول من انفسكم عزيز عليه ما عنتم" (بخاری باب جمع القرآن)

(۲) حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

" فقدت آية من الاحزاب حين نسخنا المصحف قد كنت اسمع رسول الله ﷺ يقرأ بها فالتمسناها فوجدنا ها مع خزيمة بن ثابت الانصاری من المؤمنين رجال صدقوا ما عاهدوا الله عليه فالحقنا ها فی سورتها فی المصحف "

(بخاری باب جمع القرآن)

"میں نے سورۃ احزاب کی ایک آیت کو نہ پایا جب ہم قرآن پاک کو نقل کر رہے تھے (یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں) جو میں رسول اللہ ﷺ سے پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا ہم نے اسے حاصل کرنے کی کوشش کی تو وہ ہمیں خزیمہ ابن ثابت انصاری سے حاصل ہوئی۔ وہ آیت یہ ہے "من المؤمنين رجال صدقوا ماعاهدوا الله عليه" تو ہم نے اسے قرآن پاک کے نسخہ کی سورۃ میں ملا دیا"۔

ان دو حدیثوں سے تو پتہ چلا کہ صحابہ کرام میں زیادہ حافظ نہیں تھے۔ ورنہ یہ آیات اور صحابہ سے بھی مل جاتیں۔ اور ایک عجیب الجھن یہ پیدا ہو رہی ہے۔ کہ پہلا نسخہ جو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا یہ وہی تھا۔ جو حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مطالبہ پر تیار کیا تھا اگر اسی نسخہ میں سورۃ احزاب کی آیت نہیں تھی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تقریباً بارہ

سال تک قرآن پاک میں ایک آیت شامل نہ ہوسکی۔

جواب: اگرچہ کچھ ذکر پہلے ہو چکا ہے۔تاہم تفصیلی طور پر جواب کو دیکھئے اور سمجھئے کہ قرآن پاک کا محافظ تو رب تعالیٰ ہے اس میں کوئی نقص رہنا ممکن ہی نہیں ۔ورنہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں فرق لازم آئے گا۔البتہ اس قسم کے اعتراضات کا سبب علم کی کمی ہوسکتا ہے۔احادیث کو صحیح نہ سمجھنا صرف ظاہری معانی کو دیکھنا اس قسم کے خدشات کا سبب بنتا ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

" انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحافظون" ہم نے ہی ذکر (قران) نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

(۲) " فان القرآن مکتوب فی اللوح المحفوظ علی النحو الذی هو فی مصاحفنا الآن "

بیشک قران پاک لوح محفوظ میں اسی ترتیب سے لکھا ہوا جو ترتیب ہمارے پاس موجود قرآن پاک کے نسخوں کی ہے۔ (خازن ج ۱ ص ۸)

" فان القران مکتوب فی اللوح المحفوظ علی هذا الترتیب انزله الله جملة الی السماء الدنیا" (الاتقان ج ۱ ص ۲۱)

بیشک قرآن پاک لوح محفوظ پر اسی ترتیب سے ہے جس ترتیب پر ایک مرتبہ مکمل قرآن آسمان دنیا پر اترا (وہی ترتیب ہمارے پاس ہے)۔

(۳) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر اور حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہما کو حکم دیا " اقعدا علی باب المسجد فمن جاء کما بشاهدین علی شئی من کتاب الله فاکتباه " تم دونوں مسجد کے دروازے پر بیٹھ جاؤ جب تمہارے پاس کوئی شخص کتاب اللہ سے (لکھی ہوئی آیات) اس طرح لائے جس طرح گواہ بڑے وثوق سے گواہی دیتے ہیں تو تم اسے لکھ لو۔اس حکم کی وجہ کیا تھی؟ اگرچہ اس میں کئی وجوہ بیان کی گئی ہیں لیکن سب سے بڑی وجہ یہ تھی ۔

" و کان عرضهم ان لا یکتب الامن عین ماکتب بین یدی النبی ﷺ لا من مجرد الحفظ " (فتح الباری ج ۸ ص ۶۳۱)

ان کی غرض یہ تھی کہ تمام قرآن پاک لکھا ہوا آنکھوں سے دیکھ کر لکھو صرف اپنے حافظہ پر اعتبار

نہ کرنا کہیں کوئی بھول نہ جائے کیونکہ اصل وجہ اس کی یہ تھی۔

" وقد كان القرآن كله كتب في عهد النبي ﷺ لكن غير مجموع في موضع واحد ولامرتب السور" (فتح الباری ج ۸ ص ۲۲۹)

کہ تمام قرآن پاک نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں لکھا گیا تھا۔لیکن وہ نازل ہونے کی جو ترتیب تھی اسی طرح مختلف اشیاء پر لکھا گیا تھا مجموعی طور پر وہ کسی ترتیب پر نہ تھا۔جب تمام قرآن پاک لکھ ہوا تھا تو اسے جمع کرتے وقت اور ترتیب دیتے وقت آنکھوں سے دیکھنا ضروری تھا یہی عقل اور ایمان کا تقاضا تھا۔

(۴) " قام عمر فقال من كان تلقى من رسول الله صلى الله عليه وسلم شيا من القرآن فيأت به وكانوا يكتبون ذلك في الصحف والالواح والعسب قال وكان لا يقبل من احد شيأ حتى يشهد شاهدان وهذا يدل على ان زيدا كان لا يكتفى بمجرد وجدانه مكتوبا حتى يشهد به من تلقاه سماعا مع كون زيد كان يحفظه وكان يفعل ذلك مبالغة في الاحتياط " (فتح الباری ج۸ ص ۶۳۱

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے (آپ کو جو بھی ملتا اسے) کہتے کہ کسی کے پاس رسول اللہ ﷺ سے حاصل کیا ہوا قرآن کا کوئی حصہ ہے تو وہ لے آئے۔لوگ کاغذ کے صحیفے، تختیاں، کھجور کی (پتوں والی) چھڑیاں لا رہے تھے۔پھر آپ بھی دو گواہوں کی گواہی کے بعد قبول کرتے کہ ہاں واقعی یہ قرآن پاک کا حصہ رسول اللہ ﷺ نے خود لکھوایا تھا یہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ بیشک زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ صرف لکھے ہوئے کو دیکھ کر ہی قبول نہیں کر رہے تھے بلکہ اس پر گواہیاں بھی طلب کر رہے تھے کہ ہاں واقعی تم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا تھا۔یا یہ لکھا ہوا حاصل کیا تھا۔یہ سب کچھ احتیاط کے پیش نظر کیا جا رہا تھا ورنہ حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ بہت عظیم ماہر حافظ تھے۔

خلاصہ جواب: اگرچہ صحابہ کرام میں کثیر تعداد میں حفاظ موجود تھے جمع کرنے والے حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ خود بھی عظیم ماہر حافظ تھے۔لیکن فیصلہ یہ کیا گیا تھا کہ قرآن پاک جمع کرتے وقت حفاظ کے سینوں سے بھی حاصل کیا جائے۔اسی پر بھی گواہی طلب کی جائے کہ ہاں واقعی یہ نبی کریم ﷺ سے سنا گیا۔اسی طرح صرف حفاظ کے حافظے پر اعتبار نہ کیا جائے بلکہ لکھا ہوا بھی

دیکھا جائے کیونکہ تمام قرآن پاک نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں مکمل ہو چکا تھا لیکن مختلف حصے مختلف لوگوں کے پاس تھے ان کو جمع کرنا مقصود تھا۔ اس پر بھی گواہی طلب کی جارہی تھی کہ ہاں یہ وہی تحریر ہے جو نبی کریم ﷺ کے حکم سے معرض وجود میں آئی تھی۔ پھر تمام حفاظ سے اس کی تائید کرائی جارہی تھی۔ اس طرح قرآن پاک کے جمع ہونے میں صحابہ کرام کا اتفاق تھا۔ یہ قران پاک کی ترتیب اجماع امت سے حاصل ہے۔ لوح محفوظ کی تریب کے مطابق ہے رسول اللہ ﷺ نے خود حفاظ کو ترتیب سے یاد کرایا۔ ہم تک تواتر سے پہنچا بلا ریب ہے رب تعالیٰ اس کا خود محافظ ہے نہ رب تعالیٰ کی حفاظت میں کمی آسکتی ہے اور نہ ہی قرآن میں کوئی کمی آئی اور نہ آئے گی۔ تا قیامت قرآن پاک مکمل موجود رہے گا۔ یہ بھی دنیاوی نسخوں کی بات ہے۔ ورنہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کی کوئی انتہا نہیں اس لئے قرآن پاک نہ ختم ہونے والا کلام ہے۔ اس کی انتہا آئی ہی نہیں۔

آیئے اصل مقصد کی طرف:

معترض نے جو پہلی حدیث سے اعتراض کیا ہے کہ سورۃ توبہ کی آخری آیات صرف ابوخزیمہ انصاری سے حاصل ہوئیں کسی اور سے حاصل نہ ہوئیں۔ تو پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام میں زیادہ حفاظ نہیں تھے اور قرآن پاک کا ثبوت تواتر سے نہیں آیئے غور کریں کہ شارحین نے اس حدیث کی وضاحت میں ان اعتراضات کے جواب پہلے ہی کیسے خوب انداز پر پیش کر دیئے ہیں۔

" لم اجد ها مع احد غيره اى مكتوبة لما تقدم من انه كان لا يكتفى بالحفظ دون الكتابة ولا يلزم من عدم وجدانه اياها حينئذ ان لاتكون تواترت عند من لم يتلقها من النبى ﷺ وانما كان زيد يطلب التثبت عمن تلقاها بغير واسطة "

(فتح الباری ج۸ ص ۶۳۲)

حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا کہ مجھے سورۃ توبہ کی آخری آیات سوائے ابوخزیمہ انصاری کے کسی اور سے حاصل نہ ہوئیں اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی اور سے لکھی ہوئی یہ آیات نہ ملیں پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ صرف حافظہ پر اعتبار نہیں کیا جارہا تھا بلکہ لکھی ہوئی آیات کو بھی آنکھوں سے دیکھا جارہا تھا۔ لکھی ہوئی آیت کا صرف ایک صحابی سے حاصل ہونا تواتر کے منافی نہیں اس لئے کہ

اسے کثیر تعداد میں حفاظ کی تائید حاصل تھی۔ حضرت زید ابن ثابت بہت زیادہ احتیاط سے کام لے رہے تھے۔ آپ صرف ان حضرات سے تحریر وصول کر رہے تھے یا صرف ان حفاظ سے آیات سن رہے تھے جنہوں نے خود براہ راست بغیر کسی واسطہ کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھیں۔

دوسری حدیث جو معترض نے پیش کی کہ سورۃ احزاب کی آیت "من المؤمنین رجال" ہم نے خزیمہ ابن ثابت انصاری سے پائی۔ اس کے متعلق ایک احتمال تو یہ ہے۔

" وقع فی روایة ابراهیم بن اسماعیل بن مجمع عن ابن شهاب انفقده ایاها انما کان فی خلافة ابی بکر حتی وجدها مع خزیمه ابن ثابت وجزم ابن کثیر بما وقع فی روایة ابن مجمع "

" ابراہیم ابن اسمٰعیل ابن مجمع نے ابن شہاب سے روایت کی ہے کہ سورۃ احزاب کی آیت کا گم پانا اور پھر خزیمہ ابن ثابت انصاری سے ملنا یہ واقع حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جمع کرتے وقت در پیش آیا۔ ابن کثیر نے بھی اسی ابن مجمع والی روایت پر کامل اعتماد کیا ہے کہ یہی صحیح ہے یہی باوثوق ہے"۔

اگر چہ علامہ ابن حجر عسقلانی اور علامہ بدر الدین ابو محمد بن احمد عینی رحمہما اللہ نے اس پر اعتماد کیا ہے کہ سورۃ احزاب کی آیت کے نہ پانے کا واقعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں جمع کرنے کے وقت در پیش آیا۔ کیونکہ "والصحیح ما فی الصحیح" صحیح وہ ہے جو صحیح بخاری میں پایا گیا ہے۔

(فتح الباری ج ۸ ص ۲۳۸ ، عمدة القاری المعروف بعینی ج ۲۰ ص ۱۹)

لیکن راقم کا جزم بھی علامہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے جزم کے مطابق ہی ہے کہ یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ کی بات ہے اور مراد بھی یہی ہے کہ یہ آیت لکھی ہوئی سوائے خزیمہ ابن ثابت انصاری سے کہیں نہ ملی۔

راقم نے ابن کثیر کے قول کو کیوں ترجیح دی۔ اس لئے کہ حدیث پاک میں صراحۃً کوئی زمانہ بھی مذکور نہیں۔ کیونکہ حدیث پاک یہ ہے۔

" قال ابن شهاب واخبرنی خارجة بن زید بن ثابت سمع زید بن ثابت قال فقدت آیة من الاحزاب حین نسخنا المصحف قد کنت اسمع رسول الله ﷺ یقرأ بها فالتمسناها فوجدناها مع خزیمة بن ثابت

الانصاری من المؤمنین رجال صدقوا ماعاهدوا اللہ علیہ فالحقناھا فی المصحف '' (بخاری باب جمع القرآن)

'' حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب ہم قرآن پاک کا نسخہ لکھ رہے تھے۔تو میں نے سورۃ احزاب کی آیت ''من المؤمنین '' کو گم پایا حالانکہ میں رسول اللہ ﷺ سے سنا کرتا تھا ہم نے تلاش کی تو وہ آیۃ حضرت خزیمہ ابن ثابت انصاری سے مل گئی ہم نے اسے مصحف میں شامل کرلیا''۔

حدیث پاک میں ایک تو جمع کا صیغہ ''نسخنا '' سے وہم پڑھنا ہے دوسرا اسی صیغہ سے وہم پڑھنا کہ اس کا معنی تو منتقل کرنا ہے۔لہذا اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ کے متعلق ہے۔

لیکن غور کرنے سے اور اپنے روزمرہ کے محاورات پر نظر کرنے سے روز روشن کی طرح یہ واضح ہوجاتا ہے کہ بیشک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جمع کے وقت حضرت زید ابن ثابت نے کہا ہوگا لیکن بات ماضی کی ہے کہ ہم نے جب پہلی مرتبہ جمع کیا تھا تو اس وقت سورۃ احزاب کی ایک آیت کہیں سے بھی لکھی ہوئی نہیں ملی البتہ خزیمہ ابن ثابت سے مل گئی۔

اگر علامہ عسقلانی اور عینی رحمۃ اللہ علیھما کی بات کو مان لیا جائے تو پھر جواب یہ ہوگا کہ یہ آیت حفاظ کے سینوں میں موجود تھی۔پہلی مرتبہ جمع کرتے وقت اسے شامل بھی کرلیا گیا تھا۔لیکن ہوسکتا ہے کہیں اس مصحف سے مٹ گئی ہو لیکن دلوں سے نہیں مٹی تھی حضرت زید ابن ثابت تو برملا کہہ رہے کہ میں وہ رسول اللہ ﷺ سے سنتا تھا۔

ایک علمی بحث:

سورۃ توبہ کی آخری آیات اور سورۃ احزاب کی آیت ایک ہی صحابی سے حاصل ہوئیں یا وہ علیحدہ علیحدہ شخص تھے؟ اس مسئلہ میں روایات مختلف ہیں ایک روایت عبدالرحمن ابن مہدی کی ابراہیم ابن سعد سے ہے۔اس میں سورۃ توبہ کی آخری آیات کے متعلق ہے کہ وہ خزیمہ ابن ثابت سے ملیں ترمذی اور مسند احمد میں یہی ہے۔ایک روایت شعیب زہری سے ہے جس میں یہ ہے کہ سورۃ توبہ کی آخری آیات خزیمہ

انصاری سے ملیں۔طبرانی نے مسند الشامیین میں جوروایت ابو الیمان کے واسطہ سے شعیب سے ذکر کی ہے اس میں خزیمہ ابن ثابت انصاری ذکر ہے ابن داؤد یونس ابن یزید کے واسطہ سے ابن شہاب نے بھی خزیمہ ابن ثابت انصاری ذکر کیا ہے ابراہیم ابن سعد نے روایت کی ہے کہ سورۃ توبہ کی آخری آیات ابو خزیمہ سے ملی ہیں۔

" والا رجح ان الذی وجد معه آخر معه آخر سورة التوبة ابو خزیمه بالکیة والذی وجد معه الآیة من الاحزاب خزیمه "

زیادہ راجح قول یہی ہے کہ وہ صحابی جن سے سورۃ توبہ کی آخری آیات ملیں وہ ابوخزیمہ ہیں جوکنیت سے مشہور ہیں نام ان کااوس ابن یزید ابن احرم ہے یا ان کا نام حارث بن خزیمہ ہے۔

لیکن وہ صحابی جن سے ''سورۃ احزاب'' کی آیت لکھی ہوئی ملی وہ حضرت خزیمہ ابن ثابت انصاری ہیں۔یہ وہ خوش نصیب صحابی ہیں جن کی گواہی کو دو مردوں کی گواہی کے برابر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ (ماخوذ از فتح الباری ج۸ص ۶۳۱،۶۳۲)

تاہم یہ بھی واضح ہے کہ بعض روایات کے مطابق سورۃ توبہ کی آخری آیات اورسورۃ احزاب کی آیت حضرت خزیمہ ابن ثابت انصاری سے ہی ملیں۔علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔" لا محذور فی کون کلیتهما مکتوبتین عنده دون غیره " (عینی شرح بخاری ج ۱۹ ص ۱۱۲)

کہ اس میں کوئی ممانعت نہیں کہ دونوں آیتیں ایک ہی صحابی خزیمہ ابن ثابت انصاری سے ملی ہوں کہ لکھی ہوئی ان کے پاس ہی ہوں کسی اور کے پاس نہ ہوں۔

فائدہ: حضرت خزیمہ ابن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کو دوشخصوں کی گواہی کے برابر گواہی دینے کا اعزاز کیوں ملا؟

"عن عمارة بن خزیمه ان عمه حدثه وهو من اصحاب النبی ﷺ ان النبی ﷺ ابتاع فرسا من اعرابی فاستتبعه النبی ﷺ لیقضیه ثمن فرسه فاسرع رسول الله ﷺ المشی وابطأ الاعرابی فطفق رجال یعترضون الاعرابی فیسا ومونه بالفرس ولا یشعرون ان النبی ﷺ ابتاعه فنادی

الاعرابی رسول اللہ ﷺ فقال ان کنت مبتاعا ھذا الفرس والا بعتہ فقام النبی ﷺ حین سمع نداء الاعرابی فقال او لیس قد ابتعتہ منک ؟ قال الاعرابی لا واللہ ما بعتکہ فقال النبی ﷺ بلی قد ابتعتہ منک فطفق الاعرابی یقول ھلم شھیدا فقال خزیمۃ بن ثابت انا اشھد انک قد بایعتہ فاقبل النبی ﷺ علی خزیمۃ فقال بم تشھد؟ فقال بتصدیقک یا رسول اللہ فجعل النبی ﷺ شھادۃ خزیمۃ بشھادۃ رجلین "

(ابو داود کتاب الشہادات)

" حضرت عمارہ ابن خزیمہ کہتے ہیں کہ میرے چچا نے حدیث بیان کی جو نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام میں سے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے ایک اعرابی سے گھوڑا خریدا۔ آپ نے اسے پیچھے چلنے کے متعلق کہا تا کہ آپ اسے گھوڑے کی رقم ادا کریں۔ رسول اللہ ﷺ جلدی جلدی (رقم کی ادائیگی کے لئے) چل رہے تھے اور اعرابی آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اس اعرابی کو کوئی اور لوگ ملنے لگ گئے۔ اور گھوڑے کا سودا کرنے لگے ان کو معلوم نہیں تھا کہ نبی کریم ﷺ نے اس سے گھوڑا خرید لیا ہے اعرابی نے رسول اللہ ﷺ کو ندا دی کیا تم نے یہ گھوڑا خریدا ہے؟ ورنہ میں اسے فروخت کردوں اعرابی کی ندا کوسن کر نبی کریم ﷺ کھڑے ہوئے اور فرمایا کیا میں نے تم سے یہ خرید نہیں لیا؟ اعرابی نے کہا قسم ہے اللہ تعالیٰ کہ میں نے تم پر یہ نہیں بیچا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں میں نے تو تم سے خرید لیا ہے اعرابی کہنے لگا تم گواہ لاؤ خزیمہ ابن ثابت نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں بیشک تم نے یہ نبی کریم ﷺ پر بیچ دیا ہے۔ نبی کریم ﷺ خزیمہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا تم نے کیسے گواہی دی؟ انہوں نے کہا آپ کی تصدیق کرتے ہوئے یا رسول اللہ تو نبی کریم ﷺ نے خزیمہ اکیلے کی گواہی دو شخصوں کے برابر کردی"۔

وضاحت حدیث: "فاستتبعہ ، ای طلب منہ ان یتبعہ " یعنی آپ نے اس اعرابی کو اپنے پیچھے پیچھے چلنے کا ارشاد فرمایا۔

" فطفق ، ای اخذ " یعنی اور لوگوں نے اس اعرابی سے سودا کرنا شروع کر دیا۔

طبقات ابن سعد میں اور مرقاۃ شرح مشکوۃ میں اس حدیث سے کچھ الفاظ زائد بھی ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ ان سودا کرنے والوں میں سے بعض نے اعرابی کو زیادہ رقم دینے کے متعلق کہا اس رقم

سے جو نبی کریم علیہ السلام نے اس سے طے کی تھی۔ زیادہ ثمن کے ملنے کی پیشکش پر ہی اعرابی نے نبی کریم علیہ السلام کو پکار کر کہا کہ اگر تم خریدنا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں فروخت کرنے لگا ہوں۔ جب نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تو خرید چکا ہوں۔ تو اعرابی نے کہا میں نے ابھی تک فروخت نہیں کیا اعرابی کے یہ کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اب دوبارہ بھاؤ طے ہونا چاہیے تا کہ مجھے رقم زیادہ مل جائے۔

نبی کریم علیہ السلام نے جب یہ فرمایا کہ میں نے تو پہلے ہی خرید لیا ہے سودا طے ہو چکا ہے تو دوسرے خریدار جو بے خبری سے اس سے سودا کر رہے تھے ان میں کچھ مسلمان بھی تھے جنہوں نے اس اعرابی کو کہا " ویلک ان رسول اللہ علیہ السلام لم یکن لیقول الاحقا " تمہاری بربادی رسول اللہ علیہ السلام تو صرف حق بات ہی کہتے ہیں۔

لیکن خوش قسمت صحابی حضرت خزیمہ ابن ثابت نے بغیر کسی خوف اور تفکر کے کہا " انا اشھد " میں گواہی دیتا ہوں۔ کیونکہ وہ اعرابی گواہ پیش کرنے کا مطالبہ کر رہا تھا۔

نبی کریم علیہ السلام نے جب حضرت خزیمہ سے پوچھا کہ تم نے گواہی کیسے دی؟ جب کہ تم وہاں ہمارے سودے کے وقت موجود ہی نہیں تھے تو انہوں نے عرض کیا "بتصدیقک یا رسول اللہ " جب آپ نے فرما دیا ہے کہ میں نے تم سے خرید لیا ہے۔ تو مجھے معلوم ہے کہ آپ نے سچ فرمایا ہے لہذا میں نے آپ کی تصدیق کر دی۔

طبقات ابن سعد میں حضرت خزیمہ ابن ثابت کا جواب بڑے خوبصورت انداز میں ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے عرض کیا " انا اصدقک بخبر السماء ولا اصدقک بما تقول " میں آپ کی آسمانوں کی خبروں کو سچا مانتا ہوں۔ تو کیا وجہ تھی کہ آپ کے اس ارشاد کو سچا نہ مانتا جو آپ اعرابی کو فرما رہے تھے۔

مقصد عرض ان کا یہ تھا کہ یا رسول اللہ آپ فرماتے ہیں جنت ہے، جہنم ہے، فرشتے ہیں اور آپ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ ہے اور وہ وحدہ لاشریک لہ ہے تو میں کہتا ہوں آپ نے سچ کہا ہے میرا اس پر ایمان ہے میرے ایمان کا یہ بھی تقاضا تھا کہ میں نے بیشک آپ کے سودے کو دیکھا سنا

نہیں تھا۔لیکن آپ کی بات کو اعرابی سے کرتے ہوئے سنتے ہی میرے ایمان نے کہا خزیمہ گواہی دے کہ حضور سچ ارشاد فرما رہے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو انعام سے نوازا بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ کرام کو یہ اعزاز حاصل نہ ہوسکا جو حضرت خزیمہ کو حاصل ہوا کہ ایک کی گواہی دو کے برابر ہے۔

(ماخوذ از عون المعبود ج ۱۰ ص ۲۶،۲۷)

تنبیہ : بعض احادیث مختلف انداز پر مروی ہیں۔یہی گواہی کا واقعہ نور الانوار میں اونٹنی خریدنے اور قیمت کے ادا کرنے کے اختلاف سے بیان کیا گیا ہے۔یقیناً ان کے سامنے بھی کوئی روایت ہوگی۔

قرآن پاک کے نام قرآن پاک سے:

قرآن پاک کے پچپن نام اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں:

﴿**کتاب اور مبین**،ارشاد باری تعالیٰ ہے "حم والکتاب المبین"

......**قرآن اور کریم**،اللہ تعالیٰ نے فرمایا "انه لقرآن کریم"

......**کلام**،رب قدوس نے فرمایا "حتی یسمع کلام الله"

......**نور**،رب کائنات نے ذکر فرمایا "وانزلنا الیکم نور مبینا"

......**هدی اور رحمة**،مالک الملک نے فرمایا "هدی ورحمة للمؤمنین"

......**فرقان**،رب کریم نے فرمایا "نزل الفرقان علی عبده"

......**شفا**،خالق کائنات نے ارشاد فرمایا "وننزل من القرآن ماهو شفاء"

......**موعظة**،رب رحیم نے فرمایا "قد جاتکم موعظةمن ربکم"

......**ذکر اور مبارک**،ارشاد رب غفور ہے "وهذاذکر مبارک انزلناه"

......**الحکیم**،رب بصیر نے ارشاد فرمایا "تلک آیات الکتاب الحکیم"

......**مهیمن**،رب رحمٰن نے فرمایا "مصدقا لما بین یدیه من الکتاب ومهیمنا علیه"

......**حبل**،رب عزیز نے فرمایا "واعتصموبحبل الله"

صراط مستقیم، رب رزاق نے فرمایا "وان هذا صراطی میستقیما"

قیم، رب ماجد نے فرمایا" قیما لینذر "

قول اور فصل، رب باسط نے فرمایا" انه لقول فصل"

نبأ عظیم، رب واسع نے فرمایا"عم یتساء لون عن النبا العظیم"

احسن الحدیث اور مثانی اور متشابه ، واحد غفار نے ارشاد فرمایا:

" الله نزّل احسن الحدیث کتابا متشابها مّثانی

تنزیل، رب العالمین نے فرمایا"وانه لتنزیل رب العلمین"

روح، رؤف رحیم نے فرمایا" اوحینا الیک روحا من امرنا"

وحی، ذات کبریا کاارشاد ہے"انما انذر کم بالوحی"

عربی، اللہ سمیع وعلیم کا ارشاد ہے" اناانزلناہ قرآناعربیا"

بصائر، رب محمد ﷺ نے فرمایا" هذا بصائر"

بیان، رب ذوالجلال نے فرمایا"هذا بیان للناس"

علم، مولائے کائنات نے فرمایا"من بعد ماجاء ک من العلم"

حق، خالق جن وانس نے فرمایا"ان هذا لهو القصص الحق"

هادی، خلاق ملائکہ نے ارشاد فرمایا" ان هذا القرآن یهدی للتی هی اقوم"

عجب، عالم الغیب والشهادۃ کاارشادگرامی ہے" قرآنا عجبا"

تذکرہ، ذوالقوۃ المتین کا ارشاد ہے"وانه لتذکرۃ"

العروۃ الوثقی، رب بے مثل نے فرمایا"فقد استمسک بالعروۃ الوثقی"

صدق، ذات بے مثال نے فرمایا"والذی جاء بالصدق"

عدل، لم یلد ذات نے فرمایا"وتمت کلمة ربک صدقاوعدلا"

امر، لم یولد ذات نے فرمایا "ذلک امر الله انزله الیکم"

منادی، سلامتی عطاء کرنے والے نے فرمایا" منادیا ینادی للایمان"

بشری، امن دینے والے نے کہا ہُوهدی وبشری"

......**مجید**، رب مجید نے فرمایا" بل ھو قرآن مجید"

......**زبور**، رب حمید نے فرمایا"ولقد کتبنا فی الزبور"

......**بشیر ونذیر**،رب بشیر ونذیر نے فرمایا" کتاب فصلت آیاتہ قرآنا عربیا لقوم یعلمون بشیرا ونذیرا"

......**عزیز**،عزیز رحیم ذات نے ارشادفرمایا"وانہ لکتاب عزیز"

......**بلاغ**، سمیع وبصیر نے فرمایا" ھذا بلاغ للناس"

......**قصص**، ذوالجلال والاکرام ذات نے فرمایا" احسن القصص"

......**صحف اور مکرمہ اور مرفوعہ اورمطہرہ**،ان چار ناموں کو ایک ہی آیت کریمہ میں ذکرفرمادیا" فی صحف مکرمۃ مرفوعۃ مطہرۃ "

قرآن کوقرآن کہنے کی وجہ:

بعض حضرات نے کہا کہ یہ اسم علم ہے اور اللہ تعالی کے کلام سے خاص ہے بغیر ہمزہ کے ہے اس صورت میں " ق ر ا ن " ہوں گے اور وزن ہوگا "فعال " ابن کثیر اور امام شافعی رحمہ اللہ نے اسے ہی اختیار کیا ہے یعنی یہ اسی طرح نام ہے جس طرح توراۃ اور انجیل نام ہیں کسی لفظ سے مشتق نہیں۔بعض حضرات نے کہا یہ مشتق ہے مشتق کہنے والے حضرات میں سے اشعری اس طرف ہیں کہ یہ مشتق ہے " قرنت الشی بالشی " (ایک چیز کا دوسری چیز سے ملنا) سے۔اس صورت میں بھی ہمزہ نہیں ہوگا۔ بلکہ"فعال" کاوزن ہوگا چونکہ قرآن پاک میں بھی سورتیں ایک دوسری سے ملی ہوئی ہیں۔آیتیں اور حروف ایک دوسرے سے متصل ہیں اس لئے کلام اللہ کا نام قران رکھا گیا۔

فراء نے کہا ہے کہ یہ مشتق ہے " قرائن " سے جو اصل میں " قراین " ہے۔جمع ہے قرین کی چونکہ قران کی آیات بعض بعض کی تصدیق کرتی ہیں اور ایک دوسری کے مشابہ ہیں اس وجہ سے آیات قرائن ہوئیں یہی وجہ ہے قران نام رکھنے کی۔لیکن خیال رہے کہ اس صورت میں بھی ہمزہ نہیں اور نون اصل ہے وزن " فعال " ہی ہے۔

زجاج نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ قرآن میں ہمزہ تو پایا گیا ہے البتہ کبھی تخفیف کے طور پر ہمزہ نہیں پڑھا جاتا۔ بلکہ ہمزہ کی حرکت نقل کر کے ماقبل (راء) کو دی اور ہمزہ کو حذف کر دیا۔

جن حضرات نے ہمزہ سے قرآن کہا ہے ان میں پھر مختلف قول ہیں۔ بعض حضرات نے کہا یہ مصدر ہے جیسے رجحان اور غفران مصدر ہیں۔ البتہ معنی مفعول والا ہو یعنی قرآن کو اس لئے قرآن کہا گیا کہ یہ مقرو پڑھا ہوا ہے کیونکہ جتنا قرآن پاک کو پڑھا جاتا ہے اتنا کسی کتاب کو نہیں پڑھا جاتا۔

کچھ اور حضرات نے کہا کہ یہ مشتق ہے " قرء " سے جس کا معنی ہے جمع کرنا، عام طور پر کہا جاتا ہے " قراء ت الماء في الحوض " میں نے حوض میں پانی جمع کیا۔ اس معنی کے لحاظ سے قرآن کو قرآن کی وجہ یہ ہوگی کہ اسمیں تمام علوم جمع ہیں اور سورتیں بعض، بعض کے ساتھ جمع ہیں۔

راغب اصفہانی نے کہا " **لایقال لکل جمع القرآن ولا لجمع کل کلام قرآن** " ہر جمع ہونے والی اشیاء کو قرآن نہیں کہا جاتا اور ہر جمع ہونے والے کلام کو بھی قرآن نہیں کہا جاتا۔

" **قال وانما سمی قرآنا لکونه جمع ثمرات الکتب السالفة المنزلة وقیل لانه جمع انواع العلوم کلها** "

علامہ راغب نے کہا قران کو قرآن کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ پہلی آسمانی کتب کے تمام فوائد کا جامع ہے بلکہ بعض حضرات نے یہ بیان کیا کہ یہ تمام علوم کا جامع ہے۔

" قرء " کا ایک معنی نکالنا بھی ہے جس طرح کہا جاتا ہے "**ماقرأت الناقة سلا** " اونٹنی نے آج تک بچہ نہیں جنا (پیٹ سے بچہ نہیں نکالا) اس معنی کے لحاظ سے قرآن کا معنی ہوگا۔ نکالا ہوا یعنی پڑھنے والا اپنے منہ سے الفاظ کو نکالتا ہے۔ (ماخوذ از اتقان ص ۵۰، ۵۱)

خیال رہے کہ جتنے نام ذکر کئے ہیں تمام کی وجہ تسمیہ (نام رکھنے کی وجہ) کو علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے وضاحت سے بیان کیا لیکن اختصار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے صرف قرآن کی وجہ تسمیہ کو ذکر کیا گیا ہے۔

سورۃ کو سورۃ کہنے کی وجہ:

یہ لفظ یا تو لیا ہوا ہے " **سور الطعام** " سے (اس میں ہمزہ ہے ہمزہ کو واؤ بنا کر سورۃ کہا گیا ہے) جس کا معنی ہے "**طعام کا بقیہ**" اس معنی کے لحاظ سے سورۃ کو اس لئے سورۃ کہا گیا ہے کہ

یہ قرآن پاک کا ایک قطعہ ہے یا اس کو بناء سے تشبیہ دی گئی ہے جس طرح وہ مختلف اینٹوں وغیرہ کے قطعات سے بنتی ہے۔اسی طرح مختلف سورتوں سے قرآن پاک بھی مرکب ہے۔

یا یہ لفظ " سو ر البلد " سے لیا ہوا ہے(اس میں واوَ ہے ہمزہ نہیں)اس کا معنی ہے شہر کا احاطہ کرتے والی دیوار، سورۃ بھی چونکہ آیات اور مضامین کا احاطہ کرتی ہے اس لئے اسے سورۃ کہا جاتا ہے۔

سورۃ بلند مکان بلند منزل کو بھی کہا جاتا ہے چونکہ اللہ کا کلام رفیع الشان ہے اس لئے اس کے ہر حصہ کو سورۃ کہا گیا ہے۔ نابغہ نے کہا:

ألم تر أن الله اعطاک سورۃ
تری کل ملک حولها يتذبذب

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں رفعت عطاء فرمائی ہے تم ہر بادشاہ کو اس کے ارد گرد پھرتا ہوا دیکھو گے۔

سورۃ کا معنی "چڑھنا" بھی ہے جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔" اذ تسوروا المحراب "جب وہ حجرہ کی دیواروں پر چڑھے چونکہ سورۃ میں بھی ترکیب پائی جاتی ہے اور پہلی سورۃ سے دوسری کی طرف جانا گویا کہ بلندی پر چڑھنا ہے۔

☆ سورۃ میں کم از کم تین آیتوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

☆ کسی سورۃ کا نام اس میں ذکر کئے گئے مضامین میں سے کسی ایک مضمون کی مناسبت سے ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ بعض سورتوں کا ایک ایک نام ہے اور بعض کے دو دو نام ہیں اور زیادہ بھی ہیں جیسا کہ سورۃ فاتحہ کے بیس ناموں سے بھی زائد ہیں، اسی طرح سورۃ توبہ کا دوسرا نام سورۃ براءۃ ہے۔اسی طرح سورۃ طلاق کا دوسرا نام سورۃ النساء القصری ہے۔

(ماخوذ از اتقان ج ۱ ص ۵۲ تا ص ۵۵)

تفصیل دیکھنی ہو تو علامہ سیوطی رحمہ اللہ کی الاتقان کی جزء اول کو دیکھئے۔

فائدہ جلیلة: مسند احمد وغیرہ میں واثلہ ابن اسقع سے حدیث مروی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" اعطیت مکان التوراة السبع الطوال واعطیت مکان الزبور المئین
واعطیت مکان الانجیل المثانی وفضلت بالمفصل "(الاتقان ج ۱ ص ۵۶)

مجھے توراۃ کی جگہ سبع طوال عطا کی گئیں اور مجھے زبور کی جگہ مئین عطا کی گئیں۔اور مجھے انجیل کی جگہ مثانی عطا کی گئیں اور مفصل سے مجھے فضیلت عطا کی گئی۔

نتیجہ تقریباً واضح ہی ہے کہ قرآن پاک آسمانی تینوں کتب توراۃ، زبور، انجیل کے مجموعہ سے بھی زیادہ فضیلت حاصل ہے "سبع طوال " کیا ہے؟ سبع طوال سورۃ بقرہ سے لے کر سورۃ توبہ تک، یعنی آخری سورۃ انفال ہے یہ سات سورتیں ہیں اس لئے ان کو سبع کہا گیا اور بڑی سورتیں ہیں اس لئے ان کو طوال (لمبی) کہا گیا ہے۔

" مئون رمئین" ان سورتوں کو کہا گیا ہے جو ان کے ساتھ آگے آرہی ہیں ان میں سو سے زیادہ آیتیں یا سو کے قریب آیتیں پائی جاتی ہیں اس لئے ان کو مئون کہا جاتا ہے۔

" مثانی " وہ سورتیں ہیں جو " مئین " کے بعد ہیں ان کے آیتیں سو سے زیادہ کم ہیں یعنی سو کے قریب نہیں ان کو مثانی کہنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان کو آیات کی تعداد سے مئین کے بعد دوسرا درجہ حاصل ہے درجہ ثانیہ حاصل ہونے کی وجہ سے ان کو مثانی کہہ لیا گیا۔دوسری وجہ ان کو مثانی کہنے کی یہ ہے کہ ان سورتوں کی آیتوں کو دو مرتبہ جمع کریں تو ان کی تعداد "طوال یا مئین " کے قریب ہوتی ہے۔

" مفصل " وہ سورتیں ہیں جو " مئون " کے بعد ہیں یہ چھوٹی سورتیں ہیں ان کو مفصل کہنے کہ وجہ بھی یہ ہے کہ ان میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بسم اللہ سے ان میں فرق کر دیا جاتا ہے۔بعض حضرات نے کہا ان میں منسوخیت بہت کم ہی واقع ہوئی اس لئے ان کو مفصل کہا گیا ہے اور اسی وجہ سے ان کا دوسرا نام محکم بھی ہے۔ (از اتقان ج ا ص ۶۳)

تنبیہ : ہر فن والوں کی اپنی اپنی اصطلاحات ہیں۔اصول قرآن والے حضرات کی اصطلاح میں مفصل کی تقسیم اس طرح ہے۔

" طوال مفصل " مثانی کے بعد چھوٹی سورتیں جہاں سے شروع ہوئی ،جن کی آیات پچاس کے قریب بھی نہیں وہاں سے شروع کر کے "عم یتساء لون " تک طوال مفصل ہیں۔

" اوساط مفصل " عم یتساء لون سے لےکر "والضحی "تک اوساط مفصل ہیں۔

" قصار مفصل " والضحی سے لےکر والناس تک قصار مفصل ہیں۔

(از اتقان ج ۱ ص ۶۴)

فقہائے کرام کی اصطلاح میں سورۃ الحجرات سے لےکر والسماء ذات البروج تک طوال مفصل اور والسماء ذات البروج سے لےکر " لم یکن "تک اوساط مفصل اور لم یکن سے لےکر والناس تک قصار مفصل ہیں۔ (عینی شرح کنز)

سورتوں کی آیتیں:

آیات کی تعداد کے لحاظ سے سورتوں کی تین قسمیں ۔ایک قسم یہ ہے کہ ان کی تعداد میں اتفاق ہے۔سب کے نزدیک ایک ہی تعداد ہے اور آیات میں بھی کوئی اختلاف نہیں ایک آیت یہاں سے ختم ہوئی وہاں ختم ہوئی اسی طرح دوسری ،تیسری وغیرہ اس میں بھی اتفاق ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ آیتوں کی تعداد میں تو اتفاق ہے ۔لیکن بعض حضرات کے نزدیک شمار اور آیت اور بعض کے نزدیک اور شمار میں آتی ہے۔

تیسری قسم یہ ہے کہ سورتوں کی آیتوں کی تعداد میں ہی اختلاف بعض کے نزدیک تعداد کم اور بعض کے نزدیک زیادہ۔

پہلی قسم ،کل چالیس سورتیں ہیں:

﴿یوسف ،	آیات ۱۱۱	......الحجر ،	آیات ۹۹
......النحل ،	آیات ۱۲۸	......الفرقان،	آیات ۷۷
......الاحزاب	آیات ۷۳	......الفتح	آیات ۲۹

...... الحجرات ١٨	...... التغابن ١٨	......ق ۴۵
...... الذاریات ٦٠	...... القمر ۵۵	...... الحشر۲۴
...... الممتحنة١٣	...... الصف ١٤	

...... الجمعة ، المنافقون الضحی ، العادیات (ہرایک میں)١١

...... التحریم ١٢	......ن ۵۲	...... الانسان (الدھر)٣١
......المرسلات ۵٠	......التکویر ٢٩	...... الانفطار ١٩
...... سبح اسم ربک ١٩	......التطفیف ٣٦	......البروج ٢٢
......الغاشیه٢٦	......البلد٢٠	...... اللیل ٢١

...... الم نشرح،التین ، الھٰکم (ہرایک میں)٨

...... الھمزہ ...... الفیل ، الفلق ، تبت (ہرایک میں)۵

......الکافرون ٦	...... الکوثر٣	...... النصر٣

دوسری قسم کل چار سورتیں ہیں۔القصص کی آیات کی تعداد بالاتفاق اٹھاسی ہے لیکن اھل کوفہ نے طسم کوایک آیت شمار کیا ہے۔اور دوسرے حضرات کے نزدیک ایک آیت میں دوآیتیں ہیں طسم آیت نہیں وہ "امة من الناس یسقون" کوایک آیت شمار کرتے ہیں۔

• عنکبوت کی آیات تو بالاتفاق انہتر ہے لیکن اہل کوفہ کے نزدیک الم ایک آیت ہے۔اور اہل بصرہ کے نزدیک یہ آیت نہیں بلکہ "مخلصین له الدین" ایک آیت ہے۔اور اہل شام کے نزدیک "وتقطعون السبیل" پرایک آیت ختم ہوتی ہے۔

الجن، کی آیات بالاتفاق اٹھائیس ہیں۔کی حضرات کے نزدیک " لن یجیرنی من الله احد " اور باقی حضرات کے نزدیک اس کے بدل "ولن اجد من دونه ملتحدا " ہے۔

" العصر" بالاتفاق اس کی تین آیتیں ہیں۔لیکن مدنی حضرات کے نزدیک "والعصر" ایک

مستقل آیت ہے۔اور باقی حضرات کے نزدیک "والعصر" مستقل آیت نہیں بلکہ "وتواصوا بالحق" آیت ہے اور "وتواصوا بالصبر" علیحدہ آیت ہے۔

سورۃ فاتحہ کی آیات سات ہیں۔سات کا قول کرنے والے بعض حضرات نے "بسم اللہ" کو ایک آیت شمار کیا ہے اور "انعمت علیھم" پر آیت کا اختتام نہیں مانا۔اور بعض حضرات کے نزدیک "بسم اللہ" سورۃ فاتحہ کا جزء نہیں بلکہ یہ اسی طرح ہے۔جس طرح دوسری سورتوں میں "بسم اللہ" فرق کرنے کے لئے آتی ہے۔البتہ ان کے نزدیک "انعمت علیھم" پر آیت ختم ہو جاتی ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے نزدیک آٹھ آیتیں ہیں۔وہ "بسم اللہ" کو بھی ایک آیت تسلیم کرتے ہیں اور "انعمت علیھم" پر بھی آیت کا اختتام تسلیم کرتے ہیں۔

کچھ حضرات کے نزدیک چھ آیتیں ہیں وہ "بسم اللہ" کو بھی آیت نہیں تسلیم کرتے اور " انعمت علیھم" پر بھی آیت کا اختتام تسلیم نہیں کرتے۔

اور کچھ حضرات کے نزدیک نو آیتیں ہیں "بسم اللہ" بھی ایک آیت ہے "ایاک نعبد" علیحدہ مستقل آیت ہے اور "انعمت علیھم" پر بھی آیت کا اختتام ہو رہا ہے۔

(ماخوذ از الاتقان ج ۱ ص ۶۷ تا ۶۹)

قرآن پاک میں سورتوں کی تعداد:

قرآن پاک میں کل سورتیں ایک سو چودہ ہیں۔البتہ بعض حضرات نے سورۃ انفال اور سورۃ توبہ کو ایک سمجھا ہے انہوں نے ایک سو تیرہ بیان کی ہیں۔

کل آیات: چھ ہزار دو سو دس ہیں۔یہ تعداد ہمارے پاس جو آیات شمار ہیں۔(چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ کا بھی ایک قول ہے) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول یہ ہے کہ کل آیات چھ ہزار چھ سو سولہ آیتیں ہیں۔

دانی رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ چھ ہزار آیتوں تک تو اتفاق ہے اوپر کی تعداد میں اختلاف ہے

بعض کے نزدیک اوپر دو سو چار ہیں۔ بعض کے نزدیک اوپر دو سو چودہ ہیں بعض کے نزدیک اوپر دوسوانیس ہیں بعض کے نزدیک اوپر دوسوپچیس ہیں اور بعض کے نزدیک اوپر دوچھبیس ہیں۔

اصل میں اختلاف کی وہی وجہ ہے جو سورتوں کی آیتوں میں بیان کی جاچکی ہے۔ بعض کے نزدیک ایک آیت ہوتی ہے اور بعض کے نزدیک اسی ایک آیت کی دو آیتیں ہوتی ہیں

حروف کی تعداد: تین لاکھ تیئس ہزار چھ سو اکہتر کل حروف ہیں۔ (از الاتقان ج ا ص ۶۷)

فضیلت تفسیر: ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے علم کی تعریف کی کسی شخص نے آپ کو کہا "جعلت فداء ک تصف جابرا بالعلم و انت انت" میں آپ پر قربان آپ جابر کے علم کی تعریف کر رہے ہیں حالانکہ آپ خود بہت بڑے عالم ہیں تو آپ نے فرمایا۔ "انہ کان یعرف تفسیر قولہ تعالیٰ ان الذی فرض علیک القرآن لرادک الی معاد" وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد "ان الذی فرض" کی تفسیر جانتے تھے۔

"وقال مجاھد احب الخلق الی اللہ تعالیٰ اعلمھم بما انزل"

مجاہد رحمہ اللہ نے کہا اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق سے مجھے وہ محبوب ہے جو قرآن کا زیادہ علم رکھتا ہو۔

" وقال الحسن واللہ ما انزل اللہ آیۃ الا احب ان یعلم فیما انزلت وما یعنی بھا"

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا قسم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اللہ تعالیٰ نے جو آیت بھی نازل فرمائی میں یہی پسند کرتا ہوں کہ میں اس کے نزول کی وجہ اور اس کے مطالب کو سمجھ لوں۔

" وقال الشعبی رحل مسروق الی البصرۃ فی تفسیر آیۃ فقیل لہ ان الذی یفسرھا رحل الی الشام فتجھز ورحل الی الشام حتی علم تفسیرھا"

شعبی کہتے ہیں حضرت مسروق رحمہ اللہ بصرہ میں سفر کر کے ایک آیت کی تفسیر معلوم کرنے کے لئے گئے۔ وہاں جب پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ تفسیر بیان کرنے والے شخص تو شام چلے گئے آپ وہاں سے شام گئے یہاں تک کہ وہاں جا کر انہوں نے اس شخص سے ایک آیت کی تفسیر حاصل کی۔

" وقال عكرمة فى قوله عزوجل ومن يخرج من بيته مهاجرا الى الله ورسوله طلبت اسم هذا الرجل الذى خرج من بيته مهاجرا الى الله ورسوله اربع عشرة سنة حتى وجدته وقال ابن عبد البر هو ضمرة بن حبيب "

حضرت عکرمہ کہتے ہیں میں نے ''ومن یخرج من بیتہ'' کے متعلق چودہ سال طلب کرنے کے بعد پایا کہ وہ کون شخص تھا جس کے متعلق اس آیت میں ذکر کیا گیا۔ ابن عبدالبر نے بیان کیا وہ ضمرہ ابن حبیب تھے۔

راقم کا خیال ہے کہ حضرت عکرمہ نے کسی سے نہیں پوچھا ہوگا خود ہی جستجو میں رہے ہوں گے یہاں تک کہ آپ کو کسی طرح علم حاصل ہوگیا ہوگا۔ جیسا کہ راقم اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کے ایک شعر کو نعت خوانوں سے سن کر ایک لفظ کو کئی سال نہ سمجھ سکا۔ جب حدائق بخشش خریدی تو دیکھ کر سمجھا۔ وہ شعر یہ ہے:

میرے کریم سے گر قطرہ کسی نے مانگا   دریا بہا دیئے ہیں دُربے بہا دیئے ہیں

چونکہ پڑھنے والے ''دُربے'' اکٹھا پڑھتے ہیں بہا دیئے ہیں علیحدہ پڑھتے ہیں میں کئی سال سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ ''دربے'' کس زبان کا لفظ ہے اس کا کیا معنی ہے لیکن جب لکھا ہوا شعر دیکھا تو سمجھا کہ اصل تلفظ اس کا اس طرح ہے۔ دُر بے بہا۔ دیئے ہیں۔ (قیمتی موتی دیئے ہیں)۔

میں بھی کئی سال خود ہی جستجو میں رہا کسی سے پوچھا نہیں۔ پوچھتا تو شائد اسی وقت پتہ چل جاتا۔

" قال ابن عباس مكثت سنتين اريد ان اسأل عمر من الامرأتين اللتين تظاهرتا على رسول الله ﷺ ما يمنعنى الامهابته فسألته فقال هى حفصة وعائشة "

'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سورۃ تحریم میں رب تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں سے دو کا ان الفاظ مبارکہ سے ذکر فرمایا" فان تظاهرا عليه " میں چاہتا تھا کہ مجھے پتہ چلے کہ یہ دو کون ہیں''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھنا چاہتا تھا لیکن آپ کا بہت رعب تھا جس کی وجہ سے دو سال ہی گزر گئے کہ آج پوچھتا ہوں کل پوچھتا ہوں آخر کار میں نے پوچھ ہی لیا آپ نے فرمایا وہ حفصہ اور

عائشہ (رضی اللہ عنہما) تھیں۔

" وقال اياس ابن معاوية مثل الذين يقرء ون القران وهم لايعلمون تفسيره كمثل قوم جاء هم كتاب من ملكهم ليلا وليس عندهم مصباح فتداختلهم الرعبة ولا يدرون مافى الكتاب او مثل الذى يعرف التفسير كمثل رجل وعند هم بمصباح فقرء وا ما فى الكتاب "

(از تفسیر قرطبی ج ۱ ص ۲

" حضرت ایاس ابن معاویہ نے کہا جو لوگ قرآن پڑھتے ہیں اور اس کی تفسیر نہیں جانتے وہ اسطرح ہیں جیسا کہ کسی قوم کے پاس ان کے بادشاہ کا خط رات کو پہنچے ان کے پاس چراغ نہ ہو وہ یہ تو نہ سمجھ سکیں کہ اس میں کیا ہے البتہ ان پر رعب طاری رہے لیکن جو لوگ قران کی تفسیر بھی جانتے ہیں اس کی مثال ایسے ہے جیسا کہ ایک شخص کے پاس رات کو خط آئے۔ لیکن اس کے پاس چراغ ہو وہ خط کو پڑھ کر سمجھ جائے کہ اس میں کیا ہے "۔

تفسیر بالرائے:

" عن ابن عباس عن النبى ﷺ قال اتقوا الحديث على الا ماعلمتم فمن كذب على متعمدا فليتبوأ مقعده من النار ومن قال فى القرآن برأيه فليتبوأ مقعده من النار " (ترمذی ،قرطبی ج ۱ ص ۳۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد بیان فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جب تک تمہیں یقینی علم حاصل نہ ہو اس وقت تک میری حدیث بیان کرنے سے بچو۔ جس شخص نے جان بوجھ کر میری طرف سے جھوٹی حدیث بیان کی اس نے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنایا۔ اور جس نے قران کو اپنی رائے سے بیان کیا اس نے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنایا۔

" عن جندب قال قال رسول الله ﷺ من قال فى القرآن برأيه فاصاب فقد اخطأ "

(ترمذی ،قرطبی ج ۱ ص ۳۲)

جندب کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے قرآن کو اپنی رائے سے بیان کیا۔ اس نے اگرچہ درست بھی بیان کیا لیکن پھر بھی غلطی کی۔

" وزاد رزین ومن قال برأیه فأ خطأ فقد کفر "

رزین میں یہ الفاظ بھی زائد ہیں جن کا معنی یہ ہے کہ جس نے قرآن کو رائے سے بیان کیا اور غلط بیان کیا تحقیق وہ کافر ہوگیا۔

وضاحت احادیث: پہلی حدیث جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ قرآن پاک کے مشکل الفاظ کو صحابہ کرام اور تابعین کے مذہب کے خلاف اپنی مرضی سے بیان کر کے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کو حاصل کرے۔

دوسرا مطلب یہ ہے جو زیادہ صحیح ہے " **من قال فی القران قولا یعلم ان الحق غیرہ فلیبتوأ مقعدہ من النار** " جس شخص نے قرآن پاک کے حق مطلب کو جانتے ہوئے اس کے خلاف بیان کیا اس نے اپنا ٹھکانا جہنم بنایا۔

دوسری حدیث جو جندب سے مروی ہے اس کی سند پر بھی کلام ہے کہ اس میں ایک راوی سہیل بن ابی حزم جس کا نام مہران اور لقب عبد اللہ ہے وہ ضعیف راوی ہے۔ اور اس میں وجہ یہ کہ اس حدیث میں رائے بمعنی ھوی (خواہش ہے) ہے اس معنی کے لحاظ سے حدیث کا مفہوم یہ ہے۔

" من قال فی القرآن قولا یوافق ھواہ لم یاخذ عن ائمۃ السلف فاصاب فقد اخطأ "

جس شخص نے قرآن پاک کے مطالب اپنی خواہشات کے مطابق بیان کئے سلف صالحین سے نہ حاصل کئے تو اس نے خطاء کی اس لئے کہ اس نے قرآن پر وہ حکم لگایا ہے جسے وہ جانتا ہی نہیں تھا اور نہ ہی اصحاب اثر اور اصحاب نقل کے مذاہب کی اسے واقفی حاصل ہوئی یہی اس کی خطاء ہے۔

ابن عطیہ نے یہ بیان کیا کہ اس وعید کا تعلق اس سے ہے کہ کوئی شخص کسی سے قرآن پاک کا مطلب پوچھے تو وہ بغیر غور وفکر کے اپنی رائے سے بیان کر دے تو اس نے خطاء کی۔

یہ تفسیر بالرائے نہیں:

" واقتضتہ قوانین العلم کالنحو، والاصول، ولیس یدخل فی ھذاالحدیث ان یفسر اللغویون لغتہ والنحویون نحوہ والفقھاء معانیہ ویقول کل واحد

باجتهاده المبنی علی قوانین علم ونظر فان القائل علی هذه الصفة لیس قائل بمجرد رأیه"

"جو علم کے قوانین کا تقاضا ہے مثلاً نحو کے قوانین اور اصول فقہ وغیرہ کے وہ اس حدیث میں داخل نہیں لغت والے حضرات لغوی بحث کریں نحوی حضرات نحو کے مسائل بیان کریں۔فقہاء فقہی مسائل بیان کریں تو ان کا یہ بیان کرنا علم کے قوانین کے مطابق ہوتا ہے اور ان کے مسائل نظر وفکر سے حاصل ہوتے ہیں ان کو اس حدیث میں داخل نہیں کیا جاسکتا کہ وہ تفسیر بالرائے کر رہے ہیں۔

تنبیہ: بعض لوگوں نے کہا کہ تفسیر صرف سماع پر موقوف ہے انہوں نے بطور دلیل یہ آیت پیش کی " فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی الله والرسول " (سورۃ النساء آیۃ ۵۹)

لیکن علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ان کے موقف کا رد کرتے ہوئے فرمایا "ھذا فاسد" ان کا یہ قول فاسد ہے اس لئے کہ اگر صرف یہی مراد ہو کہ قرآن پاک کی تفسیر فقط ان اقوال سے کی جاسکتی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے گئے ہوں تو یہ کہنا باطل ہے کیونکہ صحابہ کرام نے قرآن پاک پڑھا لیکن تفسیر میں ان کا کئی مقام میں اختلاف پایا جاتا ہے اگر تفسیر کا تعلق صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سننے پر موقوف ہوتا تو کبھی صحابہ کرام کا اختلاف نہ ہوتا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس کے لئے دعاء ان الفاظ مبارکہ سے فرمائی "اللھم فقھه فی الدین وعلمه التاویل " اے اللہ اس کو دین میں سمجھ عطا فرما اور اسے تاویل کا علم عطا فرما۔

" فان کان التاویل مسموعا کالتنزیل فما فائدۃ تخصیصه بذلک " اگر تاویل بھی صرف سننے پر موقوف ہے جیسے قرآن پاک کا تعلق صرف نبی کریم ﷺ سے سننے پر موقوف ہے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے لئے یہ خصوصی دعاء کرنے کا کیا مقصد ہوسکتا ہے۔

سورۃ نساء کی آیت کا مطلب یہ ہے کہ اپنی خواہشات کے مطابق تفسیر نہ کرو اگر تمہارا اختلاف ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے کلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو فیصل تسلیم کرو۔

اور یہ مطلب ہے کہ قرآن پاک کے ظاہری الفاظ سے مطالب حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو بلکہ ان کے حقیقی مطالب کو سمجھنے کی کوشش کرو۔اس لئے آیت کریمہ سے ان کا استدلال باطل ہے۔

(از قرطبی ج ۱ ص ۳۴،۳۳)

قرآن پاک میں رائے کے جواز پر اور قرآن پاک میں اجتہاد کرنے پر کثیر دلائل موجود ہیں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔"افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالها " قرآن پاک میں (یہ لوگ) تدبر کیوں نہیں کرتے کیا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔رب تعالیٰ کا اور ارشاد گرامی ہے "کتاب انزلناہ الیک مبارک لید بروا آیاتہ ولیتذکر اولو الالباب " ہم نے آپ کی طرف برکت والی کتاب نازل کی تاکہ اس کی آیات میں تدبر کریں اور عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔

صوفیاء کرام کی تفاسیر صحیح اور درست ہیں:

قرآن پاک میں دقیق اشارات پائے گئے جو ارباب سلوک پر ہی منکشف ہوتے ہیں ان میں اور ظاہر مطالب میں تطبیق دینی ممکن ہوتی ہے اسی کا نام صوفیاء کرام کی تفاسیر ہیں۔

" قال ابن مسعود من اراد علم الاولین والآخرین فلیتل القرآن "

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو شخص اولین وآخرین کے علوم حاصل کرنا چاہتا ہے وہ قرآن پاک پڑھے۔

"ومن المعلوم ان هذا لایحصل بمجر د تفسیر الظاهر " یہ واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ ظاہری معانی اور ظاہری تفاسیر سے اولین وآخرین کے علوم حاصل نہیں ہو سکتے۔

بعض اہل علم جن پر وثوق کیا جا سکتا ہے ان کا قول یہ ہے " لکل آیة ستون الف فهم " ہر آیت کے ساٹھ ہزار مطالب ہیں اس سے بھی واضح ہوا کہ یہ صرف ظاہری معانی ومطالب سے حاصل نہیں ہو سکتے۔

حضرت حسن سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لکل آیة ظهر وبطن

ولکل حرف حد ولکل حد مطلع " ہر آیت کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی ہر حرف کی حد ہے اور ہر حد کا مطلع۔ظاہر سے مراد وہ معانی جو ظاہر ہوں یعنی ظاہری علوم رکھنے والے حضرات ان کو سمجھ لیں اور باطن سے مراد وہ اسرار ہیں جن پر اللہ تعالیٰ ارباب حقائق ،اصحاب معرفت ،سالکین حضرات کو مطلع فرماتا ہے۔

ہر حرف کی حد ہے یعنی ہر حرف کے معنی کی وہاں انتہاء ہوجاتی ہے جہاں اللہ تعالیٰ اس کی انتہاء کا ارادہ فرماتا ہے ہر حد کا مطلع ہے یعنی جو بھی معانی اور احکام پوشیدہ ہوتے ہیں ان کی معرفت کے کوئی نہ کوئی ذرائع ہیں جن کے ذریعے ان کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔

روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ ہر آیت کا کوئی نہ کوئی باطنی معنی بھی ہوتا ہے اس معنی پر مطلع کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی ذرائع ہوتے ہیں وہ صوفیاء کرام ہی ہیں۔

خیال رہے کہ صوفیاء کرام ظاہری معانی کا انکارنہیں کرتے بلکہ ظاہری معانی مراد لینے کے بعد باطنی مطالب بھی بیان کرتے ہیں لیکن اصحاب رائے صرف اپنی مرضی کے ڈھکوسلے بیان کرتے ہیں۔

صوفیاء کرام کی تفاسیر اور اپنی خواہشات کے مطابق ظاہر کے خلاف تفاسیر بیان کرنے والوں کی تفاسیر کو ایک درجہ میں رکھنا حماقت سے خالی نہیں۔

صرف ظاہری معانی مراد لینے والے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو دیکھ کر اپنی غلطی کا اعتراف کریں ﴿وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ قران ہر چیز کی تفصیل بیان کرتا ہے۔اور رب تعالیٰ کا فرمان ذیشان ﴿مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ﴾ (ہم نے قرآن میں کسی چیز کے بیان کو نہیں چھوڑا) بھی ان کو نظر آنا چاہیے۔

عجیب تماشہ یہ ہے کہ وہ یہ ماننے کے لئے تیار ہیں کہ دیوان متنبّی میں الفاظ کئی کئی معانی پر مشتمل ہیں لیکن وہ کلام جو رب العلمین کا ہے۔خاتم المرسلین پر نازل ہے اس کے باطنی معانی کو صرف ضد کی وجہ سے ماننے کیلئے تیار نہیں۔

" مامن حادثة ترسم بقلم القضاء فی لوح الزمان الاوفی القرآن العظیم اشارة الیها فهو المشتمل علی خفایا الملک و الملکوت وخبایا قدس الجبروت "

کوئی ایسا واقعہ نہیں جو تقدیر کی قلم سے اس زمانہ کی تختی پر منقش ہوتا ہے کہ وہ قرآن پاک میں موجود نہ ہو یعنی یوں سمجھئے کہ ملک وملکوت کی ہر مخفی چیز اور مالک الملک کے پوشیدہ راز قرآن پاک میں موجود ہیں۔ ابن خلکان نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے کہ سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ نے جب حلب شہر کو فتح کیا تو قاضی محی الدین نے انہیں اپنا قصیدہ بائیہ سنایا جس میں انہوں نے ان فتوحات اور کئی امور کے واقع ہونے کے اوقات لکھے ہوئے تھے قاضی نے اپنے قصیدہ میں ایک شعر یہ بھی سنایا:

وفتحک القلعة الشهباء في صفر مبشر بفتوح القدس فی رجب

یہ رنگ برنگا خوبصورت قلعہ تم پر صفر میں فتح ہوگا اور بیت المقدس کے فتح کی تمہیں رجب کی بشارت ہو

جیسا انہوں نے اپنا قصیدہ پہلے سے لکھا ہوا تھا جسے لوگ جانتے تھے جب فتوحات اسی کے مطابق واقع ہوئیں تو قاضی سے پوچھا گیا تمہیں یہ علم کیسے حاصل ہوا؟ انہوں نے کہا میں نے قرآن پاک کے الفاظ مبارکہ ﴿ الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ﴾ کی تفسیر ابن برجان سے حاصل کئے ہیں مؤرخ کہتے ہیں جب میں نے ابن برجان کی تفسیر کو اسی مقام پر دیکھا تو اس میں ایک طویل حساب سے یہی استنباط کیا گیا تھا جو قاضی نے اشعار میں پیش کیا۔

اور یہ بھی مشہور ہے کہ ابن کمال نے قرآن پاک کی آیت ﴿ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ ﴾ سے استنباط کیا کہ مصر سلطان سلیم کے ہاتھوں فتح ہوگا ایسا ہی ہوا۔

" فالانصاف كل الانصاف التسليم للسيادة الصوفية الذين هم مركز للدائرة المحمدية ماهم عليه واتهام ذهنک السقيم فيما لما يصل لكثرة العوائق والعلائق اليه "

انصاف کامل انصاف یہ ہے کہ صوفیا کرام کو بلند ہستیاں تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ وہ دائرہ محمدیہ کا مرکز ہیں ان سے ہی تو مقام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا پتہ چلتا ہے اگر ان کا مقام تیرے بیمار ذہن میں نہ آئے جس پر کھوٹ، کینہ، حسد، عناد، ضد، ہٹ دھرمی کا زنگ لگا ہوا ہے تو کم از کم صاف ذہنوں والے حضرات کی بات ہی تسلیم کرے۔

واذا لم تر الهلال فسلم لاناس رأوه بالابصار

جب تو نے چاند نہیں دیکھا تو پھر بھی مان لے کیونکہ اور لوگوں نے تو اپنی نظروں سے دیکھ لیا ہے۔

(ماخوذ از روح المعانی ج ص ۷ ۱ ۸)

صوفیائے کرام کے استنباط کی ایک جھلک:

"اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ" رحمٰن نے قرآن سکھایا۔ اس ظاہری معنی کا تو کسی کو انکار نہیں صوفیاء کرام نے یہ معنی تسلیم کرتے ہوئے قرآن پاک کے علوم کے سمندر سے ہیرے، لعل وجواہر نکال کر سمجھایا کہ قرآن پاک علوم کا خزینہ ہے لیکن اسے سمجھنے کے لئے علم، معرفت کے ساتھ ساتھ رب تعالیٰ کا تقرب اور مصطفےٰ کریم ﷺ کی نظر عنایت کا ہونا ضروری ہے۔

صوفیاء کرام فرماتے ہیں۔﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ﴾ سے اس طرف بھی اشارہ ہے کہ بندے پر جب رحمٰن تجلیات ڈالتا ہے تو وہ بندہ لذت رحمانیہ حاصل کرتا ہے اور اسے معرفت قرآنیہ حاصل ہوتی ہے اور اسے یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ رب تعالیٰ کا علم صرف اس کے اسماء اور اس کی صفات سے حاصل ہوسکتا ہے۔

قرآن پاک کا نام چونکہ فرقان ہے جب ﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ﴾ پڑھا تو خود بخود " فرقان " بھی ذہن میں آ گیا۔ جب فرقان کا معنی ہے فرق کرنے والا تو اس سے رب تعالیٰ کے اسماء اور صفات کی مختلف انواع کا پتہ چل گیا جب یہ پتہ چل جائے کہ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات بعض سے مختلف ہیں اور بعض اسماء بعض سے مختلف ہیں تو اسی سے یہ واضح ہوجائے گا کہ رب تعالیٰ کا منعم ہونا اور ہے منتقم ہونا اور اور رب تعالیٰ کی صفت رضاء اور ہے اور صفت غضب اور ہے اسی طرح حدیث قدسی سے اشارہ ملتا ہے رب تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿ سبقت رحمتی غضبی ﴾ میری رحمت، میرے غضب پر سبقت لے گئی۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی صفت میں نقص ثابت نہیں کیا جاسکتا کسی صفت کو گھٹیا نہیں کہا جاسکتا ہاں البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعض صفات کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

" اعوذ بمعافاتک من عقوبتک واعوذ برضاک من سخطک واعوذ بک منک لا احصی ثناء علیک "

تیرے معاف کرنے کی پناہ تیرے عذاب دینے سے اور تیرے رضاء کی پناہ تیری ناراضگی سے تیری پناہ تجھ سے (تیرے غضب سے) تجھ پر جو ثناء کی اسے شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ معافاۃ افضل ہے عقوبت سے، رضاء افضل ہے ناراضگی سے، کیونکہ پناہ فضیلت والی چیز کی پکڑی جاتی ہے۔

"اعوذ بک منک" کا کیا مطلب ہے؟ اگرچہ بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت احدیت میں بھی فرق ہے کیونکہ عرض کیا گیا ہے "تیری پناہ تجھ سے" لیکن یہ فرق مختلف حالات کے لحاظ پر ہے اسی لئے راقم نے بریکٹ میں غضب تحریر کیا ہے۔

ابوسعید رحمہ اللہ کہتے ہیں میں نے اللہ تعالیٰ کو ضدین کے جامع ہونے کی وجہ سے ہی پہچانا کہ وہ بے مثل ذات ہے کہ منعم بھی ہے اور منتقم بھی ہے اور رحمت بھی فرماتا ہے اور غضب بھی، ناراض بھی ہوتا ہے اور راضی بھی۔

اور خاص کر کے نبی کریم ﷺ جو خاتم النبیین اور امام المرسلین ہیں آپ نے قرآن وفرقان کے ذریعے ہر چیز کو بیان فرمایا رب تعالیٰ کے ارشادات بھی اسی پر شاہد ہیں۔ رب نے فرمایا:

"وکل شیء فصلناه تفصیلا" اور ارشاد باری تعالیٰ ہے "مافرطنا فی الکتاب من کل شئی"

قرآن وفرقان سے اور یہ سمجھ آیا:

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن کا معنی جمع ہونا متصل ہونا اور فرقان کا معنی فرق کرنا ان دونوں الفاظ کے معانی سے مقام جمع اور فرق کی طرف اشارہ ملتا ہے اسی لئے بیان کیا گیا ہے کامل بندے کے لئے ان دونوں چیزوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

"من لاتفرقة له لا عبودية له ومن لاجمع له لامعرفة له"

جسے تفریق حاصل نہیں اسے کامل عبودیت حاصل نہیں اور جسے جمع حاصل نہیں اسے معرفت حاصل نہیں

جمع کا مطلب یہ ہے کہ اشیاء کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شہود اور کسی چیز سے پھرنا اور کسی چیز کی طاقت حاصل ہونا صرف اللہ تعالیٰ سے ہی تصور کرنا اس کے بغیر کسی کی طرف تصور نہ کرنا۔ اور ایک مقام ہے جمع الجمع کا وہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو کلی طور پر فناء کے درجہ میں سمجھے صرف اللہ تعالیٰ کی ذات میں اپنے

آپ کو فناء سمجھے اسے ہی مرتبہ احدیت بھی کہتے ہیں۔فرق کے مختلف درجے ہیں۔ پہلا درجہ پرانی رسومات پر قائم رہنا اور مخلوق کا حق تعالیٰ سے اس کے لئے حجاب بننا۔فرق کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی معرفت کے ساتھ مخلوق کی طرف بھی کامل توجہ رہے وحدت کو کثرت میں اور کثرت کو وحدت میں اس طرح دیکھنا کہ کوئی ایک دوسرے کے لئے حجاب نہ بنے۔

فرق الوصف یہ ہے کہ واحد ذات کو اوصاف کے ذریعے جاننا یقیناً ایک وصف دوسرے وصف سے علیحدہ حیثیت رکھتا ہے فرق الجمع یہ ہے کہ ایک ذات میں تکثر ماننا مختلف حالات کے لحاظ سے جس طرح رب تعالیٰ نے خود اسی کو ان الفاظ مبارکہ سے بیان فرمایا:

"کل یوم ھو فی شأن"

فرق الجمع اور فرق الوصف بہت قریب قریب ہیں ان میں معمولی اعتباری فرق ہے۔

(ماخذ از روح المعانی ج ا ص ۱۱)

قارئین کرام توجہ کریں تدبر سے کام لیں کہ صوفیاء کرام کی یہ بحث جو میں نے "الرحمن علم القران" کی تفسیر میں ذکر کی ہے یہ تقریباً چوتھا حصہ ہے ابھی مزید تین حصے اور روح المعانی میں دیکھیں اور خود سمجھ آئے گا کہ اس طرح کی بحثوں سے قران پاک کی عظمت سمجھ آتی ہے اور واضح ہوتا ہے کہ قرآن پاک کے ایک ایک لفظ میں کتنے کمالات پائے جاتے ہیں۔

قرآن پاک پر ایمان کے لئے حدیث پر ایمان ضروری ہے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾

"(اے اللہ تعالیٰ) ہمیں سیدھی راہ چلا"

سیدھی راہ پر چلنا ہی انسان کی کامیابی ہے۔اور دین و دنیا میں ذریعہ نجات ہے سیدھی راہ کا حصول بغیر علم کے ناممکن ہے۔علم کے ذریعے ہی انسان حق و باطل میں تمیز کرسکتا ہے علم مومن کے دل میں نور ہے۔وہی علم دل کو منور کرے گا جس میں نبی کریم ﷺ کی راہنمائی ہوگی ذریعے ہی انسان اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کے احکام کی ہدایت حاصل کرسکتا ہے۔

اگر انسان کو یہ علم بغیر کسی انسان کے حاصل ہو تو وہ علم لدنی کہلائے گا۔ پھر اس کی تین قسمیں ہیں یہ علم وحی کے ذریعے حاصل ہوگا یا الہام کے ذریعے اور یا فراست کے ذریعے۔

وحی : اللہ تعالیٰ کا وہ کلام ہے جو نبی کریم ﷺ کی قلب پر بواسطہ جبرائیل نازل ہو الفاظ بھی رب تعالیٰ کی طرف سے آئیں اور جبرائیل کا واسطہ بھی ہو تو وہ قرآن پاک ہے۔ جبرائیل کا واسطہ نہ ہو اور الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے دل پر القاء ہوں یعنی مقام شھود میں حاصل ہوں تو وہ حدیث قدسی۔ اور معانی و مطالب آپ کو بغیر واسطہ جبرائیل کے حاصل ہوں تو وہ مطلقاً حدیث نبوی ہے۔

الہام: اللہ تعالیٰ کی طرف سے دل میں القاء ہونے والے مطالب الہام ہیں الہام غیر نبی کو بھی ہو سکتا ہے۔

فراست: کچھ چیزوں کے آثار کو دیکھ کر امور غیبیہ پر مطلع ہو فراست کہلاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله" مومن کی فراست سے بچ کر رہو وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

کسبی علم: اگر انسان کسی اور انسان سے علم حاصل کرے تو وہ کسبی علم ہوگا اکثر عوام الناس کا علم کسبی ہی ہوتا ہے۔ شریعت مصطفوی کا علم قرآن پاک و حدیث پاک، اور اجماع امت اور قیاس سے حاصل ہوتا ہے۔

" لا يكمل الاعتصام بالكتاب الابيان كشفه من السنة النبوية "

(مرقاۃ ج ۱ ص ۱۰)

قرآن پاک پر انسان اس وقت تک کامل عمل کر ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ حدیث نبوی کے ذریعے قرآن پاک کی وضاحت نہ پائی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے۔ ارشاد فرمایا:

﴿ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ﴾ لوگوں کی طرف جو (اوامر، نواہی) نازل کیا گیا آپ اسے بیان فرمائیں۔

قرآن پاک میں احکام مجمل ذکر کیے گئے ہیں۔ حدیث پاک میں ان کی وضاحت ہے قرآن

پاک میں نماز کا ذکر ہے لیکن اوقات ،تعداد رکعات ارکان ،شرائط واجبات سنتیں مکروہات ،مفسدات ،حدیث پاک سے ہی ثابت ہیں۔اسی طرح زکوٰۃ کا قرآن پاک میں ذکر ہے۔لیکن زکوٰۃ کی مقدار نصاب کی تفصیل حدیث پاک سے ثابت ہے۔اسی طرح روزہ، حج اور تمام امور شرعیہ کی تفصیل حدیث پاک سے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔

تمام قضایا،احکام دینیہ ،حلال وحرام میں تمیز اور اخروی احوال کی تفصیل قرآن پاک ،حدیث پاک اوراجماع امت سے حاصل کی جائے۔منکرین حدیث کے باطل اقوال کی طرف توجہ کر کے متردد ہونا یاانکار حدیث پاک دین ودنیا کو برباد کرنے کے مترادف ہے۔

حضرت مقدام معد یکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خبردار مجھے قرآن دیا گیا اور اس کے ساتھ اس کی مثل " **الا یوشک رجل شعبان علی اریکته یقول علیکم بھذا القرآن فما وجدتکم فیه من حلال فاحلوا فما وجدتھم فیه من حرام فحرموا ان ماحرم رسول الله کما حرم الله**"(ابو داؤد دارمی، مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)خبردار ایک وقت آئے گا۔

جس میں ایک دولت مند شخص آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر کہے گا تم صرف قرآن پر عمل کرو جو اس میں حلال پاؤ اسے حلال سمجھو اور جو اس میں حرام پاؤ اسے ہی حرام سمجھو(آپ نے فرمایا) حالانکہ اللہ کے رسول نے جس چیز کو حرام کیا وہ ایسے ہی حرام ہے جیسے اللہ نے حرام کیا۔

اس حدیث پاک میں کتنا واضح طور پر فرمایا کہ منکرین حدیث کا پیشوا کیسا شخص ہوگا۔حدیث کے انکار کی ابتداء کرنے والے شخص غلام احمد پرویز کی گلبرگ لاہور میں کوٹھی اور اس کے عیش وعشرت کو دیکھیں تو حدیث پاک کی طرف نظر کریں تو واضح ہوجائے گا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد حرف بحرف سچا ہوا خیال رہے کہ حدیث پاک کا انکار بھی اپنا ٹھکانا جہنم میں بنانا ہے۔اور جھوٹی حدیث بیان کرنا بھی اپنے آپ کو جہنمی بنانا ہے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

"من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعده من النار"

(بخاری مشکوۃ کتاب العلم)

جس شخص نے جان بوجھ کر میری طرف جھوٹ منسوب کیا اس نے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنایا۔ حدیث پاک بیان کرنے والے نبی کریم علیہ السلام کے خلفاء ہیں۔ حضرت ابن عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ بے شک رسول اللہ علیہ السلام ایک دن اپنے حجرہ شریفہ سے نکلے اور آپ نے فرمایا:

" اَللّٰھُمَّ ارحم خلفائی "اے اللہ میرے خلفاء پر رحم فرما۔ ہم نے پوچھا یارسول اللہ آپ کے خلفاء کون ہیں تو آپ نے فرمایا: "خلفاء الذین یرووں سنتی ویعلم منھا الناس" میرے خلفاء وہ لوگ ہیں جو میری سنن واحادیث کو بیان کرتے ہیں اور لوگ ان سے احادیث کا علم حاصل کرتے ہیں۔ بیشک جابر ابن عبداللہ انصاری ایک حدیث کا علم حاصل کرنے کے لئے مدینہ طیبہ سے ایک ماہ کی مسافت طے کر کے گئے۔ (از مرقاۃ ج ۱۰)

حقیقت یہ ہے اگر بڑی متانت سے غور کیا جائے تو یہ سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ بغیر حدیث کے قرآن پاک پر عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ کون کہہ سکتا ہے قرآن پاک میرے سامنے نازل ہوا میں نے جبرائیل کو آتے ہوئے دیکھا، میرے سامنے جبرائیل نے قرآنی آیات کو پڑھا مجھے اللہ تعالیٰ نے خود براہ راست بتایا یہ جبرائیل ہے اسے میں نے بھیجا ہے یہ جو کلام سناتا ہے وہ میرا کلام ہے۔

صحابہ کرام سے لے کر آج تک جب ایسا کوئی شخص نہیں پایا گیا تو حدیث اور قرآن میں اس طرح فرق کرنا جس سے انکار حدیث لازم آئے یہ حماقت، بدبختی اور جہنم میں جانے کے بغیر کچھ نہیں قرآن پاک ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ہی حاصل ہوا صحابہ کرام اور تابعین اور تبع تابعین کے ذریعے ہم تک پہنچا اور حدیث پاک بھی زبان مصطفوی سے ہی حاصل ہوئی اور ہم تک پہنچنے کے ذرائع وہی ہیں جو قرآن پاک پہنچنے کے ہیں۔

حدیث بحیثیت حدیث اس طرح واجب العمل ہے جس طرح قرآن پاک ہے فرق صرف یہ ہے کہ قرآن پاک تواتر سے پہنچا لیکن احادیث تواتر، شہرت، احاد سے منقول ہیں پھر صحیح، حسن، ضعیف وغیرہ قسمیں صرف راویوں کے حالات سے بنیں ورنہ احادیث میں ذاتی طور پر کوئی تقسیم نہیں۔

یہ بھی خیال رہے کہ اگر کسی ایک راوی کے متعلق بعض اہل علم نے غیر ثقہ ہونے کے متعلق کہا ہے اور دوسرے اہل علم نے اسے ہی ثقہ کہا ہے تو وہ مطلقاً غیر ثقہ کے زمرے میں نہیں آ سکتا۔

اگر معاذ اللہ نبی کریم ﷺ گناہگار ہوتے اپنی خواہشات کے مطابق مسائل گھڑتے تو احادیث کے انکار کا کوئی پہلو نکلتا جب تمام انبیاء کرام نبوت سے پہلے اور بعد صغائر اور کبائر گناہوں سے پاک ہوتے ہیں۔اور دین اپنی خواہشات کے مطابق نہیں گھڑتے تو انبیاء کرام کے اقوال وافعال کا انکار کیسے؟

خصوصاً نبی کریم ﷺ کے متعلق رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى ﴾

(پ ۲۷)

اور وہ کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے وہ تو نہیں کرتے مگر جو انہیں وحی کی جاتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اگر اجتہاد سے کوئی کلام فرمایا تو اس میں اللہ تعالیٰ کا اذن ہوتا اور اس اجتہاد کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لی ۔حضور ﷺ کا اجتہاد اپنی خواہشات کے مطابق نہیں ہوا کرتا تھا۔ بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا خوشنودی ہوتی ۔یعنی آپ کا اجتہاد منشاء ایزدی ہوتا۔اسی مضمون کو علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں ۔

"ان الله اذا سوغ له عليه الصلوة والسلام الاجتهاد كان الاجتهاد ما يسند اليه وحيا لا نطقا عن الهوى"

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات لکھا کرتے تھے یعنی آپ کے ہر قول کو لکھ لیا کرتے تھے۔تو کچھ قریش نے کہا کہ حضور ﷺ کبھی کلام غصہ کے حال میں فرماتے ہیں آپ بھی انسان ہیں۔تم آپ کے ہر قول کو نہ لکھا کرو تو انہوں نے لکھنا بند کر دیا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی عرض کر دیا کہ میں نے کچھ لوگوں کے کہنے پر آپ کے ارشادات کو لکھنا بند کر دیا ہے جب کہ پہلے لکھا کرتا تھا تو آپ نے فرمایا:

" اكتب فوالذى نفسى بيده ماخرج منى الا الحق "

اے عبداللہ تم میری ہر بات کو لکھ لیا کرو اس ذات کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے۔میری زبان سے کبھی کوئی بات حق کے سوا نہیں نکلی۔

(از ضیاء القرآن)

حقیقت یہی ہے کہ اہل ایمان کے لئے قرآن پاک کے ساتھ ساتھ احادیث نبویہ کو تسلیم کرنا اور ان پر عمل کرنا ضروری ہے۔

قول حق قرآن ہے قول پیغمبر ہے حدیث
اہل دل کے سامنے تقریر ہے دونوں کی ایک

اس نے پھیرا دل اور اس نے دعوت ایمان دی
وہ خدا اور یہ نبی تدبیر ہے دونوں کی ایک

نجوم الفرقان:

راقم اپنی کاوش کو ''نجوم الفرقان'' کے نام سے موسوم کر رہا ہے۔ دعاء ہے اللہ تعالیٰ اسے شرف قبولیت عطاء فرمائے کوئی لغزش ہو جائے تو اسے معاف فرمائے۔ ابھی تک تو صرف سورۃ فاتحہ کی تفسیر ختم کی ہے مقدمہ بعد میں ساتھ ملا رہا ہوں یعنی یہ مقدمہ الحاقیہ ہے کوشش اور ارادہ یہی ہے کہ جہاں تک صحت اور زندگی اجازت دے قرآن پاک کی خدمت کو جاری رکھوں۔

نجوم الفرقان لکھنے کا خیال کیوں ہوا:

کئی احباب نے تفسیر لکھنے کے متعلق ارشاد فرمایا۔ خصوصا میرے اپنے گاؤں کہ حافظ محمد رستم خان خطیب مسجد جیلانیہ اسلام آباد، اور مولانا ضمیر احمد ساجد خطیب مسجد سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے اپنے مطالبہ کو کئی مرتبہ دہرایا۔

ان کے دو مرتبہ مطالبہ کے بعد میرے مخلص، مہربان، استاذ الاساتذہ محقق و مدقق حضرت علامہ مولنا عبد الرشید قریشی صاحب مدرس جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی نے بھی تفسیر لکھنے کا حکم فرمایا۔

لیکن میں اس عظیم کام کا اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا تھا اسی وجہ سے کافی دیر اسی غور و خوض میں ہو گئی۔ کہ میرے جیسا کم علم انسان کیا اتنا عظیم کام کر سکے گا یا نہیں۔

میری کتاب تذکرۃ الانبیاء کو دیکھ کر گوجرانوالہ سے ایک مولانا صاحب مجھے ملنے کی غرض سے جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی میں تشریف لائے لیکن میں وہاں سے چھٹی کر کے اسلام آباد اپنی رہائش گاہ میں آ چکا تھا۔وہ ایک عزیز طالب علم نصیر الدین کو ساتھ لے کر اسلام آباد آ گئے۔

انہوں نے بھی تفسیر لکھنے کے متعلق فرمایا خیال رہے کہ میں مولانا صاحب کے اسم گرامی کو تو بھول گیا ہوں لیکن ان کے اخلاق حسینہ کو نہیں بھولا۔ان تمام ارشادات کی تعمیل پر عمل کرنے میں جہاں رکاوٹ کم علمی تھی وہاں یہ بھی خیال آ رہا تھا کہ تفسیر نعیمی کے آٹھ پارے حضرت علامہ مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ کی علمی، تحقیقی تفسیر ہے اس سے آگے آپ کے صاحبزادہ اقتدار احمد خان صاحب کی بھی بہتر تفسیر ہے مجھے بولنے کا کچھ سلیقہ ہی تفسیر نعیمی سے آیا اس تفسیر کے ہوتے ہوئے۔اور مفکر اسلام حضرت علامہ پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ کی عظیم تفسیر ضیاء القرآن کے ہوتے ہوئے اور حضرت علامہ ابوالحسنات رحمہ اللہ کی تفسیر حسنات کے ہوتے ہوئے میرا تفسیر لکھنا کس مقصد کے پیش نظر ہوگا۔وہ مقصد یوں سامنے آ گیا کہ ایک مرتبہ کمال مہربانی فرماتے ہوئے استاذی المکرم حضرت مولانا عبد الحکیم شرف قادری مدظلہ العالی غریب خانہ میں تشریف لائے۔تو آپ نے دوران گفتگو فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ میں قرآن پاک کی خدمت کروں کیونکہ جس کتاب کو سمجھنے کے لئے ہم کتنے ہی علوم کتنے سالوں میں پڑھتے ہیں۔اس کا بھی تفصیلی مطالعہ کرنا چاہئے۔گویا کہ آپ کا مطلب یہ تھا کہ جب تک قرآن پاک کی تفسیر لکھنی نہ شروع کی جائے اس وقت تک تفصیلی طور پر تفاسیر کا مطالعہ نہیں ہوسکتا۔آپ کے اسی ارشاد سے میرے دل میں بھی تفاسیر کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو گیا۔لیکن پھر بھی تحریر کی طرف آتے ہوئے ڈر محسوس ہو رہا تھا۔دل کو تسلی دیتا پھر ارادہ بدل لیتا۔

تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ''المصطفیٰ ویلفیر سوسائٹی ایف سکس ون اسلام آباد'' میں مجھے درس قرآن کے لئے مدعو کیا گیا وہاں سٹیج سیکرٹری رانا گل نواز صاحب نے میرا تعارف کراتے ہوئے یہ بھی کہا کہ یہ آج کل قرآن پاک کے حاشیہ کا کام کر رہا ہے۔اگرچہ میں نے اپنے درس کی ابتداء میں ہی کہہ دیا کہ قرآن پاک کے حاشیہ کا کام میں نہیں کر رہا بلکہ یہ ایک تصوراتی خاکہ ہے لیکن میں نے اپنے لئے اس اعلان کو نیک فال سمجھتے ہوئے جمعہ کو درس تھا پیر کو بوقت سحر اس نیک کام کا آغاز کر دیا صحت

وزندگی کہاں تک ساتھ دیتی ہیں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

اگرچہ عزیزم مولانا محمد اسحٰق ظفر صاحب بار بار یہ کہہ رہے ہیں کہ تفسیر پر کچھ بزرگ کام کر چکے ہیں کچھ کر رہے ہیں کچھ کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں تم درس نظامی کی نصابی کتب ہدایہ ودیگر عربی کتب پر حواشی وشروحات لکھو کیونکہ اس سے پہلے میں تلخیص المفتاح ،نور الایضاح ،قدوری اور کنزالدقائق پر عربی حواشی تحریر کر چکا ہوں۔

مولانا محمد اسحٰق ظفر صاحب مدرس جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی کا یہ مطالبہ کرنا کہ درسی کتب پر عربی حواشی تحریر کرنا بنسبت اردو تفسیر کے زیادہ ضروری ہے بہت وزن رکھتا ہے تاہم میرا تفاسیر کے مطالعہ کا شوق اور ذریعہ نجات کی امید بھی ایک بلند حیثیت رکھتے ہیں ۔ صرف ہدایہ کا حاشیہ بھی ایک دن کا کام نہیں کم ازکم چار سال کا تقاضا کرتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کام وہی ہوگا جو رب تعالیٰ کو منظور ہوگا۔جو کام بھی ہوا مسلک کو فائدہ ہوگا دل تو چاہتا ہے کہ بہت کام کروں لیکن صحت اجازت نہیں ۔یہ یقین جانئے کہ میں تصنیف کا کام خود اپنی سوچ اور اپنے ہاتھ سے کرتا ہوں۔کسی سے تعاون حاصل نہیں کرتا۔پروف ریڈنگ کی صرف دوست احباب سے معاونت طلب کر لیتا ہوں تحریر ایک اعصاب شکن کام ہے لیکن مسلک اور دین کی خدمت سمجھ کر کام کرتا رہتا ہوں۔

اظہار تشکر:

اصل میں سب سے بڑا کام تفاسیر کا حصول تھا کیونکہ جامعہ رضویہ کی لائبریری اگرچہ بہت بڑی ہے لیکن اس سے نفع حاصل کرنا میرے لئے اس وجہ سے ممکن نہیں کہ جامعہ کا قانون یہ ہے کہ ہر وہ کتاب جس کا ایک ایک نسخہ ہے وہ باہر جاری نہیں ہوسکتی بلکہ جامعہ کی لائبریری میں بیٹھ کر ہی اس سے فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔میں چونکہ تصنیف کا کام زیادہ طور پر سردیوں میں سحری کے وقت کرتا ہوں۔رہائش اسلام آباد ہے اس وقت لائبریری سے کیسے نفع حاصل کروں۔تصنیف کا کام میں اپنی

ذاتی کتب کی امداد سے کرتا ہوں۔یا برادرم مولنا عبد الرشید صاحب مہربانی فرماتے ہیں لمبے وقت کے لئے کتب مطالعہ کے لئے عنایت فرماتے ہیں یہ ان کی مہربانی ہے۔

میرے پاس یہ تفاسیر ہیں۔مفاتیح الغیب المعروف بالکبیر للرازی، روح المعانی، تفسیر ابی السعود، مدارک التنزیل للنسفی، جلالین، مظهری، زبدة التفسیر خلاصه فتح القدیر، ضیاء القرآن، الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، بیضاوی سورة بقره، حاشیه شیخ زاده سورة بقره، نعیمی سولہ پارے، شیعہ حضرات کی تفسیر قمی۔

مولانا عبد الرشید صاحب نے فراہم کیں۔احکام القرآن للجصاص، تفسیر ابن عربی، تفسیر عزیزی، صاوی، حقانی، مختصر تفسیر ابن کثیر للصابونی، معارف القرآن

عزیزم مولانا سکندر حیات نے حاشیة الشهاب علی البیضاوی، مولوی محمد محمود احمد نے تفهیم القرآن عزیزم عظمت شاہ نے تبصیر الرحمن اور قاری محمد یعقوب صاحب نے ڈاکٹر غلام مرتضی کی انوار القرآن فراہم کیں (انوار القرآن کو علمی تفسیر نہیں پایا تقریباً ایسا ہی پایا جیسا کہ کوئی شخص بزعم خویش اپنے آپ کو علامہ سمجھے اور دوسرے علماء کو جاہل لیکن اس کی تحریر وتصنیف سے اس کی علمیت کا پتہ نہ چلے) تفسیرات احمدیہ مولانا عبد الحمید صاحب نے عطا کی۔جواہر طنطاوی جامعہ کی لائبریری سے حاصل ہوگئی۔میرے زیر انتظام چلنے والے جامعہ جماعتیہ مہر العلوم شکریال راولپنڈی کے مدرس مولانا سمیع الدین صاحب نے الحسنات اور در منثور جس کے حاشیہ پر تفسیر ابن عباس بھی ہے عطا کیں تاہم مولنا ابو الحسنات رحمہ اللہ نے الحسنات کے مقدمہ میں ذکر کیا کہ افسوس تفسیر ابن عباس اصلی حالت میں آج موجود نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

میرے جامعہ کے ہی مدرس مولانا ضیاء الحق قریشی صاحب نے اپنے رشتہ دار میرے مہربان مولنا حبیب الرحمٰن صاحب آف سہال سے کچھ کتابیں جامعہ کے لئے لائیں۔جو انہوں نے جامعہ کو بطور ہدیہ دیں۔ان میں تفسیر خازن اور تفسیر ابن کثیر اور صدیق بھوپالوی کی فتح البیان تھیں۔

اس طرح مذکورہ بالا تفاسیر کا مطالعہ شروع کر دیا ہے۔اللہ تعالیٰ حق سمجھنے اور لکھنے کی توفیق عطا فرمائے تمام تعاون کرنے والے حضرات کا شکر گزار ہوں اللہ تعالیٰ ان کو جزاء خیر عطا فرمائے۔

جامعہ کا ذکر آ گیا تو اس ضمن میں بھی دعاء کرنا ضروری سمجھا کہ اللہ تعالیٰ جامعہ جماعتیہ مہر العلوم کے ابتدائی بانی وسرپرست حاجی غلام احمد صاحب اور حاجی حبیب الرحمٰن صاحب (شکریال) اور اپنے دوست احباب علماء کرام اور اپنے محلّہ ایف سکس ون اسلام آباد کے مہربان حضرات کے دین ودنیا کو بہتر بنائے ان کو نیک مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔

نجوم الفرقان میں ترجمہ:

پہلا ترجمہ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ہے اور دوسرا ترجمہ راقم کا لیکن راقم کا ترجمہ زیادہ طور پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی نقل ہی رہے گا ممکن ہے کہیں کہیں حضرت علامہ پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ علیہ کے ترجمہ سے نقل کرنے کی ضرورت درپیش آجائے یا مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ اور علامہ احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ کے ترجمہ سے نقل کرنا پڑے۔ یوں سمجھیں کہ راقم کے ترجمہ میں انداز راقم کا اپنا ہوگا ترجمہ مذکورہ بالا تراجم میں سے کسی ایک سے حاصل ہوگا۔

نجوم الفرقان کو سمجھنے کے لئے:

☆ جس آیت کے متعلق وضاحت کی جارہی ہوگی اسی کے ضمن میں اگر کسی تفسیر سے مطلب حاصل کیا جائے گا تو اس پر جزء نمبر اور صفحہ نمبر لکھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اگر کوئی حوالہ اس جگہ سے ہٹ کر ہوگا تو پھر ضرورت ہوگی کہ جزء اور صفحہ کا نمبر دیا جائے۔

☆ فقہ کی کتب کے عربی حواشی میں، میں نے بعض جگہ دو تین کتب کی عبارات کو جوڑ کر ایک عبارت تیار کی تو وہاں آخر میں، میں نے ان کتابوں کا نام ایک ہی بریکٹ میں تحریر کر دیا ہے۔ ممکن ہے وہ صورت یہاں بھی درپیش آجائے۔

☆ جب کسی تفسیر سے مطالب حاصل کرتا ہوں تو آسانی کے لئے میں اس پر کوئی نہ کوئی عنوان قائم کر دیتا ہوں۔ اگر دو تین عنوانات کے بعد کوئی حوالہ آ رہا ہو۔ تو پہلے عنوانات کا حوالہ بھی وہی سمجھا جائے۔

☆ جہاں ''ماخوذ از یا ''از '' تحریر ہوگا (جیسے ماخوذ از کبیر۔ یا۔ از کبیر) وہاں یہ سمجھیں کہ اس تفسیر

سے مطلب تو حاصل کیا گیا ہے لیکن لفظی ترجمہ نہیں بات کو سمجھانے کے لئے آسان طریقہ قائم کیا گیا ہے۔ یقیناً اس میں کمی وبیشی بھی ہوگی تاہم کوشش یہی رہی اور یہی رہے گی۔ ان شاء اللہ کہ اس تفسیر کا مطلب نہ بدلنے پائے۔

☆ مفسرین کے اختلافات کو نہیں بیان کیا جارہا۔ کسی ایک تفسیر کو صرف ذہن میں بٹھا کر دوسری تفاسیر کو رد کرنے کا بفضلہٖ تعالیٰ کوئی ارادہ نہیں۔ مختلف تفاسیر کو مطالعہ کرنے کے بعد جو بات ذہن قبول کرے گا اسے ہی انشاء اللہ نقل کیا جائے گا یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ علامہ آلوسی نے کیا لکھا اور علامہ رازی نے کیا لکھا۔

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جن لوگوں کو تفسیر کبیر سمجھ آتی ہے وہ تو کبیر کو واقعی کبیر سمجھتے ہیں جن کو نہیں سمجھ آتی وہ صدیق بھوپالوی کی طرح یہی راگ الاپتے ہیں۔ " فیه کل شئی الا التفسیر "اس میں ہر چیز کا ذکر ہے سوائے تفسیر کے۔ دراصل ان لوگوں کو یہ کہنے کی ضرورت اس لئے درپیش آتی ہے کہ تفسیر کبیر کے ہوتے ہوئے شان انبیاء کرام میں ان کو حملہ کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اگر ایسی ناپاک جسارت کریں تو پہلے کبیر کے متعلق اپنے دل کی بھڑاس نکالیں گے پھر کہیں گستاخانہ کلمات ناپاک قلم سے معرض تحریر میں لائیں گے۔

محترم شاہ عبد الحق ابن پیر شاہ تراب الحق مد ظلھما نے ایک مرتبہ برادرم قاری محمد آصف صاحب کے ذریعے راقم کی طرف پیغام بھیجا کہ کبیر سے نکات ایک کتابی شکل میں جمع ہوجائیں لیکن میں نے کہا کہ جب تک کبیر کا مکمل اور وسیع مطالعہ نہ کیا جائے ایسا ممکن نہیں پتہ یہ چلا کہ جن کو کبیر سمجھ آتی ہے وہ صدیق بھوپالوی جیسے لوگوں کے جال میں نہیں پھنستے۔

☆ میں نے اپنی تصنیفات میں حضرت علامہ پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ کے ساتھ عقیدت کے پیش نظر اور تفسیر ضیاء القرآن کو عظیم سمجھتے ہوئے جابجا اس کے لمبے لمبے اقتباسات پیش کئے۔ لیکن تفسیر میں ارادہ یہی ہے کہ بغیر کسی مجبوری کے ضیاء القرآن کی لمبی عبارت نہ پیش کی جائے تاکہ اس کی حسین عبارات اور اس کا حسن وجمال اسی کے ساتھ قائم رہے۔ تاہم ان شاء اللہ حصول برکت کے لئے چھوٹے چھوٹے اقتباسات پیش کرنے کا ارادہ ہے۔

☆ جن عربی، فارسی تفاسیر سے میں خود مسائل کو استنباط کروں گا وہی مسائل کسی اور اردو تفسیر میں بھی ہوئے اور یقیناً ہونے ہی ہیں وہ نقل نہیں ہوگی۔

☆ اگر کسی اردو تفسیر سے ہی وہ مسئلہ لیا گیا تو ان شاء اللہ اس کا حوالہ ضرور دیا جائے گا۔ وہ حوالہ دینے میں اپنے بزرگوں کے نام لکھنے میں اعزاز ہوگا اور برکت ہوگی اور سلف صالحین کی یاد ہوگی۔

☆ مسلک کے لحاظ پر کسی عالم سے اگرچہ تعلق نہ بھی ہو لیکن جب ان حضرات کو کسی تفسیر یا حاشیہ وغیرہ سے کچھ ذکر کیا تو ان شاء اللہ حوالہ ضرور دیا جائے گا۔

☆ اللہ کے فضل وکرم سے میں نے اپنی کسی تصنیف میں بھی کسی قول کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا۔

☆ میں مجتہد نہیں ہوں بلکہ سلف صالحین کے ارشادات کو نقل کر کے جمع کرتا رہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سلف صالحین کی تفاسیر کو صحیح سمجھنے اور صحیح لکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆ جو شخص سلف صالحین سے ہٹ کر بزعم خویش اپنے دور کا بے مثل اور مجتہد اعظم بنا وہ دراصل سر کے بل گرا، بھٹکا لوگوں کو اس نے بھٹکایا۔

آج ﴿ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ ﴾ کی بحث میں الجھانیوالے اہلسنت وجماعت کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنیوالے اغیار کو فائدہ پہنچانیوالے بھی اسی قسم کے مجتہد اعظم ہیں۔

راقم کی پہچان:

راقم نے نور الایضاح کے عربی حاشیہ ذریعۃ النجاح کے ابتدائیہ میں اپنا اور اپنے خاندان اور اپنے مشائخ اور اپنے اساتذہ اور جن حضرات کے مدارس میں بحیثیت مدرس کام کیا (ان تمام) کا اجمالی تذکرہ کیا تھا۔ اب خیال تھا کہ کچھ تفصیلی طور پر ذکر کر دوں کہ مجھے میری اپنی حیثیت سے کم دیکھا جائے بلکہ میرے بزرگوں کی نسبت (خواہ حسب ونسب سے ہو یا تعلم کی حیثیت سے ہو یا ارادت کے طور پر) سے دیکھا جائے۔

لیکن ۲۶ نومبر ۲۰۰۰ء کو اپنے شیخ کامل حضرت پیر سید غلام محی الدین اور سید الاولیاء حضرت پیر مہر علی شاہ رحمہما اللہ گولڑوی کے مزار پرانوار دربار گہر بار پر حاضر ہونے کا اتفاق ہوا وہاں محفل سماع میں شریک ہوا ایک شعر سن کر ذہن وضمیر نے یہی کہا کہ تیری یہی پہچان، یہی تعریف کافی ہے۔ ہاں ہاں

یہ راہنمائی کیوں نہ ملتی میرے شیخ اب بھی میری راہنمائی کرر ہے ہیں گویا کہ آپ نے مجھے یوں کہا اے ناکارہ انسان تو اپنی پہچان اسی شعر سے کرادے یہی کافی ہے:

میں نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکوں میں وہ مشت غبار ہوں

(عبدالرزاق بھترالوی حطاروی)

☆☆☆☆☆

﴿اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ﴾

''اللہ کی پناہ شیطان مردود سے''

اعوذ: مشتق ہے عوذ سے، اس کے دو معنی ہیں:

(۱) التجاء واستجارہ (پناہ پکڑنا) (۲) التصاق (ملنا) کہا جاتا ہے۔ " اطیب اللحم عوذہ " اچھا گوشت وہ ہے جو ہڈی سے ملا ہوا ہے پہلی صورت میں معنی ہوگا اللہ کی پناہ یعنی " التجیٔ الی رحمة اللہ وعصمته " میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اسی کی طرف سے عصمت (بچاؤ کا سہارا لیتا ہوں)۔

دوسری صورت میں معنی ہوگا۔" التصق نفسی بفضل اللہ وبرحمته " میں اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے ملا رہا ہوں۔

الشیطان: اس میں دو قول ہیں۔ (۱) یہ مشتق ہے " شطن " سے جس کا معنی ہے دوری عام طور پر کہا جاتا ہے "شطن دارک "تمہارا گھر دور ہے۔

اس معنی کے لحاظ پر ہر سرکش کو شیطان کہا جائے گا خواہ وہ جن ہو یا انسان یا حیوان کیونکہ وہ سیدھی راہ سے دور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ﴾

(اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن کئے ہیں انسانوں اور جنوں میں سے شیطان)۔

" فجعل من الانسان شیاطین " انسانوں میں سے شیطان بنائے گئے ہیں یعنی سیدھی راہ سے دور انبیاء کرام کے دشمن خواہ انسانی شکل میں نظر آئیں وہ درحقیقت شیطان ہی ہیں۔

الرجیم: اس کا معنی ہے، مرجوم، یعنی فعیل بمعنی مفعول ہے۔ جس طرح کہا جاتا ہے کف خضیب ای مخضوب رنگی ہوئی ہتھیلی۔ اسی طرح کہا جاتا ہے "رجل لعین ای ملعون " یعنی لعنت کیا ہوا شخص۔

مرجوم ہونے میں دوصورتیں ہیں۔

(۱) مرجوم ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر لعنت کی گئی ہو۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّکَ رَجِیْمٌ﴾ یہاں سے (جنت سے) نکل جا بیشک تو مردود ہے اسی معنی میں یعنی زبان سے لعن وطعن کرنے میں یہ ارشادات گرامیہ بھی استعمال ہیں۔

﴿ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّکَ ﴾

﴿ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ یٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِیْنَ ﴾

﴿ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ ﴾

(۲) شیطان کو اس لئے مرجوم کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اسے گرزوں سے ہانک کر آسمانوں سے نکال دیتے ہیں اس معنی کے لحاظ پر بھی ہر سرکش شریر پر رجیم کا اطلاق ہوگا کہ اسے ہاتھوں اور آلات سے بھگایا جاتا ہے رجیم کا معنی جب اردو میں مردود کیا جائے گا تو ان دونوں معنوں کو شامل ہوگا۔

تعوذ پڑھنے کا حکم : اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴾ (النحل ۹۸)

''تو جب تم قرآن پڑھو تو اللہ کی پناہ مانگو شیطان مردود سے''

﴿ وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴾

(الاعراف ۲۰۰)

'' اور اے سننے والے اگر شیطان تجھے کوئی کونچا دے (وسوسہ ڈالے) تو اللہ کی پناہ مانگ بے شک وہی سننے والا جاننے والا ہے''

سورۃ حم السجدۃ میں بھی یہی آیت ہے صرف اس کے آخری الفاظ یہ ہیں '' اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْم ''۔

﴿ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ ﴾ (المؤمنون ۹۷)

''اور تم عرض کرو اے میرے رب تیری پناہ شیاطین کے وسوسوں سے''

تعوذ پڑھنے کا ثبوت احادیث سے:

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دو شخص نبی کریم ﷺ کے پاس ایک دوسرے کو گالی دینے لگے ان میں سے ایک شخص بہت غضب میں ہوا یہاں تک کہ خیال کیا جاتا کہ شدید غصہ سے اس کی ناک پھٹنے لگی ہے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" انی لا علم کلمة لو قالها لذهب عنه ما یجد من الغضب فقال ما هی یا رسول الله قال یقول اللهم انی اعوذ بک من الشیطان الرجیم "

کہ میں ایک کلمہ جانتا ہوں اگر یہ شخص وہ پڑھے تو اس کا غصہ جاتا رہے۔ تو آپ سے پوچھا گیا یارسول اللہ وہ کون سا کلمہ ہے تو آپ نے فرمایا وہ یہ پڑھے:

" اللهم انی اعوذ بک من الشیطن الرجیم " اے اللہ بے شک مجھے تیری پناہ شیطان مردود سے۔

اس میں فائدہ یہ ہے کہ انسان کو چونکہ معلوم ہے کہ وہ اس جہان کے مصالح (بہتر کام) اور مفاسد (بربادی والے کام) کو بہت کم ہی جانتا ہے۔ وہ تھوڑا علم اپنی عقل کی مدد سے حاصل کرتا ہے اور غضب کے وقت اس کی عقل زائل ہوجاتی ہے غصہ کے حال میں جو کام کرتا ہے یا جو بات کہتا ہے وہ قانون، اعتدال سے ہٹ کر ہوگی۔ جب عقل میں غصہ خلل انداز ہوگیا اور اپنے قول وفعل پر اعتماد نہ رہا تو ضروری ہے کہ خیرات کے حصول اور آفات سے بچاؤ کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہوئے کہے " اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم "

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ انسان جب کسی دوسرے سے لڑتا ہے تو دونوں کو یقینی طور پر کوئی علم حاصل نہیں ہوتا کہ کون حق پر ہے اس لئے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کی سپرد کرتے ہوئے " اعوذ باللہ " پڑھے کہ اے اللہ اگر میں حق پر ہوں تو میرے خصم (مدمقابل) کو یہ توفیق عطا فرما کہ وہ میرے حق پر ہونے کا اعتراف کرے مجھے میرے حقوق دے دے اور مجھ پر کوئی ظلم نہ کرے اور اگر میرا مدمقابل حق پر ہے تو اے اللہ تعالیٰ مجھے یہ توفیق عطا فرما کہ میں اس کے حقوق کی پاسداری کرسکوں اور کسی قسم کا اس پر ظلم نہ کروں۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ انسان کو جب غصہ آتا ہے تو وہ اپنے آپ کو بڑا بہادر اور قوی سمجھتا ہے۔ چاہتا یہ ہے کہ میں اپنے مدمقابل کو اپنی گرفت میں لے لوں اس پر قہر وغضب کروں اسے چیر پھاڑ دوں۔ لیکن جب وہ یہ خیال کرے کہ اللہ تعالیٰ مالک کائنات مجھ سے زیادہ قوت اور قدرت کا مالک ہے میرے گناہ عیوب بار بار دیکھنے کے باوجود مجھے معاف کر رہا ہے تو اسے یقیناً یہ بھی خیال آئے گا کہ مجھے بھی اس شخص کو معاف کرنا چاہئے کیونکہ مجھے تو یہ بھی یقین نہیں کہ حق پر کون ہے جب کہ رب تعالیٰ میرے حق پر نہ ہونے اور گناہ کرنے کے باوجود معاف فرما رہا ہے تو میں کیوں نہ معاف کروں۔

حضرت معقل ابن یسار رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا:

" من قال حين يصبح ثلاث مرات اعوذ بالله من الشيطن الرجيم وقرأ ثلاث آيات من آخر سورة الحشر وكل الله به سبعين الف ملك يصلون عليه حتى يمسي فان مات في ذلک اليوم مات شهيدا ومن قولها حين يمسي كان بتلک المنزلة "

" جس شخص نے صبح کے وقت تین مرتبہ " اعوذ بالله من الشيطن الرجيم " پڑھا اور اس کے بعد سورۃ حشر کی آخری تین آیات کی تلاوت کی اللہ تعالیٰ اس پر ستر ہزار فرشتے مقرر کر دیتا ہے جو شام تک اس کے لئے دعاء رحمت کرتے رہتے ہیں اگر اس شخص کی اسی دن وفات ہوگئی تو اسے شہید کی وفات حاصل ہوئی۔ اور اگر کوئی شام کو پڑھے گا تو صبح تک اسے یہی مرتبہ حاصل رہے گا "۔

حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ انسان جب " اعوذ بالله " پڑھے گا تو اسے اپنا کامل طور پر عاجز ہونا سمجھ آئے گا اور کامل طور پر اپنی کوتاہیوں کو جان لے گا۔ اور سورۃ حشر کی آخری تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی صفات کا ذکر ہے اس لئے ان کو پڑھنے سے اللہ تعالیٰ کے کمال و جمال اور عظمت کا مشاہدہ حاصل ہو گا۔ انسان کو عبودیت میں کامل مقام ان دو چیزوں کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔

یعنی انسان دراصل وہی انسان ہے جو اللہ تعالیٰ کے عبادت کرنے اور اپنے عجز میں کامل درجہ رکھتا ہو اور یہ مقام اس وقت تک نہیں حاصل ہوسکتا جب تک انسان کو اپنے عاجز ہونے اور رب تعالیٰ

کے بزرگ ترین ہونے کا علم حاصل نہ ہو۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" من استعاذ فی الیوم عشر مرات وکل اللہ تعالیٰ بہ ملکا یذود عنہ الشیطان "

جس شخص نے دن میں دس مرتبہ " اعوذ باللہ " پڑھا اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک فرشتہ مقرر کر دیتا ہے جو اس شخص سے شیطان کو دور رکھتا ہے۔

انسان جب " اعوذ باللہ " پڑھے گا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ مجھے خود کوئی طاقت اور علم حاصل نہیں جو کچھ حاصل ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے حاصل ہے جب یہ بات اسے سمجھ آئے گی تو شیطان بھی اسے وسوسہ نہیں ڈال سکے گا کیونکہ وہ اعتراف کر چکا ہے کہ اے اللہ تیرے نیک بندوں کو میں راہِ راست سے بھٹکا نہیں سکوں گا اور اس شخص پر بڑے شیطان یعنی نفس امارہ کا داؤ بھی نہیں چل سکے گا۔

☆ خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" من نزل منزلا فقال اعوذ بکلمات اللہ التامات من شر ما خلق لم یضرہ شئی حتی یرتحل من ذلک المنزل "

" جو شخص کسی جگہ پر قیام کرے تو یہ پڑھے " اعوذ بکلمات اللہ التامات من شر ما خلق " تو اسے کوئی چیز نقصان نہیں پہنچائے گی یہاں تک کہ وہ اس جگہ سے کوچ کر جائے "۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ واضح ہے کہ روحانی شخصیات زیادہ ہیں جسمانی شخصیات سے کیونکہ آسمان پاک ارواح سے بھرے ہوئے ہیں جس طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" اطت السماء وحق لھا ان تئط ما فیھا موضع قدم الا وفیہ ملک قائم او قاعد "

آسمان چر چرایا اور اس کا حق ہے کہ چر چرائے کیونکہ اس میں ایک قدم رکھنے کی جگہ بھی نہیں مگر یہ کہ اس میں کوئی نہ کوئی فرشتہ کھڑا یا بیٹھا ہے یعنی عبادت کر رہا ہے۔

☆ عمرو بن شعیب اپنے باپ، دادا سے روایت کرتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب

تم میں سے کوئی شخص نیند میں ڈرے تو یہ پڑھے:

" اعوذ بکلمات الله التامة من غضبه وعقابه وشرعباده ومن شر همزات الشياطين وان يحضرون "

......ان الفاظ کو پڑھنے سے (اس کا ڈر جاتا رہے گا) اور اسے کوئی نقصان نہیں ہوگا حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جب بھی کوئی غلام بالغ ہوتا آپ اسے یہی کلمات سکھاتے تا کہ وہ پڑھے:

"ومن لم يبلغ كتبها فی صک ثم علقها فی عنقه"

اور جو بالغ نہ ہوتا تو آپ کسی کاغذ پر لکھ کر اسکے گلے میں ڈال دیتے تھے۔ صحابی رسول اللہ ﷺ کے فعل سے تعویذ لکھ کر گلے میں ڈالنا ثابت ہے اسی پر اہل علم، اہل تقوی کا آج بھی عمل ہے۔

☆ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ حضرت امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کے لئے ان الفاظ سے تعوذ پڑھتے:

" اعيذ كما بكلمات الله التامة من كل شيطن وهامة ومن كل عين لامة "

اور آپ فرماتے کہ میری جد امجد ابراھیم علیہ السلام بھی ان الفاظ سے ہی حضرت اسماعیل اور حضرت اسحٰق علیہما السلام کے لئے تعوذ پڑھتے۔

☆ حضرت سوید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو منبر پر یہ پڑھتے ہوئے سنا " اعوذ بالله من الشيطن الرجيم " اور آپ نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے " اعوذ بالله من الشيطن الرجيم " پڑھتے ہوئے سنا۔ " فلا احب ان اترک ذلک مابقيت " میں نہیں چاہتا کہ ان الفاظ کو پڑھنا چھوڑ دوں جب تک میں زندہ ہوں۔

☆ نبی کریم ﷺ اکثر اوقات میں تعوذ ان الفاظ سے پڑھتے تھے:

" اعوذ برضاک من سخطلک واعوذ بعفوک من غضبک واعوذ بک منک "

تعوذ پڑھنے کی وجہ: "والمقصود من الاستعاذة رفع شر الشيطان"

تعوذ پڑھنے کا اصل مقصد شیطان کے شر سے بچنا ہے شیطان کا شر وسوسہ سے ہوتا ہے یا اس کے علاوہ کوئی اور وجہ ہوگی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سود کھانے والوں کے متعلق فرمایا:

"لا یقومون الا کمایقوم الذی یتخبطه الشیطٰن من المس"

قیامت کے دن نہ کھڑے ہوں گے مگر جیسے کھڑا ہوتا وہ جسے آسیب نے چھوکر مخبوط بنادیا ہو۔یعنی جس طرح شیطان کا چھوا ہوا آسیب زدہ سیدھا کھڑا نہیں ہوسکتا قیامت کے دن سودخور بھی اسی طرح ہوگا۔یہاں سے واضح ہوا کہ شیطان کبھی چھوکر انسان کونقصان پہنچاتا ہے شیطان کا یہ شروسوسہ کے علاوہ ہے۔

شیطانی وسوسہ سے پناہ پکڑنے کا حکم:

" وقل رب اعوذ بک من همزات الشیاطین ☆واعوذ بک رب ان یحضرون"

اورتم عرض کرواے میرے رب تیری پناہ شیطان کے وسوسوں سے اور اے میرے رب تیری پناہ کہ وہ میرے پاس آئیں۔

ان آیات میں واضح طور پرشیطانی وسوسوں سے پناہ پکڑنے کارب تعالٰی نے حکم فرمایا ہے۔

﴿ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ☆ مَلِكِ النَّاسِ ☆اِلٰهِ النَّاسِ ☆ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ☆الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ☆مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ☆ ﴾

"تم کہو میں اس کی پناہ میں آیا جوسب لوگوں کا رب،سب لوگوں کا بادشاہ،سب لوگوں کا خدا،اس کے شر سے جودل میں برے خطرے ڈالے اور دبک رہے۔وہ جولوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں جن اور آدمی"

اس سورۃ سے بھی واضح ہوا کہ رب تعالٰی نے شیطان کے وسوسوں سے پناہ پکڑنے کا حکم دیا۔اور یہ بھی واضح ہوا کہ شیطان وسوسے ڈالنے والے جنوں میں سے ہوتے ہیں اور انسانوں میں سے بھی ہوتے ہیں۔ (ازکبیر)

وسوسہ کیا ہے؟ " الخواطر ان کانت تدعو الی الرذائل فهی وسوسة وان کانت الی الفضائل فهی الهام " (مرقاۃ ج اول ص ۱۳۳)

دل میں آنے والے خیالات اگر رذیل (برے) کاموں کی دعوت دیں تو یہ وسوسہ ہے اور اگر اچھے کاموں کی دعوت دیں تو یہ الہام ہے۔

خیال رہے کہ انبیاء کرام کا الہام تو حجت ودلیل ہوتا ہے لیکن دوسرے نیک لوگوں کا الہام حجت ودلیل نہیں کیونکہ انبیاء کرام کے خواطر (دل میں آنے والے خیالات) باوثوق ہوتے ،لیکن باقی لوگوں کے ایسے نہیں۔

شیطان کے وسوسہ کا ذکر احادیث سے:

اس سے پہلے جب ذکر کیا جا چکا ہے کہ قرآن پاک سے واضح طور پر ثابت ہے کہ شیطان کے وسوسوں سے پناہ پکڑنے کا رب تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔اب اسی مسئلہ پر احادیث مبارکہ کو پیش کیا جاتا ہے کہ شیطان انسان کو وسوسے ڈال کر بھٹکاتا ہے گمراہ کرتا ہے لغزش میں مبتلا کرتا ہے۔

☆ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

" ان الشیطان یجری من الانسان مجری الدم "

بیشک شیطان انسان میں خون کی طرح سرایت کر جاتا ہے (یعنی تمام رگوں میں جاری ہوتا ہے) (متفق علیہ)

" ان الشیطان ای کیدہ ووسواسہ یجری ای یسری من الانسان ای فیہ"

یعنی شیطان کا مکروفریب اور وسوسہ ڈالنا انسان میں اس طرح اثر انداز ہوتا ہے اور ایسے سرایت کرتا ہے جس طرح انسان کی رگوں میں خون سرایت کرتا ہے شیطان کے وسوسہ ڈالنے کو خون کی سرایت سے تشبیہ دینے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جس طرح خون کی سرایت کو انسان نہیں محسوس کرتا ایسے ہی شیطان کے وسوسوں کو محسوس نہیں کرسکتا۔اور دوسری وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جس طرح خون تمام رگوں اور تمام اعضاء میں سرایت کرتا ہے اسی طرح شیطان کو بھی رب تعالیٰ کی طرف سے مہلت دی گئی ہے لہذا وہ انسان کو بھٹکانے میں کامل طور پر قادر ہوتا ہے اور خصوصاً نفس امارہ کے ذریعے وہ کامل طور پر تصرف کی اہلیت رکھتا ہے کیا خوب کہا یحیٰی بن معاذ نے :

" الشیطان فارغ وانت مشغول وھو یراک وانت لاتراہ وانت تنسی الشیطان وھو لا ینساک ومن نفسک للشیطان علیک عون "

شیطان فارغ رہتا ہے اور تو مشغول ہے وہ تمہیں دیکھ رہا ہوتا ہے اور تم اسے نہیں دیکھ سکتے تم شیطان کو بھول جاتے ہو اور وہ تمہیں نہیں بھلاتا اور تمہارا اپنا نفس ہی

تمہارے خلاف شیطان کا مددگار ہے۔

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّ الشَّیۡطٰنَ لَکُمۡ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوۡہُ عَدُوًّا اِنَّمَا یَدۡعُوۡا حِزۡبَہٗ لِیَکُوۡنُوۡا مِنۡ اَصۡحٰبِ السَّعِیۡرِ ﴾

بیشک شیطان تمہارا دشمن ہے تو تم بھی اسے دشمن سمجھو وہ تو اپنے گروہ اسی لئے بلاتا ہے کہ دوزخیوں میں ہوں۔

اور رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَلَاۤ اِنَّ حِزۡبَ الشَّیۡطٰنِ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴾ خبردار بیشک شیطان کا گروہ ہی خسارہ میں ہے۔

لیکن اس کے برخلاف یوں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلَاۤ اِنَّ حِزۡبَ اللّٰہِ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴾ خبردار اللہ ہی کی جماعت کامیاب ہے۔

واضح ہوا کہ شیطان وسوسہ ڈال کر اپنے گروہ میں انسان کو داخل کرتا ہے۔اور شیطانی گروہ خسارہ میں ہے۔جب انسان "اعوذ باللہ" پڑھ کر اپنے تمام امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کردے گا اپنے عجز کا اعتراف کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی جماعت میں داخل ہوجائے گا۔جس پر شیطان کا مکر نہیں چل سکے گا۔تو انسان کو کامیابی حاصل ہوگی اور شیطان کا انسان میں خون کی طرح جاری ہونے کا یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ جس طرح زندگی بھر انسان کی رگوں اور اعضاء میں خون جاری رہتا ہے جب دورانِ خون بند ہوجائے تو موت واقع ہوجاتی ہے اسی طرح شیطان بھی انسان کا زندگی بھر پیچھا کرتا رہتا ہے ہر وقت بھٹکانے کی فکر میں رہتا ہے۔ (از مرقاۃ ج اول ص ۱۳۸)

☆ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" مامنکم من احد الا وقد وکل بہ قرینہ من الجن وقرینہ من الملائکۃ قالوا وایاک یارسول اللہ قال وایای ولکن اللہ اعاننی علیہ فاسلم فلایامرنی الابخیر " (رواہ مسلم)

تم میں سے کوئی ایک شخص بھی نہیں مگر یہ کہ اس پر اس کا ایک صاحب جنوں میں سے مسلط کردیا جاتا ہے اور ایک صاحب فرشتوں سے۔صحابہ کرام نے عرض کیا آپ کے ساتھ بھی یارسول اللہ؟ آپ نے فرمایا ہاں میرے ساتھ بھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف میری امداد فرمائی وہ میرا مطیع ہوگیا: مجھے سوائے بھلائی کے کوئی حکم نہیں دے سکتا۔

شیطانوں سے جو قرین (صاحب) مسلط کیا جاتا ہے اس کا نام ہی وسواس ہوتا ہے اور وہ ابلیس کی اولاد سے ہوتا ہے جس طرح انسان تمام بنی آدم ہیں۔

اور یہ انسانوں کو شر کا حکم دے گا۔یعنی برے کاموں کی طرف لگانے کی کوشش میں رہے گا اور فرشتوں سے قرین (صاحب) کا نام ملہم ہوتا ہے وہ انسانوں کو نیکی کی راہنمائی کرتا۔یہ قرین مقرر کرنے میں حکمت یہ ہوتی ہے کہ عاصی کی خست (نافرمان کی ذلت) اور فرمانبردار کی شرافت واضح ہوجائے۔واللہ اعلم حدیث شریف میں استعمال لفظ " فاسلم "کو دو طرح پڑھا گیا ہے ایک میم کی پیش سے جس کا معنی یہ ہے " اسلم انا منه " میں اس سے سلامتی میں ہوں اور ایک میم کی زبر سے اس کا معنی ہے " استسلم وذل وانقاد " وہ میرا مطیع ہوگیا مجھ سے عاجز ہوگیا۔

شیطان کا شیخ نجدی کی شکل آ کر مشرکین مکہ کو مشورہ دینا:

ایک دفعہ مشرکین مکہ اپنے میٹنگ کے مکان میں جمع ہوئے، کہ محمد ﷺ سے کس طرح اپنے آپ کو بچایا جائے اور اس سے کس طرح جان چھڑائی جائے:

" فدخل عليهم ابليس في صورة شيخ فقال انا من نجد سمعت اجتماعكم فاردت ان احضركم ولن تعدموا مني رأيا ونصحا "

ان کے پاس شیطان ایک بزرگ کی شکل میں آ گیا، کہنے لگا کہ میں نجد سے آیا ہوں، میں نے تمہارے (محمد کے خلاف) اجتماع کے متعلق سنا تو میں نے ارادہ کیا کہ میں تمہیں نصیحت کروں اور اپنی رائے دوں اس لئے میں تمہارے پاس آ گیا ہوں امید ہے کہ تم میری رائے اور نصیحت کو رد نہیں کرو گے۔ پہلے تم اپنی رائے پیش کرو۔جس کی رائے مجھے پسند آئی میں اس کی تائید کروں گا۔امید ہے کہ تم تمام انسے ہی پسند کرو گے۔

ابوالبختری نے کہا میری رائے یہ ہے کہ اس شخص کو ایک مکان میں بند کر دیا جائے۔دروازے بند کر دیئے جائیں آنے جانے کا کوئی راستہ نہ ہو بلکہ صرف ایک روشن دان ہو جس سے اندر کھانے پینے کی چیزیں پھینک دی جائیں اسی حال میں وہ شخص رہے یہاں تک کہ مرجائے۔

شیخ نجدی نے کہا یہ رائے بہت بری ہے اس میں تمہیں کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی کیونکہ اس کی قوم کے لوگ آ کر تمہارے ساتھ جنگ کر کے اسے چھڑا کر لے جائیں گے۔

ہشام بن عمرو نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ اسے ایک اونٹ پر سوار کر کے اپنی سرزمین سے نکال دیا جائے پھر اسے واپس نہ آنے دیا جائے اس پر تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

شیخ نجدی نے کہا یہ رائے بھی بہت بری ہے کیونکہ وہ شخص جہاں جائے گا وہاں لوگوں کو فساد میں (گمراہی میں) مبتلا کرے گا (معاذ اللہ) اور وہ لوگ اس کے ساتھ مل کر تمہارے ساتھ مقابلہ کریں گے اور جنگ کر کے تمہیں مغلوب کر دیں گے۔

ابوجہل نے کہا میری رائے یہ ہے کہ ہر قبیلہ سے ایک نوجوان کو منتخب کیا جائے اور ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک تلوار دے دی جائے، وہ سب مل کر ایک بار ہی حملہ کر کے اسے قتل کر دیں اس طرح خون مختلف قبائل میں بکھر جائے گا بنو ھاشم تمام قبائل سے لڑنے کی طاقت تو نہیں رکھیں گے البتہ وہ دیت طلب کریں گے وہ ہم دے دیں گے۔

شیخ نجدی نے اس کی رائے کو پسند کیا اسی رائے پر مجلس برخاست ہوگئی۔

(از مرقات ج ۱۱ ص ۲۱۸)

اس سے واضح ہوا کہ شیطان گمراہوں کا ساتھی ہے ہر برے کام میں ان کا مشیر ہوتا ہے۔ شیطان اور ابوجہل میں یگانگت تھی۔ شیطان اپنا مکر کرتا رہا۔ لیکن رب تعالیٰ کی خفیہ تدبیر کا مقابلہ نہ کر سکا۔ کافروں نے اپنا پروگرام ترتیب دے کر یکبارگی حملہ کرنے کے لئے نوجوانوں کو جمع کر لیا۔ لیکن ان کے محاصرہ کے دوران ہی رب تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب علیہ الصلوۃ والسلام کو ہجرت کا حکم دے کر اور بحفاظت آپ کو وہاں سے نکال کر شیطان کے مکر کو خاک میں ملا دیا۔ " اعوذ باللہ " پڑھنے سے انسان جب رب کی حفاظت میں آ جاتا ہے تو شیطان منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔

جنات وشیاطین کا ذکر قرآن پاک سے:

کچھ آیات کا ذکر پہلے " پناہ پکڑنے " کی بحث میں گزر چکا ہے مزید کچھ آیات مبارکہ کو دیکھا

جائے تو واضح ہو جائے گا کہ قرآن پاک میں مختلف مقامات میں جنوں اور شیطانوں کا ذکر ہے :

﴿ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴾ (الحجر ۲۷)

''اور جن کو اس (انسان) سے پہلے بنایا بے دھوئیں کی آگ سے''

﴿ وَاِذْ صَرَفْنَا اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْا اَنْصِتُوْا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ قَالُوْا يَا قَوْمَنَا اِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾

''اور جب کہ ہم نے تمہاری طرف کتنے جن پھیرے کان لگا کر قرآن سنتے پھر جب وہاں حاضر ہوئے آپس میں بولے خاموش رہو پھر جب پڑھنا ہو چکا اپنی قوم کی طرف ڈرسنانے پلٹے۔ بولے اے ہماری قوم ہم نے ایک کتاب سنی کہ موسٰی کے بعد اتاری گئی اگلی کتابوں کی تصدیق فرماتی حق اور سیدھی راہ دکھاتی''۔

ان آیات میں جنوں کا نبی کریم ﷺ سے فجر کی نماز میں قرآن پاک کے سننے کا ذکر ہے۔

یہ اس وقت کا واقعہ ہے کہ آپ نے فجر کی نماز مکہ اور طائف کے درمیان بطن نخلہ میں ادا فرمائی تھی یہ اسی وقت جو جن حاضر تھے انہوں نے قرآن پاک کو سن کر ایمان لایا اور پھر نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی پر اپنی قوم (دوسرے جنوں) کو دعوتِ ایمان دینے گئے۔ صرف ان دو مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے ورنہ قرآن کی بہت سی آیات مبارکہ میں جنوں اور شیطانوں کا ذکر موجود ہے۔

تعوذ پڑھنے میں فوائد نمبرا:

جب حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کے لئے دعا کی کہ اے اللہ یہ میرا بیٹا ہے جو میری اہل سے ہے رب تعالٰی نے فرمایا یہ تمہاری اہل سے نہیں اس کے عمل اچھے نہیں یعنی کافر ہے۔ تو نوح علیہ السلام نے عرض کیا :

''رب انی اعوذ بک ان اسالک مالیس لی به علم''

عرض کی اے میرے رب میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ تجھ سے وہ چیز مانگوں جس کا مجھے علم نہیں۔

" فعند هذا اعطاه الله خلعتين و السلام و البر کات " جب نوح علیہ السلام نے اعوذ کو پڑھا تو رب تعالیٰ نے آپ کو دو انعام عطا فرمائے ایک سلام اور دوسرا برکات۔ رب تعالیٰ نے ان دو نعمتوں کا ذکر ان الفاظ مبارکہ سے فرمایا ﴿قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ﴾ فرمایا گیا اے نوح کشتی سے اتر ہماری طرف سے سلام اور برکتوں کے ساتھ۔

جب حضرت یوسف علیہ کو عزیز مصر کی زوجہ (زلیخا) نے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی تو آپ نے کہا " فمعاذ الله انه ربی احسن مثوای " کہا اللہ کی پناہ وہ عزیز تو میرا پرورش کرنے والا ہے اس نے مجھے اچھی طرح رکھا جب حضرت یوسف علیہ السلام نے تعوذ کو پڑھا تو رب تعالیٰ نے آپ کو دو نعمتوں سے نوازا۔ ایک برائی کا آپ سے دور رکھنا۔ اور دوسری بے حیائی سے دور رکھنا۔ ان دو نعمتوں کو رب تعالیٰ نے ذکر کرتے ہوئے فرمایا ﴿كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ﴾ ہم نے یوں ہی کیا کہ اس سے برائی اور بے حیائی کو پھیر دیں۔

اسی طرح یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی بنیامین کو رب تعالیٰ کی مرضی کے مطابق چوری کا الزام لگا کر اپنے پاس رکھ لیا تو آپ کے بھائیوں نے کہا ﴿فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ﴾ تو ہم میں سے اس کی جگہ کسی کو لے لو۔ تو آپ نے ان کے جواب میں فرمایا:

﴿مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗ﴾ کہا اللہ کی پناہ کہ ہم لیں مگر اسی کو جس کے پاس ہمارا مال ملا۔ تو رب تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے تعوذ پڑھنے پر ان کو اس عظیم نعمت سے نوازا۔ ارشاد باری تعالیٰ دیکھئے ﴿وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا﴾ اور اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا اور سب اس کے لئے سجدہ میں گرے یعنی رب تعالیٰ نے آپ کو ماں باپ سے ملایا اور ماں باپ کو عزت و تکریم سے بٹھانے کی توفیق عطا فرمائی اور آپ کے ماں باپ اور بھائیوں سے تعظیمی سجدہ کرا کر آپ کی خواب کو سچا فرمایا جو آپ نے ایک مرتبہ خواب دیکھا تھا کہ "میں دیکھ رہا ہوں کہ مجھے چاند اور سورج اور گیارہ ستارے سجدہ کر رہے ہیں"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعوذ پڑھنے کا ذکر رب تعالیٰ نے فرمایا جب کہ آپ نے اپنی قوم کو

ایک مردہ کے زندہ کرنے کے لئے گائے کو ذبح کرنے کا حکم دیا۔تو آپ کی قوم نے کہا ﴿ اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا قَالَ اَعُوْذُ بِاللهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴾ کیا آپ ہمیں مسخرہ بناتے ہو؟ فرمایا اللہ کی پناہ کہ میں جاہلوں سے ہوں۔

یعنی قوم نے جب کہا کہ مردہ کو ذبح کی گئی گائے کے گوشت کے ٹکڑہ مارنے سے زندہ کرنا عقل کے خلاف ہے۔اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ تم ہمارے ساتھ استہزاء اڑا رہے ہو۔آپ نے فرمایا کہ استہزاء (ٹھٹھا، بیہودہ مزاح) اڑانا تو جاہلوں کا کام ہے میں تو نبی ہوں لیکن پھر بھی آپ نے اپنا معاملہ رب کے سپرد کرتے ہوئے تعوذ کو پڑھا۔اس تعوذ پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو نعمتیں عطاء کیں " ازالة التهمة و احیاء القتل " ایک استہزاء کی تہمت کا زائل کرنا اور دوسری مردہ کو زندہ کرنا۔

ان نعمتوں کا تذکرہ رب تعالیٰ نے یوں فرمایا:

﴿ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا كَذٰلِكَ يُحْيِ اللهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ ﴾ تو ہم نے فرمایا اس مقتول کو اس گائے کا ایک ٹکڑا مارو اللہ یوں ہی مردے زندہ کرے گا اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے۔

اسی طرح جب موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کی قوم نے قتل کی دھمکی دی تو آپ نے رب تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے کہا:

﴿ وَاِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ﴾

اور میں پناہ لیتا ہوں اپنے رب اور تمہارے رب کی اس سے کہ تم مجھے سنگسار کرو۔

اور دوسرے مقام پر آپ کے تعوذ کا ذکر ان الفاظ مبارکہ سے کیا گیا " وقال موسی انی عذت بربی وربکم من کل متکبر لایؤمن بیوم الحساب " اور موسیٰ نے کہا میں تمہارے اور اپنے رب کی پناہ لیتا ہوں ہر متکبر سے کہ حساب کے دن پر یقین نہیں لاتا۔

موسیٰ علیہ السلام کی اس تعوذ پر کیا انعام حاصل ہوا؟

" فاعطاہ اللہ تعالیٰ مرادہ فافنی عدوھم واورثھم ارضھم ودیارھم "

اللہ تعالیٰ نے آپ کی مراد کو پورا فرمایا (یعنی آپ کو دشمن پر برتری عطا فرمائی بنی اسرائیل کو نجات

دی) آپ کے دشمن کو ہلاک کیا۔اور آپ کو اور آپ کی قوم بنی اسرائیل کو ان کی زمین اور شہروں کا (یعنی تمام جائیداد کا) وارث بنایا۔

حضرت مریم علیہا السلام نے جب دیکھا کہ خلوت میں جبریل انسانی شکل میں آپ کی طرف آرہا ہے تو آپ نے اسے انسان ہی سمجھتے ہوئے کہا :

﴿ قَالَتْ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْکَ اِنْ کُنْتَ تَقِیًّا ﴾

بولی میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں اگر تجھے خدا کا ڈر ہے۔

حضرت مریم کے تعوذ پڑھنے پر آپ کو کیا ثمرہ (فائدہ) حاصل ہوا؟

"فوجدت نعمتين ولدا من غير اب وتنزيه الله اياها بلسان ذلك الولد عن السوء"

آپ کو دو نعمتیں حاصل ہوئیں بغیر باپ کے بیٹا آپ کو حاصل ہوا اور شیر خوار بیٹے کی زبان سے یہ کہلوا کر "انی عبد الله" (میں اللہ کا بندہ ہوں) آپ سے تہمت کو دور کر دیا اور آپ کی پاک دامنی کا اعلان کرا دیا۔

اس بحث سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ انبیاء کرام اور بزرگ ہستیاں تعوذ پڑھتی رہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنی نعمتوں سے نوازتا رہا۔

نمبر ۲: "اعوذ باللہ" سے انسان کو مخلوق سے خالق کی طرف عروج حاصل ہوتا ہے اور ممکن سے واجب کی طرف عروج حاصل ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو اپنے عاجز ہونے اور رب تعالیٰ کے غنی اور قادر ہونے کی معرفت حاصل ہوتی ہے جو اس کے عروج کا سبب بنتی ہے انسان جب "اعوذ باللہ" پڑھتا ہے تو وہ اپنے آپ کو کامل طور پر محتاج سمجھتا ہے اور اپنے محتاج ہونے کا گویا کہ برملا اظہار کرتا ہے۔اور ساتھ ہی یہ بھی اعتراف کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام خیرات کا عطا کرنے والا ہے اور تمام مصائب کا دور کرنے والا ہے دوسرے کسی کو ذاتی طور پر حاجات کو پورا کرنے اور مصائب کو دور کرنے کی کوئی طاقت نہیں جب انسان کو یہ حال حاصل ہو جاتا ہے تو وہ کامل طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نور جلال میں مستغرق ہو جاتا ہے اور مقام مشاہدہ کو پا لیتا ہے یہی انسان کا مقامِ عروج ہے۔

نمبر۳: جب انسان " اعوذ باللہ " پڑھ کر اپنے آپ کے عاجز ہونے اور رب تعالیٰ کے قادر ہونے کا اعتراف کرتا ہے تو اس سے یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ انسان اگر رب تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے بغیر عاجزی اور انکساری کے یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

اسی پر نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے "من عرف نفسه فقد عرف ربه" جس نے اپنے نفس کو پہچانا تحقیق اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ :

" من عرف نفسه بالضعف والقصور عرف ربه بانه هو القادر على كل مقدور"

جس نے اپنے آپ کو ضعیف وعاجز اور کم ہمت اور قصور وار سمجھا اسے یہ معلوم ہو گیا کہ بیشک تمام قدرتوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہے " ومن عرف نفسه بالجهل عرف ربه بالفضل والعدل" جس شخص نے اپنے آپ کو جاہل سمجھا اسے یہ پتہ چل گیا کہ رب تعالیٰ ہر قسم کے فضل اور عدل کا مالک ہے۔

" ومن عرف نفسه باختلال الحال عرف ربه بالكمال والجلال "

"جس شخص نے اپنے آپ کو اس طرح پہچانا کہ اس کے حال میں خلل اور نقص پایا جاتا ہے تو وہ رب تعالیٰ کے کمال اور جلال کو پہچان لے گا "۔

نمبر٤: انسان " اعوذ باللہ " پڑھ کر رب تعالیٰ قادر مطلق کی پناہ پکڑتے ہوئے اپنے آپ سے آفات وبلیات (مصائب وآلام) کا دفاع چاہتا ہے پھر وہ کام جن میں شیطان وسوسہ ڈالتا ہے ان میں سے ہی قرآن پاک کا پڑھنا بھی ہے۔ کیونکہ جو شخص قرآن پاک پڑھتا ہے اور اس کے ذریعے رب تعالیٰ کی عبادت کی نیت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے وعد وعید (عذاب سے ڈرانا) آیات اور دلائل میں غور وفکر کرتا ہے تو اس کی نیکیوں پر عمل کرنے اور حرام کاموں سے خوف کی وجہ سے بچنے کی طرف رغبت زیادہ ہوجاتی ہے اسی وجہ سے قرآن پاک کا پڑھنا عظیم عبادت ہے جتنی عظیم عبادت ہو اتنی ہی شیطان کی کوشش بھی زیادہ ہوتی ہے کہ انسان کو اس سے دور رکھا جائے لہذا انسان قرآن پاک پڑھتے ہوئے شیطان کے وسوسہ مکر وفریب سے بچنے کا زیادہ محتاج ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک پڑھنے سے پہلے " اعوذباللہ " پڑھنے کا خصوصی طور پر حکم دیا گیا۔

نمبر٥ : شیطان انسان کا دشمن ہے جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّ الشَّیْطَانَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوًّا﴾ بیشک شیطان تمہارا دشمن ہے تو تم بھی اسے دشمن سمجھو۔

اور رحمٰن انسان کا مولیٰ خالق اور مشکلات کا حل کرنیوالا ہے۔ پھر انسان جب طاعات وعبادات کوشروع کرتا ہے دشمن کا خوف رکھتا ہے۔

لیکن کوشش کرتا ہے کہ اپنے خالق کو راضی کر لے اور دشمن سے اپنے آپ کو بچالے۔ جب انسان عبادت میں خلوص، عجز اور انکساری سے دل کوحاضر کرلیتا ہے۔تو وہ رب تعالیٰ کی رحمت وکرامت کے آثار کامشاہدہ کرتا ہے تو اسے دشمن بھول جاتا ہے وہ کامل طور پر اپنے حبیب (اللہ تعالیٰ) کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

پہلا مقام شیطان سے دوری اور اسے بھول جانا یہ غیروں سے فرار ہے اور رب کی طرف توجہ ہے۔اس مقام پردلالت ہے **اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم** سے۔اور دوسرا مقام کہ اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے دربار میں حاضر سمجھے اور اپنی توجہ کا کامل طور پر مرکز رب تعالیٰ کو ہی سمجھے اس مقام پر دلالت ہے "**بسم اللہ الرحمن الرحیم**" سے۔

نمبر٦: اللہ تعالیٰ نے فرمایا﴿ لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ ﴾ اسے (قران پاک کو) نہ چھوئیں مگر باوضو۔

انسان کا دل جب غیر اللہ (اللہ کے ماسوا) کی طرف متوجہ ہو اور دل کا تعلق غیر اللہ سے ہو اور زبان سے غیر اللہ کا ذکر جاری ہوتو اس کی عبادت مکدر اور ملوث ہوگئی (گویا کہ گندگی سے مل جل گئی) اب ضروری ہے کہ اسے پاک کرنے کے لئے اس چیز کو استعمال کیاجائے جس میں پاک کرنے کی صلاحیت موجود ہو جب انسان "**اعوذ باللہ**" پڑھے گا تو اسے طہارت حاصل ہوجائے گی۔اب وہ نمازِ حقیقی کے لئے اپنے آپ کو تیار سمجھے گا او وہ نماز حقیقی کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کا ذکر، اسے کے بعد کہے گا "**بسم اللہ الرحمن الرحیم**" گویا کہ تعوذ کے ذریعے اس نے اپنے آپ کوتسمیہ کے قابل بنالیا۔

تنبیہ: نماز حقیقی کے لفظ سے کوئی اس غلطی میں مبتلاء نہ ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں

مشغول رہنے سے نماز حقیقی جب حاصل ہوگئی تو ظاہری نماز ادا کرنے کی ضرورت نہ رہی۔ایسا سوچنا دین حق سے بغاوت ہے۔اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کون شخص رب تعالیٰ کی یاد میں زیادہ مشغول ہوسکتا ہے جب آپ نے نماز کو ترک نہیں فرمایا تو دوسرے کسی کی کیا مجال ہے یہ صرف بے دین لوگ کہتے ہیں کہ ہم ہر وقت اللہ کی یاد میں رہتے ہیں ہمیں نمازوں کی کیا ضرورت علماء اہل سنت (بریلوی مسلک) اس قسم کے ملنگوں، بھنگیوں، چرسیوں کو ولی نہیں کہتے ان کی آڑ میں کوئی شخص متقی اہل علم اولیاء کو اگر برا بھلا کہے تو یہ اس کی حماقت ہے۔

نمبر ۷: انسان کے دو دشمن ہیں ایک ظاہری دوسرا باطنی۔ان دونوں کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ظاہری دشمن کے متعلق رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَايُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ ﴾ قتال کرو ان لوگوں سے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور باطنی دشمن کے متعلق فرمایا ﴿ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ﴾ بیشک شیطان تمہارا دشمن ہے تو تم بھی اسے اپنا دشمن سمجھو۔مراد یہی ہے کہ اپنے باطنی دشمن شیطان سے جنگ کرو۔

ظاہری دشمن سے لڑائی اللہ تعالیٰ کی امداد کے بغیر نہیں ہوسکتی صحابہ کرام کی امداد رب تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے کی جس کا ذکر فرمایا:

﴿ يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴾

تمہارا رب تمہاری مدد کو پانچ ہزار فرشتے نشان والے بھیجے گا۔

جب باطنی دشمن سے جنگ کرتے ہو تو وہاں بھی اللہ تعالیٰ کی امداد کی ضرورت ہے رب تعالیٰ نے شیطان کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

﴿ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ﴾ بے شک میرے بندوں پر تیرا کچھ قابو نہیں۔

باطنی دشمن سے جنگ کرنا زیادہ بہتر اور زیادہ ضروری ہے بنسبت ظاہری دشمن کے اس لئے کہ ظاہری دشمن تو دنیاوی نقصان دے سکتا ہے لیکن باطنی دشمن دین وایمان میں نقصان پہنچا سکتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ انسان ''اعوذ باللہ'' پڑھ کر باطنی دشمن یعنی شیطان سے اپنے آپ کو بچالے۔

نمبر ۸: بیشک مومن کا دل تمام مقامات سے اعلیٰ اشرف اور برتر ہے خوبصورت شہر، لہلہاتے

ہوئے باغات ، خوبصورت خوشنما پھول بھی دل سے مقابلہ نہیں کر سکتے ۔ بلکہ مؤمن کا دل صفائی میں آئینہ کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ آئینہ سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ آئینہ کے سامنے اگر حجاب (پردہ) آ جائے تو کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی۔

" وقلب المؤمن لا يحجبه السموات السبع والكرسي والعرش "

"لیکن مؤمن کے دل کے سامنے سات آسمان کرسی اور عرش بھی حجاب نہیں بن سکتے"۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ ﴾ اسی کی طرف چڑھتا ہے پاکیزہ کلام اور جو نیک کام ہے وہ اسے بلند کرتا ہے۔ بلکہ دل کے سامنے جتنے حجاب زیادہ آئیں اتنا ہی زیادہ دل اللہ تعالیٰ کے جلال کا مطالعہ کرتا ہے اور باری تعالیٰ کی صفات اتنی ہی زیادہ دل میں آتی ہیں۔

مؤمن کا دل تمام مقامات سے اشرف ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا " القبر روضة من رياض الجنة " قبر جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے۔

قبر کو جنت کے باغ کی حیثیت صرف اس لئے حاصل ہوگی کہ اس میں میت اللہ کا نیک بندہ ہو تو اس حدیث سے واضح ہوا کہ مؤمن کا دل معرفت الٰہی کا تخت ہے اور اسے عرش الٰہی ہونے کا شرف حاصل ہے۔

اور اسی سے واضح ہوا ، تمام مقامات سے اعلیٰ ہے گویا رب تعالیٰ کی طرف سے بندے کو یہ کہا جاتا ہے : "یاعبدی قلبک بستانی وجنتی بستانک "

اے میرے بندے تیرا دل میرا باغ ہے اور میری جنت تیرا باغ ہے۔

اگر تو نے اپنے باغ سے میرے لئے کنجوسی نہ کی یعنی اپنے دل میں میری معرفت کو جگہ دی تو میں اپنے باغ سے تمہیں نہیں منع کروں گا گویا آسان لفظوں میں یوں کہا جائے کہ رب تعالیٰ کہتا ہے اے میرے بندے تو مجھے یاد کر تو بلا رکاوٹ میری جنت میں آ جا۔ اس سے بھی واضح ہوا کہ مؤمن کا دل تمام مقامات سے اعلیٰ ہے۔

رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْکٍ مُّقْتَدِرٍ ﴾

بیشک پرہیز گار باغوں اور نہر میں ہیں سچ کی مجلس میں عظیم قدرت والے بادشاہ کے حضور۔اللہ تعالیٰ نے صرف "ملیک" (بادشاہ) نہیں کہا بلکہ "مقتدر" (قدرت والا) بھی ساتھ کہا کہ قیامت کے دن بادشاہی صرف رب تعالیٰ کی ہوگی اور تمام بندے اس قادر مطلق کے غلام ہونے کی حیثیت میں اس کے حضور ہوں گے۔

اسی سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ رب تعالیٰ انسان کو کہتا ہے کہ اگر تو نے میری جنت میں آنا ہے تو اپنے دل میں مجھے بسا لے۔لیکن اگر اپنے دل میں مجھے بسانا ہے تو پہلے اپنے دل سے اپنے دشمن شیطان کو نکالنا ہوگا۔یہ اسی وقت حاصل ہوگا جب تمہیں میری قاہر حکومت کا پتہ ہو میری جنت میں آنے کی تمنا کرو۔واضح ہوا کہ مؤمن کا دل رب کی رحمت کا مسکن ہے لہٰذا تمام مقامات سے اعلیٰ ہے۔یوں سمجھو کہ رب تعالیٰ نے کہا کہ اگر شیطان کو دل سے نکالنا ہے اور اس سے بچنا ہے تو پڑھو "اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم"۔

اعتراض: جب مومن کا دل اللہ تعالیٰ کا باغ ہے تو شیطان اس سے خود ہی کیوں نہیں نکل جاتا؟

جواب: اہل معرفت نے یہ کہا ہے کہ یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کو یہ کہا جاتا ہے کہ اے انسان تو نے اپنے دل کے مکان میں معرفت کے بادشاہ کو لانا ہے۔جو شخص یہ چاہے کہ وہ اپنے گھر میں بادشاہ کو لائے

"وجب علیہ ان یکنس تلک الحجرۃ وان ینظفھا ولا یجب علی السلطان تلک الاعمال"

تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے گھر میں جھاڑو دے اپنے گھر کو صاف ستھرا رکھے یہ کام اسی شخص نے کرنے ہیں بادشاہ نے نہیں کرنے۔

جب تو رب تعالیٰ کو دل میں بسانا چاہتا ہے اس کے نور سے دل کو جگمگانا چاہتا ہے اس کی معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے

" فنظف انت حجرة قلبک من لوث الوسوسة فقل اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم"

تو اپنے دل کے مکان کو وسوسہ کی گندگی سے صاف کر لے اس کے لئے تو پڑھ " اعوذ باللہ".

نمبر ۹ : گویا کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے اے انسان کیا تمہیں معلوم ہے کہ میرے اور شیطان کے درمیان کیا چیز حائل ہوئی جب کہ وہ فرشتوں کی طرح میری عبادت بھی کرتا تھا اور ظاہر طور پر میری خدائی کو بھی مانتا تھا؟ ہاں میرے اور اس کے درمیان صرف یہ چیز حائل ہوگئی کہ میں نے اسے تمہارے باپ آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرنے کا حکم دیا اس نے تکبر کیا اور انکار کیا تو میں نے اسے اپنی خدمت سے ہٹا دیا دراصل اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ تمہارے باپ کا دشمن تھا۔تمہارا کیا انصاف ہے کہ وہ عرصہ دراز سے تمہارے ساتھ بھی دشمنی کر رہا ہے لیکن تم اس کے ساتھ محبت کئے جا رہے ہو۔وہ ہر نیکی کے کام میں تمہاری مخالفت کرتا ہے تم اس کی ہر مزاد کو پورا کرنے میں اس کی موافقت کئے جا رہے ہو۔

" فاترک ھذہ الطریقة المذمومة واظھر عداوتہ فقل اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم "

اے انسان تو یہ برا طریقہ چھوڑ دے اور شیطان کی عداوت ظاہر کر اور کہہ اعوذ باللہ۔

نمبر ۱۰ : اے انسان ذرا یوں تو خیال کر کہ تیرے باپ آدم علیہ السلام کو بھلانے اور جنت سے نکالنے میں شیطان نے کیا کہا؟ اس نے یہ کہا دونوں کا خیر خواہ ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ﴾

اور ان دونوں (آدم وحوا) سے قسم اٹھائی کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں۔

اور اے انسان تیرے متعلق تو رب تعالیٰ سے مہلت لے کر یہ کہہ کر آیا ہے:

﴿قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ﴾

بولا تیری عزت کی قسم ضرور میں ان سب کو گمراہ کر دوں گا مگر جو ان میں تیرے چنے ہوئے بندے ہیں۔

اے انسان ذرا سوچ، غور کر جب وہ تیرے باپ کا خیر خواہ بن کر بھلانے اور جنت سے نکالنے کا سبب بن چکا ہے تیرے ساتھ تو کھلا اعلان جنگ کر چکا ہے۔رب تعالیٰ کے سامنے قسم اٹھا کر برملا تجھے گمراہ کرنے کا وعدہ کر چکا ہے۔البتہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو گمراہ کرنے سے عجز کا اظہار کر چکا ہے اس لئے تو بھی " اعوذ باللہ " پڑھ کر اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے رب تعالیٰ کے نیک

پندوں میں داخل ہوجاتا کہ شیطان کے مکروفریب سے بچ جائے۔

نمبر ۱۱: اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی لفظ " **اللہ** " کا مطلب یہ ہے کہ وہ مستحق عبادت ہے مستحق عبادت وہی ہوسکتا ہے جو قادر علیم اور حکیم بھی ہو گویا کہ " اعوذ باللہ " پڑھنے سے مطلب یہ حاصل ہوگا " اعوذ بالقادر العلیم الحکیم " اس طرح یہ نام انسان کو گناہوں سے کامل طور پر بچانے کے لئے زجر (ڈانٹ ڈپٹ) کی حیثیت رکھے گا۔ اس لئے کہ انسان کو جب یہ معلوم ہو کہ یہ مال بادشاہ کا ہے جو چور کو سزا دینے پر قادر ہے تو وہ چوری کرنے میں ڈرے گا لیکن اگر اسے یہ معلوم ہوا کہ بادشاہ کو چوری کا علم حاصل نہیں ہوگا تو وہ چوری کرنے کی خواہش کرے گا۔ اور اگر اسے یہ پتہ ہو کہ بادشاہ کو میری چوری کا پتہ چل جائے گا۔ تو وہ پھر ڈر محسوس کرے گا۔ لیکن اگر اسے یہ پتہ چل جائے کہ بادشاہ حکیم نہیں (دانائی وحکمت سے خالی ہے) وہ چوروں کو چوری سے روکتا نہیں پھر بھی چوری کرنے کی تمنا کرے گا اگر اسے یہ معلوم ہوجائے کہ بادشاہ چوروں کو چوری نہیں کرنے دیتا تو وہ یقیناً چوری سے دور رہے گا۔

اسی طرح " اعوذ باللہ " پڑھنے والے کو جب یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ رب تعالیٰ قادر ہے علیم ہے حکیم ہے تو وہ گناہوں سے بچ کر رہے گا کیونکہ اسے پتہ ہے رب میرے گناہوں کو جانتا ہے، **گناہ** کرنے پر ناراض ہوتا ہے اور گناہوں کی سزا دینے پر بھی قادر ہے **تو یقیناً وہ گناہوں** سے اجتناب **کرے گا۔**

نمبر ۱۲: انسان جب " اعوذ باللہ " پڑھے گا **تو اس کا مقصد یہ ہوگا** کہ وہ شیطان کو پسند نہیں کرتا کیونکہ وہ عاصی (نافرمان) ہے اس طرح اللہ تعالیٰ **انسان کو شیطان** کے عصیان (نافرمانی) سے بچائے گا۔ کیونکہ بندہ جب شیطان کو صرف اس لئے نہیں **پسند کر رہا کہ وہ عاصی** ہے تو بندہ عین معصیت (بعینہ گناہ) کو کیسے پسند کرے گا؟

نمبر ۱۳: شیطان نام ہے اور رجیم صفت ہے۔ اگرچہ لفظ **شیطان** سے بھی پتہ چل رہا تھا کہ وہ رب تعالیٰ کی رحمت سے دور ہے لیکن رب تعالیٰ نے صرف اس کا نام ہی ذکر نہیں کیا بلکہ اس کی صفت کو بھی ذکر کیا تاکہ یہ واضح ہوجائے کہ جس نے ہزاروں سال اللہ تعالیٰ کی عبادت کی کوئی نافرمانی نہیں کی رب کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی۔ لیکن جب حکم کو ٹال دیا تکبر کیا ایک پل میں رجیم (مردود دربار سے دھتکارا ہوا) ہوگیا۔ تو اس سے واضح ہوا کہ اے انسان تو بھی اس کی محفلوں سے دور رہ ورنہ وہ

تمہیں بھی رب تعالیٰ کی لعنت کا مستحق بنا دے گا اور اپنے ساتھ جہنم میں لے جانے کی سر توڑ کوشش کرے گا۔لہذا"اعوذ باللہ" پڑھ کر اس سے بیزاری کا اعلان کر دے رب کے قریب ہو جا رب کی پناہ میں آ جا اپنے عجز کا اظہار کرتا کہ شیطان مردود سے تیرے بچاؤ کا ذریعہ بن جائے۔

نمبر ۱٤: ہوسکتا ہے کہ کسی انسان کے ذہن میں یہ بات آئے کہ "اعوذ بالْمَلٰئِکَۃِ" کیوں نہیں کہا حالانکہ فرشتوں میں سے کوئی فرشتہ کم مرتبہ رکھنے والا بھی شیطان دور بھگانے کے لئے کافی ہے جب فرشتوں کی پناہ حاصل کرنے سے مطلب ہوسکتا تھا:

"**فما السبب ان جعل ذکر ھٰذا الکلب فی مقابلۃ ذکر اللہ تعالیٰ**" تو کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں اس کتے (شیطان) کا ذکر کیا گیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ گویا رب تعالیٰ یہ کہتا ہے "**عبدی انہ یراک وانت لاتراہ**" اے میرے بندے بیشک وہ تمہیں دیکھ رہا ہوتا ہے لیکن تم اسے نہیں دیکھ رہے ہوتے۔

اسی پر رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے:﴿ اِنَّہٗ یَرٰکُمْ ھُوَ وَقَبِیْلُہٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَھُمْ ﴾ بے شک وہ اور اس کا کنبہ تمہیں وہاں سے دیکھتے ہیں کہ تم نہیں دیکھ سکتے اسی وجہ سے شیطان دھوکہ دینے میں کامیاب ہوجاتا ہے کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہوتا ہے اور تم اسے نہیں دیکھ رہے ہوتے۔

اس لئے اے میرے بندو تم بھی اس کا سہارا حاصل کرو جو شیطان کو دیکھ رہا ہوتا ہے لیکن شیطان اسے نہیں دیکھ رہا ہوتا اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے لہذا اپنے تمام معاملات اسی کے سپرد کرتے ہوئے "**اعوذ باللہ**" پڑھو۔

نمبر ۱۵: "**اعوذ باللہ من الشیطان**" پر الف لام جنسی ہے تا کہ ہر قسم کے شیطانوں سے پناہ پکڑی جا سکے خواہ وہ شیطان جنوں میں سے ہوں یا انسانوں میں سے، خواہ نظر آئیں یا نہ آئیں۔اگر الف لام عہد خارجی ہوتا تو شیطان سے مراد خاص طور پر فقط ابلیس مراد ہوتا۔لیکن جب الف لام جنسی بنایا جائے گا تو مراد جنس شیطان ہوگا کیونکہ کبھی نظر آنے والا شیطان نہ نظر آنے والے سے اشد ہوتا ہے۔

جیسا کہ ایک حکایت بیان کی گئی کہ کسی شخص نے محفل میں یہ بیان کیا کہ جب انسان صدقہ کرنا چاہے تو ستر شیطان اس کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔کوئی اس کے ہاتھوں سے لپک جاتا ہے۔

کوئی اس کے پاؤں سے چمٹ جاتا ہے کوئی اس کے دل پر حاوی ہوجاتا ہے اس طرح وہ اسے صدقہ سے روک دیتے ہیں۔قوم میں سے کسی شخص نے یہ سنکر کہا آج میں ستر شیطانوں سے جنگ کروں گا۔مسجد سے نکلا گھر میں آ گیا اور گندم سے اپنے دامن کو بھرا ارادہ کیا کہ گھر سے نکل کر صدقہ کرے لیکن اس کی زوجہ جلدی سے اس کے سامنے آ گئی اس سے جھگڑا کرنے لگی (یہ دانے کدھر لئے جا رہے ہو) لڑتے ہوئے اس نے خاوند کے دامن سے گندم کو چھڑا لیا۔وہ شخص رسوا ہوکر واپس مسجد میں لوٹ آیا۔تقریر کرنے والے حضرت اس سے پوچھنے لگے ۔"ماذا عملت" تم نے کیا عمل کیا؟ " فقال هزمت السبعين.فجاء ت امهم فهزمتني " پس اس نے کہا میں نے ستر شیطانوں کو تو شکست دے دی تھی لیکن ان کی ماں آ گئی جس نے مجھے شکست دے دی۔

خیال رہے کہ الف لام عہد خارجی ہو اور مراد خاص شیطان ابلیس ہو تو پھر بھی ٹھیک ہے کیونکہ ابلیس ہی دوسرے شیطانوں کو انسانوں کی طرف گمراہ کرنے کے لئے بھیجتا ہے اور جتنا زیادہ کوئی بھٹکانے میں کامیاب ہوتا ہے اس سے وہ زیادہ خوش ہوتا ہے۔جب ابلیس سے پناہ حاصل ہوگئی تو اس کے تمام چیچوں ،کڑچھوں سے پناہ حاصل ہو جائے گی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔بیشک ابلیس اپنا تخت پانی پر رکھتا ہے پھر وہ اپنے چھوٹے چھوٹے لشکر لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے بھیجتا ہے" فَاَدْنَاهُمْ منزلة اعظمهم فتنة " جتنا کوئی بڑا فتنہ برپا کرتا ہے اتنا ہی زیادہ وہ اس کے قریب ہوتا ہے ان میں سے ایک آتا ہے وہ کہتا ہے میں نے یہ کیا ہے وہ کیا ہے (یعنی مختلف اپنے فتنوں کی خبر دیتا ہے) ابلیس کہتا ہے تو نے کچھ نہیں کیا پھر ایک اور آتا ہے وہ کہتا ہے۔

" ما تركته حتى فرقت بينه وبين امرأته قال فيدنيه منه ويقول نعم انت
قال الاعمش اراه قال فيلتزمه " (مسلم)

میں نے ایک شخص کو نہیں چھوڑا یہاں تک کہ اس کے اور اس کی زوجہ کے درمیان تفریق کر دی اس (اپنے چیلے) کو ابلیس اپنے قریب کرتا ہے اور کہتا ہے ہاں واقعی تو نے صحیح کام کیا ہے راوی اعمش کہتے ہیں میرا خیال یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا وہ اسے گلے لگالیتا ہے۔

میاں بیوی کی جدائی پر اور کئی فتنہ کے دروازے کھلتے ہیں اسی لئے ابلیس خوش ہوتا ہے کیونکہ اس سے بدکاری، غیبت، قطع رحمی، غیظ وغضب جیسے مفاسد جنم لیتے ہیں۔

☆ شیطان کا لفظ لیا ہوا ہے " شطن " سے جس کا معنی دور ہونا۔ اس کو رب تعالیٰ نے اپنی رحمت سے دور کر دیا لیکن رب تعالیٰ کی اطاعت کرنے والا انسان رب کے قریب ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے " واسجد واقترب " اور سجدہ کرو اور ہم سے قریب ہو جاؤ اور رب تعالیٰ بھی اپنے بندوں کے قریب ہے مالک الملک نے فرمایا ﴿وَاِذَاسَأَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ﴾ اور اے محبوب جب تم سے میرے بندے میرے متعلق پوچھیں تو میں نزدیک ہوں۔ " الرجیم " کا معنی ہے مرجوم یعنی مردود، لعنت اور بدبختی کے تیر اس پر برسائے گئے۔ اور رب کا بندہ نیک بختی کی رسی سے متعلق ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَاَلْزَمَهُمْ کَلِمَةَ التَّقْوٰی﴾ اور پرہیز گاری کا کلمہ ان پر لازم فرمایا اس بحث سے واضح ہوا کہ شیطان رب سے دور ہے رب کا بندہ رب کے قریب ہے اور رب تعالیٰ اپنے بندے کے قریب ہے شیطان کبھی رب کے قریب نہیں ہوسکتا اس لئے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللهِ تَحْوِیْلاً ﴾ اور ہرگز اللہ کے قانون کو ٹلتا نہیں پاؤ گے۔ یوں سمجھئے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا کہ اے انسان ﴿ اَعُوْذُ بِاللهِ ﴾ پڑھ کر شیطان سے دوری اختیار کر لے وہ تمہیں اپنے قریب کرنا چاہتا ہے لیکن یہ یاد رکھو کہ اگر تم اس کے قریب ہوئے جو رب سے دور ہے تو تم بھی رب سے دور ہو جاؤ گے لیکن اگر تم شیطان سے دور رہے تو رب تعالیٰ کے قریب ہو جاؤ گے۔ یہی رب تعالیٰ کا قانون ہے جو بدل نہیں سکتا۔

نمبر ۱۷: حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک پڑھنے سے تعوذ پڑھنے کا خصوصی طور پر حکم اس لئے دیا کہ انسان کی زبان کبھی جھوٹ، غیبت اور چغلخوری سے ناپاک ہوتی ہے اس لئے انسان کو تعوذ پڑھنے کا حکم دیا کہ پہلے وہ اپنی زبان کو پاکیزہ کرے پھر اللہ تعالیٰ کا پاک کلام پڑھے۔

نمبر ۱۸: یوں سمجھئے کہ رب تعالیٰ کہتا ہے:

" انه شیطان رجیم وانا رحمن رحیم فابعد عن الشیطان الرجیم لتصل الی الرحمن الرحیم " کہ وہ مردود شیطان ہے اور میں رحمٰن ورحیم ہوں اس لئے اے انسان اگر تو رحمٰن ورحیم تک پہنچنا چاہتا ہے تو پہلے مردود شیطان سے دور ہو جا۔

نمبر ۱۹: شیطان تمہارا دشمن ہے تم اس سے غافل ہو اور وہ تم سے غائب ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّہٗ یَرٰکُمْ ھُوَ وَقَبِیْلُہٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَھُمْ ﴾ بیشک وہ اور اس کا قبیلہ تمہیں دیکھتا ہے وہاں سے، جہاں سے تم اسے نہیں دیکھتے۔ "**فعلی ھذا لک عدو غائب ولک حبیب غالب**" اس سے معلوم ہوا کہ تمہارا دشمن تم سے غائب ہے اور تمہارا حبیب (اللہ تعالیٰ) غالب ہے۔

رب تعالیٰ نے فرمایا" واللہ غالب علی امرہ " اللہ تعالیٰ اپنے امر پر غالب ہے۔ لہذا اے انسان جب تیرا غائب دشمن تجھے بھٹکانا چاہے تو تو "اعوذ باللہ " پڑھ کر اپنے غالب حبیب کی پناہ میں آ جا۔

تعوذ میں مختصر الفاظ لیکن کثیر معانی:

انسان کے کئی اعمال اسے دینی طور پر نقصان پہنچاتے ہیں یعنی ہر کام جس سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہو اس پر عمل کرنا یقیناً اسے دینی طور پر نقصان پہنچائے گا۔

دنیاوی طور پر نقصان پہنچانے والی اشیاء یہ ہیں ہر قسم کے درد، بیماریاں، جلنا، غرق ہونا، فقر و احتیاج چلنے پھرنے کے قابل نہ رہنا اعضاء کا مفلوج ہو جانا، اندھا پن وغیرہ اس قسم کے بیشمار چیزیں انسان کے لئے دنیا میں نقصان دہ ہیں۔

"اعوذ باللہ" پڑھتے ہوئے ان تمام نقصانات دینیہ اور دینویہ کو مدنظر رکھے ان سے بھی پناہ پکڑے کیونکہ کسی نہ کسی ذریعے سے شیطان کی دخل اندازی ان میں ضروری ہوتی ہے کیونکہ بیماری سے انسان تنگ آ کر رب تعالیٰ کی شان کے خلاف کوئی لفظ بول جاتا ہے یہ دراصل شیطان کا بہکانا ہی ہے۔ بعض ایسے نقصانات ہیں جن کی کوئی حد نہیں ان نقصان دہ چیزوں میں جہالت بھی ہے اسکی

کوئی حد نہیں کیونکہ اس کے مدمقابل علم ہے ۔ جب علم کی کوئی حد نہیں تو یقیناً اس کے مدمقابل کی بھی کوئی حد نہیں۔" اعوذ باللہ " پڑھتے ہوئے جہالت سے پناہ پکڑے کیونکہ زیادہ طور پر کفر، بدعات، گمراہیوں کی دارومدار جہالت پر ہی ہے۔

اسی طرح فسق کی بھی کوئی حد نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی (جن چیزوں کا حکم دیا یا جن چیزوں سے روکا) ان کی مخالفت کا نام فسق ہی ہے لہذا "اعوذ باللہ" پڑھتے ہوئے فسق سے بھی پناہ پکڑے کیونکہ اس میں بھی شیطان دخل انداز ہوتا ہے۔ اسی طرح مکروھات، آفات وبلیات اور مخافات (خوف دلانے والی اشیاء) بھی کثیر اور بیحد ہیں ان میں بھی کہیں نہ کہیں شیطان کے اثرات پائے جاتے ہیں لہذا اعوذ باللہ پڑھتے ہوئے ان سے بھی پناہ حاصل ہوگی۔ غرضیکہ جب شیطان مردود سے پناہ پکڑے تو ذہن میں یہ لائے کہ اے اللہ مجھے شیطان کے ہر وسوسہ اور ہر طرح بہکانے اور اس کے اثر انداز ہونے سے بچا۔

(ماخوز از تفسیر مفاتیح الغیب المعروف بالکبیر للامام فخر الدین رازی رحمہ اللہ بالا ختصار والتصرف)

مسئلہ: قرآن پاک پڑھنے سے پہلے " تعوذ " کا پڑھنا مستحب ہے زیادہ اہل علم کا یہی قول ہے۔ اگرچہ بعض حضرات نے وجوب کا قول بھی کیا ہے اور بعض نے سنت کہا ہے البتہ نماز میں قراءت سے پہلے " تعوذ " کا پڑھنا سنت ہے راقم تلاوت سے پہلے بھی سنت کا ہی قائل ہے۔ اور نماز میں تعوذ فاتحہ کے تابع ہے جس نے قراءت نہیں کرنی اس نے تعوذ بھی نہیں پڑھنی یہی قول معتبر ہے اس مسئلہ میں اختلاف اور ہر طرف سے دلائل ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

مسئلہ جو غلط طور پر مشہور ہوگیا: عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ شاگرد کا استاذ کے سامنے " تعوذ " پڑھنا جائز نہیں حالانکہ اصل مسئلہ اس طرح نہیں ۔ علامہ ابن عابد بن شامی کے البحر الرائق کے حاشیہ منحۃ الخالق سے ایک عبارت نقل کر کے اس کا وہ مطلب بیان کرنا چاہتا ہوں جو میں نے سمجھا۔

" وحاصله انه اذ اراد ان يقول بسم الله الرحمن الرحيم لاياتى بالتعوذ قبلها الااذا اراد بها القراء ة اما اذا اراد بها افتتاح الكلام كما ياتى بها التلميذ فى اول درسه للعلم لا يتعوذ لان البسملة تخرج عن القرآنية بقصد الذكر "
(البحر الرائق الجزء الاول ص ۳۱۱)

حاصل کلام یہ ہے کہ جب کوئی شخص ﴿ بسم اللہ الرحمن الرحیم ﴾ پڑھنے کا ارادہ کرے تو اس کے لئے اس سے پہلے تعوذ پڑھنا سنت نہیں۔ہاں اگر اس نے تسمیہ کو بطور تلاوت قرآن پڑھا تو اس سے پہلے تعوذ کا پڑھنا سنت ہے جب کسی کام کو شروع کرنے کے لئے تسمیہ پڑھے تو اس سے پہلے تعوذ سنت نہیں کیونکہ اس صورت میں بسم اللہ ذکر ہے تلاوت نہیں جس طرح طالب علم سبق کے شروع میں بسم اللہ پڑھتا ہے تو اس کے لئے بھی تعوذ سنت نہیں کیونکہ جب بھی بسم اللہ کو ذکر کے طور پر پڑھا جائے گا اس پر احکام قرآن جاری نہیں ہوں گے۔خیال رہے کہ میں نے " لایتعوذ " کا معنی تعوذ سنت نہیں کیا ہے کیونکہ اس سے پہلے کی عبارت کو دیکھنے سے یہ عقدہ بھی حل ہو جائے گا۔

" وفی الذخیرة لیس فی المشروعیة وعدمھا بل فی الاستنان وعدمه ای فتسن للقراء ة ولا تسن لغیرھا ونفی السنیة لاینافی المشروعة ونص عبارة الذخیرة ھکذا اذا قال الرجل بسم اللہ الرحمن الرحیم فان اراد به قراء ة القرآن یتعوذ قبله لقوله تعالیٰ فاذا قرأت القرآن فاستعذ باللہ وان اراد افتتاح الکلام کما یقرأ التلمیذ علی الاستاذ لا یتعوذ قبله لانه لایرید قراء ة القرآن "

ذخیرہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ عام اذکار سے پہلے یا دیگر امور سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنے کے جائز ہونے یا جائز نہ ہونے میں تو کوئی کلام نہیں صرف سنت کے ہونے یا نہ ہونے میں کلام ہے یعنی قراءت کے لئے سنت ہے باقی مقاموں میں سنت نہیں۔سنت کی نفی سے جواز کی نفی نہیں ہوتی۔

ذخیرہ میں یہی ذکر ہے کہ جب بسم اللہ قراءت کی غرض سے پڑھے تو اس سے پہلے اعوذ باللہ سنت ہے اور جب کسی کام کے شروع میں بسم اللہ پڑھی جائے تو اس سے پہلے بسم اللہ سنت نہیں جس طرح طالب علم سبق سے پہلے بسم اللہ پڑھے تو اس سے پہلے اعوذ باللہ سنت نہیں۔

اصل مسئلہ اس طرح ہے کہ طالب علم سبق سے پہلے جب بسم اللہ پڑھے تو اس سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنا سنت نہیں۔لیکن اگر پڑھ لے تو جائز ہے بلکہ مستحب ہے تا کہ ایک دوسرے کی طرف (دوران سبق) دیکھنے اشارے کرنے ،سبق کو غور سے نہ سننے کے شیطانی وسوسوں سے بچ سکیں۔

سورۃ فاتحہ

اس سورۃ میں سات آیتیں، ایک رکوع ہے اور یہ مکی ہے، الفاظ پچیس، حروف ۱۲۳۔

سورۃ فاتحہ کے نام:

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے الاتقان میں سورۃ فاتحہ کے پچیس نام ذکر کئے ہیں۔

فاتحۃ الکتاب: حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

"**ھی ام القرآن وھی فاتحۃ الکتاب وھی السبع المثانی**" یہ سورت ام القرآن ہے فاتحۃ الکتاب ہے سبع مثانی ہے فاتحہ اس لئے کہا گیا ہے کہ قرآن پاک کی ترتیب میں اس سے ابتداء کی گئی ہے۔ تعلیم میں اسی سے ابتداء ہوتی ہے نماز میں قراءت کی اسی سے ابتداء ہوتی ہے ایک قول یہ بھی ہے کہ لوح محفوظ میں سب سے پہلے اسی سورۃ کو لکھا گیا ہے۔

فاتحۃ القرآن: چونکہ قرآن پاک کو "الکتاب" بھی کہا گیا ہے اور "القرآن" بھی۔ اس لئے جو وجوہ فاتحۃ الکتاب میں بیان کی گئی ہیں وہی فاتحۃ القرآن میں بھی ہیں۔

ام الکتاب: ام کا معنی ماں اور اصل ہے۔ سورۃ فاتحہ کو ام الکتاب کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مقدم ہے اور باقی اس کے تابع ہیں۔ اسی وجہ سے جنگ میں استعمال ہونے والے جھنڈے کو "ام الحرب" بھی کہا گیا ہے جس طرح "رأیۃ الحرب" کہا جاتا ہے ام کہنے کی یہی وجہ ہے کہ جھنڈا آگے ہوتا ہے اور لشکر اس کے پیچھے ہوتا ہے اور مکہ مکرمہ کو "ام القری" بھی اسی لئے کہا گیا ہے کہ وہ سب شہروں، بستیوں سے پہلے بنا ہے۔ ام الشئی، اصل الشئی کو بھی کہا جاتا ہے چونکہ فاتحہ اصل القرآن ہے کیونکہ قرآن پاک کی تمام اغراض کو شامل ہے اور قرآن پاک میں جتنے علوم اور حکمتیں ذکر ہیں فاتحہ ان کا خلاصہ ہے فاتحہ کس طرح خلاصہ ہے؟ اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد کا ذکر ہے، عبادت کا ذکر ہے، نھی کا ذکر ہے وعدہ اور وعید کا ذکر ہے قران پاک کی آیات ان چیزوں سے خالی نہیں۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے فرمایا تمام قرآن پاک میں چار چیزوں کا بیان مقصود ہے الٰھیات، معاد، نبوت، قضاء وقدر کا اثبات۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ میں الٰھیات کا ذکر ہے مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ میں معاد یعنی قیامت کا ذکر ہے اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں جبریہ فرقہ کا رد ہے اور قضاء اور تقدیر کا ثبوت ہے۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ سے لے کر سورۃ کے آخر تک نبوت کا ذکر بھی ہے اور قضاء کا بھی۔

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ فاتحہ میں ''احکام نظریہ احکام عملیہ یعنی صراط مستقیم پر چلنے کے احکام نیک لوگوں کے مراتب پر مطلع ہونا۔ بدبختوں کے مقام کا پتہ چلنا'' مذکور ہیں یہی چیزیں قرآن پاک میں موجود ہیں۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ فاتحہ میں علوم کی چار قسمیں مذکور ہیں جن پر دین کی دارومدار ہے:

پہلی قسم : علم اصول یعنی عقائد، اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی صفات کا ذکر اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ میں ہے۔ نبوت کی معرفت ﴿ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ﴾ سے سمجھ میں آئی ہے کیونکہ جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے ان میں اولین مقام انبیاء کرام کا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِنَ النَّبِیّٖنَ ﴾

اور قیامت کا ﴿مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ﴾ سے پتہ چلتا ہے۔ یہ سب عقائد ہیں یعنی چار میں سے یہ پہلی قسم ہے۔

دوسری قسم : فروع کا علم یعنی عبادات کا علم وہ ﴿ اِیَّاکَ نَعْبُدُ ﴾ سے حاصل ہو رہا ہے۔

تیسری قسم : اخلاقیات کا علم جن سے انسان رب تعالیٰ کے حضور پہنچتا ہے اور اسی کی پناہ میں آتا ہے۔ اور طریق مستقیم پر چلتا ہے یہ چیزیں ﴿ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾ سے سمجھ آ رہی ہیں۔

چوتھی قسم : پہلی امتوں کے واقعات اور ان میں سے نیک لوگوں اور ان پر احسانات وانعامات کا علم حاصل ہونا اسی طرح ان میں سے بدبختوں کے عذاب اور وعید کا پتہ چلنا ﴿ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ﴾ میں مذکور ہے۔

علامہ غزالی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ فاتحہ میں چھ چیزوں کا ذکر ہے تین چیزیں اصل ہیں یعنی اہم ہیں اور تین چیزیں ان کے تابع ہیں پہلی تین چیزیں اللہ تعالیٰ کی حمد جو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں مذکور ہے اور طریق مستقیم جس کو واضح طور پر ﴿اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾ سے بیان کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع یعنی آخرت کا ذکر ﴿مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ میں کیا گیا ہے۔ دوسری تین چیزیں، نیک لوگوں کے احوال کا ذکر ﴿اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ﴾ میں ہے۔ منکرین کے حالات کو ﴿غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ﴾ میں بیان کیا گیا ہے منازل الطریق یعنی صراط مستقیم کی منزلیں اور اس پر قائم رہنے کے ذرائع کو ﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ سے بیان کیا گیا ہے۔ (الاتقان ص ۱۵۷)

اس بحث سے واضح ہو گیا کہ سورۂ فاتحہ قرآن پاک کے تمام مضامین کا خلاصہ اور اصل ہے اسی لئے اسے "ام الکتاب" کہا گیا ہے۔

" ام الکتاب " کہنے کی اور وجہ یہ بھی ہے کہ قوم کے رئیس اور سردار کو " ام القوم " کہا جاتا ہے اس لئے سورۂ فاتحہ کو دوسری سورتوں پر افضلیت حاصل ہونے کی وجہ سے "ام الکتاب " کہا گیا ہے۔

ام القرآن : سورۂ فاتحہ کا اور نام " ام القرآن " بھی ہے اس میں تمام وہی وجوہ ہیں جو " ام الکتاب " میں بیان کی گئی ہیں خیال رہے کہ جمہور کے نزدیک فاتحہ کا نام " ام الکتاب " صحیح ہے البتہ حضرت انس، حضرت حسن بصری اور ابن سیرین رضی اللہ عنہم کا اختلاف ہے وہ فاتحہ کا " ام الکتاب " نام نہیں رکھتے۔

حضرت حسن بصری کہتے ہیں " ام الکتاب " حلال وحرام کو کہا گیا ہے رب تعالیٰ نے فرمایا " آیات محکمات هن ام الکتاب واخر متشابهات " کچھ آیتیں محکم ہیں وہی کتاب کی اصل ہیں اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں۔

حضرت انس اور ابن سیرین کہتے ہیں ام الکتاب لوح محفوظ کو کہا گیا ہے رب تعالیٰ نے فرمایا " وانه فی ام الکتاب" بیشک وہ اصل کتاب میں ہے یعنی قرآن پاک لوح محفوظ میں ہے۔

ام القرآن نام رکھنے میں بھی حضرت انس وابن سیرین رضی اللہ عنہما کا اختلاف ہے لیکن راقم کے نزدیک وجوہ اختلاف ضعیف ہیں جمہور کا قول ہی صحیح ہے کیونکہ فاتحہ کو بھی ام الکتاب کہا گیا ہے۔آیات محکمات کو بھی ام الکتاب کہا گیا ہے اور لوح محفوظ کو بھی ام الکتاب کہا گیا ہے کئی چیزوں کا ایک نام ہوجائے تو اس میں کیا حرج ہے؟اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو حدیث پہلے ذکر کی ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "الحمد للہ" ام القرآن ہے ام الکتاب ہے سبع مثانی ہے اس حدیث کو ترمذی نے "صحیح حسن" کہا ہے اور بخاری میں ہے:

"وسميت ام الكتاب لانه يبتدأ بكتابتها في المصاحف ويبدأ بقراء تها في الصلوة"

فاتحہ کا نام "ام الکتاب" رکھا گیا ہے کیونکہ اسے ابتداء میں لکھا جاتا ہے اور نماز کی قراءت کی اسی سے ابتداء ہوتی ہے۔

القرآن العظیم: یہ نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ سورۃ قرآن پاک کے تمام علوم کو شامل ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کی صفات کمالیہ اور صفات جلالیہ کا ذکر ہے، اور اس میں عبادات اور عبادات میں خلوص کا حکم دیا گیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی معاونت کے بغیر کسی چیز کو قائم کرنا امور کو بجالانے میں عاجز ہونے کے اعتراف کو اس میں بیان کیا گیا ہے، صراط مستقیم کی ہدایت میں بھی اسی کی طرف رجوع کرنے کا ذکر اس میں موجود ہے، نیک لوگوں یعنی مستحقین انعام کا ذکر اس میں موجود ہے اور منکرین کے عذاب کو اس میں بیان کیا گیا ہے، یہی وجوہ ہیں جن کے پیش نظر اس سورۃ کو القرآن العظیم کا نام دیا گیا ہے۔

اس پر ایک حدیث پاک بھی دلالت کررہی ہے جو مسند احمد میں مذکور ہے:

" عن ابی هريرة ان النبی صلی الله عليه وسلم قال لام القرآن هی ام القران وهی السبع المثانی وهی القرآن العظيم "

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بیشک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے " ام القرآن " (فاتحہ) کے متعلق فرمایا کہ یہ " ام القران " ہے یہ سبع مثانی ہے اور یہ قرآن عظیم ہے۔

سبع المثانی : یہ نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ "السبع" کا معنی ہے سات چونکہ اس سورۃ میں سات آیتیں ہیں لہذا اس وجہ سے اس کے نام میں " السبع" آ گیا۔ المثانی کہنے کی یہ وجہ ہے کہ ہوسکتا ہے یہ لفظ " الثناء " سے لیا گیا ہو چونکہ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ کی ثناء موجود ہے لہذا اسے " المثانی" کہہ دیا گیا ہے، اور ممکن ہے کہ یہ لفظ " الثنیا " سے لیا گیا ہو جس کا معنی ہے علیحدہ کرنا چونکہ یہ سورۃ اس امت کے لئے علیحدہ کر کے رکھ دی گئی تھی اس لئے اسے "مثانی" کہہ دیا گیا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ لفظ " تثنیہ " سے لیا گیا ہو چونکہ اسے ہر رکعت میں پڑھا جاتا ہے تو اس وجہ سے مثانی کہا گیا ہو کہ اس کو نماز میں کئی بار پڑھا جاتا ہے یہ وجہ تمام وجوہ سے قوی نظر آتی ہے کیونکہ اس پر ایک حدیث جریر نے بسند حسن عن عمر پیش کی ہے وہ حدیث یہ ہے :

" عن عمر قال السبع المثانی فاتحة الکتاب تثنی فی کل رکعة "

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سورۃ فاتحہ کو سبع مثانی اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ بار بار پڑھی جاتی ہے یعنی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ دو مرتبہ نازل ہوئی اس لئے اسے سبع مثانی کہا جاتا ہے خیال رہے کہ سورۃ فاتحہ کے مکی اور مدنی ہونے میں بھی دو مختلف قول ہیں ان میں تطبیق بھی بعض حضرات نے اسی قول سے دی کہ ایک مرتبہ ہجرت سے پہلے نازل ہوئی لہذا مکی ہے اور ایک مرتبہ ہجرت سے بعد میں ہوئی لہذا مدنی ہے لیکن مکی ہونے والا قول ہی زیادہ معتبر ہے اسی لئے عنوان میں اسی کو ذکر کیا ہے۔

ثناء اور دعا پر مشتمل ہونے کی وجہ سے سبع مثانی کہلاتی ہے اور الفاظ مبارکہ کی فصاحت اور معانی کی بلاغت پر مشتمل ہونے کی وجہ سے بھی اسے سبع مثانی کہا گیا ہے۔

الوافیة: یہ نام رکھنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ سورۃ قرآن پاک کے معانی پر مشتمل ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ تنصیف (آدھا کرنا) کو قبول نہیں کرتی کیونکہ باقی سورتوں میں سے کچھ حصہ بھی نماز میں ادا کر دیا جائے تو جائز ہے لیکن فاتحہ کو جب تک مکمل نہ پڑھا جائے وجوب ادا نہیں ہوتا۔

تیسری وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بھی ہے اور بندے کی عبادت واستعانت کا ذکر بھی ہے لہذا بندے کے ذکر اور رب تعالیٰ کے ذکر پر مشتمل ہونے کی وجہ سے بھی وافیہ کہلاتی ہے۔ کیونکہ وافیہ کا معنی پورا ہونے والی۔

الکنز: یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ سورۃ قرآن پاک کے تمام مضامین کا خلاصہ ہے اور قرآن پاک تمام مسائل کا خزانہ ہے

"وقال ابن مسعود من اراد علم الاولین والآخرین فلیتل القرآن"

(روح المعانی الجز الاول ص۷)

ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا جو شخص سب اگلوں اور پچھلوں کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ قرآن پاک کی تلاوت کرے واضح ہوا کہ یہ سورۃ بھی کنز ہے یہ نام حدیث پاک سے ثابت ہے۔

" قد خرج البیھقی فی الشعب من حدیث انس مرفوعا ان اللہ اعطانی فیما مّن بہ علی انی اعطیتک فاتحۃ الکتاب وھی من کنوز عرشی "

(الاتقان ص ۳۸)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنا احسان فرماتے ہوئے یہ فرمایا کہ میں نے تمہیں فاتحۃ الکتاب دی جو میرے عرش کے خزانوں میں سے ہے۔

الکافیۃ: یحیٰ ابن کثیر کہتے ہیں " لانھا تکفی عن سواھا ولایکفی سواھا عنھا " سورۃ فاتحہ کو اسلئے " کافیہ " کہا گیا ہے کہ یہ غیر کی جانب سے کفایت کرتی ہے اور اس کا غیر اس کی جانب سے کافی نہیں۔ اس پر ایک روایت دلالت کر رہی ہے جو محمد بن خلاد اسکندرانی سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" ام القرآن عوض من غیرھا ولیس غیرھا منھا عوضا "

ام القرآن (فاتحہ) اس کے غیر سے عوض ہے اور اس کا غیر اس سے عوض نہیں۔

الاساس: اساس کا معنی ہے بنیاد یہ اصل قرآن ہے اور مکمل سورۃ بحیثیت سورۃ سب سے پہلے یہی نازل ہوئی۔ ایک شخص نے شعبی رحمہ اللہ کی خدمت میں عرض کیا۔ میرے پہلو میں درد ہے انہوں نے کہا:

" علیک باساس القرآن فاتحۃ الکتاب " تم اساس القرآن یعنی فاتحۃ الکتاب پڑھو (یعنی پڑھ کر دم کرو)۔ شعبی بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا ہر چیز کی اساس (بنیاد، اصل) ہے۔

" **واساس الدنیا مکۃ** " دنیا کی اساس مکہ ہے کیونکہ سب سے پہلے زمین کو وہاں سے پھیلانا شروع کیا گیا۔

" **واساس السموات عریبا** " آسمانوں کی اساس عریبا ہے یہ ساتویں آسمان کا نام ہے۔ بعض جگہ پر عریبا بھی آیا ہوا ہے۔

" **واساس الارض عجیبا** " زمین کی اساس عجیبا ہے یہ سب سے نیچے ساتویں زمین کا نام ہے۔

" **واساس الجنان جنۃ عدن** " جنتوں کی اساس جنت عدن ہے یہ سب جنتوں کی ناف کی حیثیت رکھتی ہے جس سے جنت کی بنیاد رکھی گئی۔

" **واساس النار جھنم** " آگ کی اساس جہنم ہے یہ دوزخ کے طبقوں میں سے نیچے طبقہ کا نام ہے۔

" **واساس الخلق آدم** " مخلوق کی اساس آدم ہیں کیونکہ آپ ہی سب سے پہلے انسان ہیں جو دنیا میں آئے۔

" **واساس الانبیاء نوح** " انبیاء کی اساس حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔ سب سے پہلے کفار آپ کے زمانے میں ہی ہوئے جن کو آپ نے تبلیغ فرمائی۔

" **واساس بنی اسرائیل یعقوب** " بنی اسرائیل کی اساس حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں کیونکہ آپ کا نام ہی اسرائیل تھا۔

" **واساس الکتب القرآن** " کتابوں کی اساس قرآن پاک ہے کیونکہ یہ اصل الکتب ہے۔

[illegible]حۃ " قرآن پاک کی اساس فاتحہ ہے۔

" **واساس الفاتحۃ بسم اللہ الرحمن الرحیم** " فاتحہ کی اساس بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے۔

اس تمام بیان کے بعد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا " **واذ اعتللت و اشتکیت فعلیک بالفاتحۃ تشفی** " جب تم بیمار ہو یا تمہیں درد ہو تو فاتحہ پڑھو (یعنی فاتحہ پڑھ کر دم کرو) تمہیں شفا حاصل ہوگی۔

الشفاء : دارمی نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" فاتحة الکتاب شفاء من کل سم " سورۃ فاتحہ ہر زہر یعنی ہر بیماری سے شفاء ہے۔ دارمی نے ہی عبد الملک بن عمیر سے روایت ذکر کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:" فی فاتحة الکتاب شفاء من کل داء " فاتحۃ الکتاب میں ہر بیماری سے شفاء ہے۔

(مشکوۃ فضائل القرآن)

الشافیۃ: اس نام کی وہی وجوہ ہیں جو الشفاء کی ہیں۔

الرقیۃ: دم کرنا ،یعنی فاتحہ دم ہے ۔حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بیشک نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام سفر میں تھے وہ عرب کے قبائل میں سے ایک قبیلہ سے گزرے ان سے انہوں نے مہمانی طلب کی (کھانا طلب کیا) انہوں نے ان کی مہمانی نہ کی (کھانا نہ دیا) تھوڑی ہی دیر بعد ان میں سے کچھ آدمی آئے انہوں نے کہا ،کیا تم میں کوئی دم کرنے والا ہے؟ کیونکہ ہماری قوم کے سردار کو کسی سانپ وغیرہ نے ڈس لیا ہے ایک شخص نے ان میں سے کہا ہاں وہ آئے سورۃ فاتحہ پڑھ کر اس پر دم کیا۔ وہ شخص ٹھیک ہوگیا انہوں نے ہمیں کچھ (تیس کی تعداد میں) بکریاں دیں ہم نے قبول کرنے سے انکار کردیا (کہ پہلے رسول اللہ ﷺ سے پوچھیں گے)ہم نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا تو آپ نے وہ بکریاں لینے کی اجازت دے دی:

" فقال یا رسول الله والله مارقیت الابفاتحة الکتاب فتبسم وقال ما ادراک انهارقیة "

وہ دم کرنے والے صحابی عرض کرنے لگے یارسول اللہ قسم ۔ہے اللہ تعالیٰ کی میں نے تو صرف سورۃ فاتحہ کو پڑھ کر دم کردیا تھا۔آپ نے فرمایا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ بھی دم ہے۔

اور آپ نے فرمایا تم وہ بکریاں لے لو اور میرا حصہ بھی رکھ لو (یہ دراصل صحابہ کرام کے دل کی تسلی کے لئے تھا کہ وہ ذرا بھر بھی اس کے جائز ہونے میں شک نہ کریں کیونکہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا حصہ بھی رکھا۔

(مسلم ج۲ ص ۲۲۴ باب جواز الاخذ اجیرۃ علی الرقیۃ)

الصلوٰۃ: اس سورۃ کو الصلوٰۃ اس لئے کہا گیا ہے کہ حدیث قدسی میں آتا ہے رب تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے " قسمت الصلوة بيني وبين عبدى " میں نے صلوۃ اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کر دی۔

اس اجمال کی تفصیل حدیث پاک کا زیادہ حصہ پڑھنے سے سمجھ میں آئیگی۔آیئے ذرا تفصیل دیکھیں

"(قال ابوهريرة) فانى سمعت رسول الله ﷺ يقول يقول الله عزوجل قسمت الصلوة بيني وبين عبدى نصفين فنصفهالى ونصفها لعبدى ولعبدى ماسأل قال رسول الله ﷺ اقرؤا يقول العبد الحمد لله رب العلمين يقول الله عزوجل حمدنى عبدى يقول العبد الرحمن الرحيم يقول الله عزوجل اثنى على عبدى يقول العبد مالك يوم الدين يقول الله عزوجل مجدنى عبدى يقول العبد اياك نعبد واياك نستعين فهذه الاية بيني وبين عبدى ولعبدى ماسأل يقول العبد اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين فهؤلاء لعبدى ولعبدى ما سأل يقول العبد اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين فهؤلاء لعبدى ولعبدى ما سأل"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بیشک میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے ہوئے سنا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں نے صلوٰۃ اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کر دی۔اس کے دو حصے بنا دیئے نصف میرے لئے ہے اور نصف میرے بندے کے لئے میرے بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے سوال کیا۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (فاتحہ کو) پڑھو۔بندہ کہتا ہے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد بیان کی۔بندہ جب پڑھتا ہے ﴿الرحمن الرحیم﴾ رب تعالیٰ کہتا ہے میرے بندے نے میری ثناء بیان کی۔بندہ جب ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ پڑھتا ہے تو ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی بندہ جب عرض کرتا ہے ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ مالک کائنات فرماتا ہے یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے اور بندے کے لئے وہی ہے جو اس نے سوال کیا۔

بندہ جب تلاوت کرتا ہے ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ، صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ،غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ (تو رب ذوالجلال فرماتا ہے) یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے وہ جو اس نے سوال کیا۔

مختصر وضاحت : " قال العلماء المراد بالصلوة ههنا الفاتحة " علماء نے حدیث پاک کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کیا کہ حدیث پاک میں جو لفظ " الصلوة " واقع ہے اس سے مراد فاتحہ ہے اب معنی حدیث پاک کا یہ ہوگا کہ میں نے اپنے اور اپنے بندے کے درمیان فاتحہ کو نصف نصف تقسیم کر دیا ہے۔ فاتحہ کو صلوۃ کیوں کہا گیا؟ اس لئے کہ ہر نماز میں فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے امام یا منفرد فاتحہ کو نہ پڑھیں تو نماز ان کی کامل نہیں ہوگی۔ کیونکہ واجب چھوٹ گیا۔

نصف نصف تقسیم کرنے کا یہ مطلب ہے کہ تین آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد ثنا اور بزرگی کا ذکر ہے اور تین آیتوں میں بندے کی دعاء کا ذکر ہے اور ایک آیت میں اشتراک ہے۔ کہ عبادت اور استعانت کی اللہ تعالیٰ سے تخصیص ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ اور بندے کا عجز اور امداد طلب کرنے کی وجہ سے بندے کے لئے ہے۔ ذکر کردہ بحث سے واضح ہو گیا کہ فاتحہ کا ایک نام "صلوة" بھی ہے۔

سورة الحمد: فاتحہ کا ایک نام " الحمد " ہے کیونکہ اس میں " الحمد " کا ذکر ہے اس مناسبت سے نام ہی " سورہ الحمد" ہوگیا جس طرح سورۃ الاعراف کا نام اسی وجہ سے " الاعراف " ہے کہ اس میں " الاعراف " کا ذکر ہے "الانفال" کا نام الانفال کے ذکر کی وجہ سے ہے التوبۃ کا نام " التوبة " کے ذکر کی وجہ سے ہے اسی طرح اور کئی سورتوں کے نام رکھنے میں بھی یہی وجہ آپ کو نظر آئے گی۔

" سورة الحمد الاولی " جب اس میں الحمد ذکر ہے تو نام الحمد ہو گیا اور ترتیب میں سب سے پہلے ذکر کرنے کی وجہ سے اس سورۃ کا نام " الاولی" ہو گیا مجموعی نام " سورة الحمدا لاولی" ہوگیا۔

سورۃ الحمد القصری:

چھوٹی سورۃ الحمد: پانچ سورتوں کو الحمد سے شروع کیا گیا ہے یہ ان تمام سے چھوٹی ہے اس لئے اس کا نام ہی "سورۃ الحمد القصری" رکھ لیا گیا۔

سورۃ النور: فاتحہ کا ایک نام نور بھی ہے جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے اور انبیاء کرام کا بھی چونکہ رب تعالیٰ نے اپنی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا ﴿اللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کو منور کرنے والا ہے نبی کریم ﷺ کے نور کو ذکر فرماتے ہوئے ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے ﴿قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ﴾ تحقیق تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور کتاب مبین آئی۔ نور سے مراد نبی کریم ﷺ اور کتاب مبین سے مراد بھی آپ کی ہی ذات یا قرآن پاک۔

فاتحہ کو اور نور کہنے کی وجہ یہ ہے کہ فاتحہ قرآن پاک کا خلاصہ ہے اور قرآن پاک کو رب تعالیٰ نے نور کہا ہے ارشاد ہوتا ہے ﴿وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا﴾ ہم نے تمہاری طرف روشن نور کو نازل کیا۔ جب قرآن پاک نور ہوا تو یقیناً اس کا خلاصہ یعنی فاتحہ بھی نور ہے۔

سورۃ فاتحہ کو نور کہنے کی اور وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں انبیاء کرام، صدیقین شھداء، صالحین کا ذکر ہے اور قرآن پاک کا خلاصہ ہے جب کہ مشہور سورۂ نور جس میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی براءت اور آپ کی شان کا ذکر ہے اس کا بھی فاتحہ یقیناً خلاصہ ہے۔ کیونکہ عائشہ صدیقہ بنت صدیق اکبر زوجہ نبی الانبیاء کا جس سورۃ میں وضاحت سے ذکر ہے اس کا نام سورۂ نور ہے تو جس سورۃ میں اجمالی طور پر ذکر ہے اس کا نام بھی نور ہو گیا ایک حدیث پاک سے نور ہونا واضح ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ کے پاس میں بیٹھا ہوا تھا اوپر سے ایک آواز سنائی دی۔ آپ نے اپنے سر کو آسمان کی طرف اٹھایا آپ نے فرمایا کہ بیشک آسمانوں میں سے ایک دروازہ کھولا گیا ہے۔ جو اس سے پہلے نہیں کھولا گیا اس سے ایک فرشتہ نازل ہوا اس نے کہا:

" یا محمد ابشر بنورین لم یؤتھما احد من قبلک فاتحۃ الکتاب وخواتیم سورۃ البقرۃ "

اے محمد دونوروں پر خوش ہو جائیے جو آپ سے پہلے کسی ایک (نبی) کو نہیں دیئے گئے ایک نور فاتحۃ الکتاب اور دوسرا نور سورۂ بقرہ کی آخری آیات۔

سورۃ الشکر: جب اس سورۃ میں حمد کا ذکر ہے تو یقیناً ساتھ ساتھ شکر کا بھی ذکر پایا گیا ہے اس لئے حمد کی قسموں سے وہ حمد جس میں اللہ تعالیٰ کی تعریف زبان سے ہو اور رب تعالیٰ کی نعمت کے مقابل ہو یعنی اللہ تعالیٰ کی ان گنت نعمتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جب حمد کی جائے گی تو یہ شکر بھی ہے اسی لئے اس کا نام "سورۃ الشکر" بھی ہے۔

سورۃ السوال: چونکہ اس سورۃ میں بندہ اپنے رب سے سوال کرتا ہے اس لئے اس کا نام ہی سورۃ السوال ہو گیا جیسا کہ پہلے حدیث پاک میں گزر گیا " فلعبدی ماسأل " رب تعالیٰ کہتا ہے میرے بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے سوال کیا۔

سورۃ الدعاء: جب اس سورۃ میں بندے کی دعاء کا ذکر پایا گیا ہے تو اس کا نام سورۃ الدعاء ہو گیا بندہ رب تعالیٰ کے حضور عرض کرتا ہے ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ (اے اللہ) ہمیں سیدھی راہ پر چلا یہ دعا ہی ہے۔

سورۃ تعلیم المسئلۃ: " لان فیھا آداب السوال لانھا بدئت بالثناء قبلہ " بیشک اس سورۃ میں رب تعالیٰ سے سوال کرنے دعاء کرنے کے آداب بیان کئے گئے کیونکہ پہلے رب تعالیٰ نے اپنی حمد کا ذکر کیا اپنی رحمت کاملہ کا ذکر فرمایا قیامت کی جزاء اور وہ اسی کے قبضہ قدرت میں ہے اس کا ذکر کیا بندے کے عجز کا ذکر کیا کہ بندہ اعتراف کرتا ہے کہ اے اللہ عبادت تیرے ساتھ ہی خاص ہے اور امداد تجھ سے ہی طلب کرتے ہیں پھر بندہ دعا کرتا ہے گویا اس سورۃ میں دعا کرنے کی تعلیم دی گئی کہ اے انسان پہلے تو رب تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کر پھر رب تعالیٰ سے سوال کر اور دعاء کر اب اس سورۃ کا نام " تعلیم المسئلہ " ہونے کی حکمت واضح ہوگئی۔

فائدہ جلیلہ: فضالہ بن عبید کہتے ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے تھے ایک شخص آیا اس نے نماز ادا کی اور اس کے بعد متصل ہی دعا کی " اللھم اغفرلی وارحمنی " اے

اللہ میری مغفرت فرما اور مجھ پر رحم فرما۔تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے جلدی کی اے نمازی " **اذ اصلیت فقعدت فاحمد الله بماهوا هله و صل علی ثم ادعه** " جب تم نماز پڑھ لو تو بیٹھ جاؤ، اللہ تعالیٰ کی حمد کرو اور مجھ پر درود پڑھو، پھر دعاء کرو۔

" قال ثم صلی رجل آخر بعد ذلک فحمد الله وصلی علی النبی ﷺ فقال له النبی ﷺ ایها المصلی ادع تجب "

(ترمذی ،ابو داؤد ،نسائی ،مشکوۃ باب الصلوۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

راوی کہتے ہیں۔پھر ایک اور شخص آئے انہوں نے نماز ادا کی ۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد کی اور نبی کریم ﷺ پر درود پڑھا۔تو نبی کریم علیہ وسلم نے فرمایا۔اے نمازی دعاء کرو تمہاری دعاء کو قبول کیا جائے گا

"**عجلت ایها المصلی**" (اے نمازی تم نے جلدی کی) پر حضرت علامہ علی قاری رحمہ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

" فیه دلالة علی ان من حق السائل ان یتقرب الی المسئول منه بالوسائل قبل طلب الحاجة بما یوجب الزلفی عنده ویتوسل بشفیع له بین یدیه لیکون اطمع فی الاسعاف وارجی بالاجابة فمن عرض السوال قبل الوسیلة فقداستعجل " (مرقاۃ ج ۲ ص ۳۴۴)

اس سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ سائل وسائل کے ذریعے اس ذات کا قرب حاصل کرتا ہے جس سے مانگ رہا ہے یعنی یہ حالت حاجت کی طلب سے پہلے ہوتا کہ اس کا قرب حاصل ہو وسیلہ بھی اس ہستی کو بنانا چاہئے جو اس کے سامنے شفاعت (سفارش) کر سکے تاکہ یہ اپنی مراد کے پورا ہونے کا طمع کر سکے اور دعا کی قبولیت کی امید کر سکے۔جس شخص نے بغیر وسیلہ کے سوال کر لیا اس نے گویا کہ جلدی کر لی۔

اب روز روشن کی طرح واضح ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ کے بغیر دعا کی مقبولیت کا کوئی یقین نہیں اور آپ کا وسیلہ حاصل کرنے کے لئے آپ پر درود شریف پڑھے۔

خصوصاً درود شریف رب تعالیٰ کی تعریف بھی ہے اور رسول اللہ ﷺ کی تعظیم بھی اس میں پائی جاتی ہے۔ایک حدیث پاک اور اس کی مختصر وضاحت سے یہ مسئلہ بھی نکھر کر سامنے آجائے گا۔

آیئے حدیث پاک کی طرف توجہ فرمائیں:

" عن ابی بن کعب قال قلت یا رسول اللہ انی اکثر الصلوة علیک فکم اجعل لک من صلاتی فقال ماشئت قلت الربع قال ماشئت فان زدت فھو خیر لک قلت النصف قال ماشئت فان زدت فھو خیر لک قلت فالثلثین قال ماشئت فان زدت فھو خیر لک قلت اجعل لک صلوتی کلھا قال اذا تکفی ھمک ویکفر لک ذنبک "

(ترمذی، مشکوۃ باب الصلوۃ علی النبی ﷺ)

ابی بن کعب کہتے ہیں میں نے کہا یارسول اللہ میں آپ پر زیادہ وقت درود پاک پڑھنا چاہتا ہوں کتنا وقت آپ پر درود پڑھوں؟ آپ نے فرمایا جتنا چاہتے ہو، میں نے کہا وقت کا چوتھا حصہ پڑھ لیا کروں؟ آپ نے فرمایا جتنا چاہتے ہو، اگر زیادہ کرلو تو تمہارے لئے بہتر ہے۔ میں نے کہا نصف وقت پڑھ لیا کروں؟ آپ نے فرمایا جتنا چاہتے ہو۔ اگر زیادہ کرلو تو تمہارے لئے بہتر ہے۔ میں نے کہا دوتہائی وقت پڑھ لیا کروں؟ آپ نے فرمایا جتنا چاہتے ہو اگر زیادہ کرلو تو تمہارے لئے بہتر ہے۔ میں نے کل وقت ہی پڑھ لیا کروں؟ آپ نے فرمایا یہ تو تمہارے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے کافی ہوگا اور تمہارے گناہوں کو مٹا دے گا۔

خیال رہے کہ وقت سے مراد " اجعل ربع اوقات دعائی لنفسی مصروفا للصلوۃ علیک " میں اپنی دعا کے اوقات میں سے چوتھا حصہ آپ پر درود پڑھ لیا کروں۔ اسی طرح نصف ،دوتہائی کل وقت سے مراد بھی اوقات دعا ہی ہیں۔ صحابی عرض کرتے رہے نبی کریم ﷺ زیادہ وقت صرف کرنے پر برانگیختہ کرتے رہے یہاں تک کہ صحابی نے عرض کیا:

" اجعل لک صلوتی کلھا ای اصلی علیک بدل ما ادعو بہ لنفسی فقال اذن تکفی ھمک ای ما اھمک من امر دینک ودنیاک وذلک لان الصلوۃ علیہ مشتملۃ علی ذکر اللہ وتعظیم الرسول ﷺ والاشتغال باداء حقہ عن اداء مقاصد نفسہ وایثارہ بالدعاء علی نفسہ ما اعظمہ من خلال جلیلۃ الاخطار واعمال کریمۃ الآثار " (مرقاۃ ج ۲ ص ۳۴۳)

کہ یارسول اللہ میں کل وقت آپ پر درود پڑھ لیا کروں یعنی دعاء کرنے کی بجائے دعا کے تمام

وقت میں آپ پر درود ہی پڑھ لیا کروں؟ تو آپ نے فرمایا یہ تمہارے ارادہ کیلئے کافی ہے یعنی دین اور دنیا کے امور میں جو بھی تم ارادہ کرو گے تمہارے لئے یہ کافی ہوگا کیونکہ درود میں اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی ہے اور رسول کریم اللہ ﷺ کی تعظیم بھی اسلئے کہ دعاء میں اپنے حقوق و مقاصد مد نظر ہوتے ہیں۔ اپنے مقاصد سے حضور کے حقوق کو ادا کرنا ہی یقیناً بہتر ہے۔ اپنے لئے دعا کرنے پر رسول اللہ ﷺ کے عظیم ذکر کو ترجیح دیجائے تو یہ خود بخود مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہوگا اور گناہوں کا کفارہ بنے گا۔

صرف نام محمد ﷺ بھی ذکر خدا ہے:

نبی کریم ﷺ کا نام رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کے دادا عبدالمطلب کو الہام کیا کہ آپ کا نام " **محمد** " رکھا جائے تا کہ زمین و آسمان والے آپ کی تعریف کریں اسی امید سے حضرت عبدالمطلب نے آپ کا نام " **محمد** " رکھا اللہ تعالیٰ نے آپ کی امید کو پورا کیا بخاری نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا۔

" وشق له من اسمه ليجله فذو العرش محمود وهذا محمد "

اللہ تعالیٰ نے اپنے نام سے آپ کے نام کو مشتق کیا تا کہ آپ کو بزرگی حاصل ہو پس صاحب عرش محمود ہے اور یہ محمد ہیں

واضح ہوا کہ جب مشتق کو ذکر کریں تو مصدر اس میں خود ہی معتبر ہوتا ہے جب نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم پڑھیں گے تو یقیناً آپ کے ذہن میں " **محمود** " بھی آئے گا۔

درود شریف کے بغیر دعاء موقوف رہتی ہے:

درود شریف کے بغیر دعاء موقوف رہتی ہے:

" وعن عمر بن الخطاب رضی الله عنه قال ان الدعاء موقوف بين السماء والارض لا يصعد منها شئی حتی تصل علی نبيک

"(ترمذی، مشکوة باب الصلوة علی النبی صلی الله علیه وسلم)

حضرت عمر بن خطابؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک دعاء زمین و آسمان کے درمیان معلق رہتی ہے اس کا کچھ حصہ بھی اوپر نہیں چڑھتا یہاں تک کہ تم اپنے نبی کریم ﷺ پر درود پڑھو۔

" الخطاب عام لا يختص بمخاطب دون مخاطب" خطاب عام ہے کسی خاص مخاطب سے مختص نہیں۔ یعنی اے ہر شخص دعاء کرنے والے تو کسی حاجت کا بھی اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا چاہے تو اپنی دعا سے پہلے بھی نبی کریم ﷺ پر درود پڑھ اور آخر میں بھی۔

" فان الله سبحانه يكرمه يقبل الصلوتين وهو اكرم من ان يدع ما بينهما"

بیشک اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اول وآخر پڑھے ہوئے درود شریف کو قبول فرمائے گا تو اس کی شان کریمی کے یہ خلاف ہے کہ وہ درمیان میں کی ہوئی دعا کو چھوڑ دے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب یہ فرمایا تم اپنے نبی (کریم صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود پڑھو تو اس سے یہ سمجھ آ گیا کہ نبی مشتق ہے نبوۃ سے جس کا معنی ہے رفعت وبلندی تو مطلب یہ ہوا:

" لا يرفع الدعاء الى الله تعالىٰ حتى يستصحب الرافع منه يعني ان الصلوة على النبي ﷺ هي الوسيلة الى الاجابة " (مرقاة ج ۲ ص ۳۴۸)

کہ رب تعالیٰ کے حضور دعاء کو رفعت حاصل نہیں ہوگی جب تک اس کے ساتھ اس کو بلند کرنے والی کوئی چیز نہیں ہوگی جب نبی کریم ﷺ کو بلندی ورفعت حاصل ہے تو آپ کی طرف منسوب ہونے والا درود پاک بھی رفیع وبلند ہوگا جب درود کو رفعت کے پیش نظر شرف قبولیت حاصل ہوگی تو یہ دعاء کی قبولیت کا وسیلہ بن جائے گا۔

سورة المناجاة: سورۃ فاتحہ کا نام مناجاۃ رکھنے کی یہ وجہ ہے کہ انسان ﴿ اِيَّاکَ نَعْبُدُ وَاِيَّاکَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ پڑھ کر رب تعالیٰ سے مناجاۃ کرتا ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ پہلے غائب کا ذکر ہے یعنی ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ﴾ سے لے کر ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ تک اس کے بعد ﴿ اِيَّاکَ نَعْبُدُ وَاِيَّاکَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ میں خطاب ہے اس میں عجیب حکمت ہے اس کا ذکر انشاء اللہ فاتحہ کی ان آیات کی تفسیر میں ہی آئے گا۔

سورة التفويض: تفویض کا معنی ہے سپرد کرنا سورۃ فاتحہ کا نام تفویض اس لئے رکھا گیا ہے کہ انسان جب ﴿واياک نستعين﴾ پڑھتا ہے اور رب تعالیٰ سے " استعانت " کو خاص کرتا ہے تو گویا کہ اپنے تمام معاملات کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے گویا یوں کہیں کہ بندہ کہتا ہے اے مولیٰ کائنات میں کچھ نہیں سب کچھ تو ہی ہے اسی وجہ سے اس سورۃ کا نام ہی "تفویض" ہو گیا۔ (بحث اسماء فاتحہ ماخوذ از اتقان والجامع للاحکام للقرطبی)

﴿ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴾

"اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا"

"اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان، رحم کرنے والا ہے"

لفظ باء کے متعلق مسائل:

باء حرف جار (زیر دینے والا) ہے اس کا تعلق کسی پوشیدہ لفظ سے ہے اس لئے "شروع" کسی مذکور لفظ کا معنی نہیں۔ پوشیدہ لفظ اسم ہوگا یا فعل پھر مقدم ہوگا یا مؤخر کل یہ چار صورتیں ہیں:

(۱) اگر مقدم ہو اور فعل ہو تو تقدیر عبارت کی یہ ہو "ابدأ باسم اللہ" میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے۔

(۲) اگر مقدم ہو اور اسم ہو تو تقدیر عبارت کی یہ ہوگی "ابتداء الکلام باسم اللہ" شروع کلام اللہ کے نام سے۔

(۳) اگر مؤخر ہو اور فعل ہو تو عبارت اصل میں اس طرح ہوگی "باسم اللہ ابدأ" اللہ کے نام سے میں شروع کرتا ہوں۔

(۴) اگر مؤخر ہو اور اسم ہو، تو حقیقت میں عبارت یوں ہوگی "باسم اللہ ابتدائی" اللہ کے نام سے شروع یہ سب معنی درست ہیں ان کے جائز ہونے میں کوئی کلام نہیں بلکہ چار صورتیں اور بھی اسی طرح ہیں کہ جو کام ہو رہا ہو۔ اس کے مطابق خاص فعل یا خاص اسم اول میں ہو یا آخر میں۔

پڑھنے لگے تو اس کے مطابق اقرأ اور قراءتی مقدر ہوں صرف دیکھنا یہ ہے کہ ان تمام معانی سے بہتر کون سا معنی ہے کیونکہ "اسم اللہ" کو مقدم ذکر کیا گیا ہے اور وہ کلمہ جس سے تعلق ہے وہ مؤخر ہے جیسے "باسم اللہ مجراھا و مرساھا" میں۔ اسم اللہ مؤخر ہے اور وہ کلمہ جس سے تعلق ہے وہ مقدم جیسے "اقرأ باسم ربک" میں۔

اس تمہید کے بعد علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں " التقدیم عندی اولی" میرے نزدیک اسم اللہ کو مقدم ذکر کرنا ہی بہتر ہے اس پر آپ نے دلائل قائم کیے ہیں کہ "باسم اللہ" پہلے بہتر ہے اور جس کلمہ سے تعلق ہے وہ بعد میں بہتر ہے:

(۱) بیشک اللہ تعالیٰ قدیم واجب الوجود ہے اس کا وجود تمام موجودات سے پہلے ہے بلکہ آپ یوں بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس کے وجود کی ابتداء باقی موجودات کی ابتداء سے پہلے ہوئی۔اس لئے کہ اس کی کوئی ابتداء نہیں۔"والسابق بالذات یستحق السبق فی الذکر" وہ ذات جس کی ابتداء ہی نہیں اور سب سے پہلے ہے اس کا ذکر بھی پہلے ہونا چاہئے۔

(۲) رب تعالیٰ نے اپنی شان بیان کرتے ہوئے ارشادفرمایا" هو الاول والآخر" وہی اول ہے اور وہی آخر۔یعنی اس کی نہ ابتداء ہے نہ انتہاء اس لئے اسی ذات کا ذکر سب سے پہلے بہتر ہے کیونکہ اس نے خود اپنا ذکر لفظ "ھو" کیا ہے جو کہ پہلے ذکر ہے۔اور رب تعالیٰ نے فرمایا" لله الامر من قبل ومن بعد" اللہ تعالیٰ کے لئے ہی امر ہے اس سے پہلے اور بعد۔یہاں بھی رب تعالیٰ نے اپنا ذکر لفظ "للہ" سے کیا ہے جو پہلے مذکور ہے۔

(۳) " التقدیم فی الذکر ادخل فی التعظیم " پہلے ذکر سے زیادتی تعظیم سمجھ آتی ہے عظیم ذات سمجھ کر ہی پہلے ذکر کیا جاتا ہے۔

(۴) اسی سورۃ میں رب تعالیٰ نے ﴿ ایاک نعبد﴾ ذکر کیا ہے ﴿ ایاک ﴾ سے خطاب رب تعالیٰ کو ہے جو پہلے مذکور ہے لہذا اس بحث سے واضح ہوا کہ تقدیر عبارت کی "باسم اللہ ابتدائی " ہونی چاہئے اور یہی بہتر ہے۔

(۵) شیخ والد ضیاء الدین عمر رحمہ اللہ کو کہتے ہوئے سنا انہوں نے شیخ ابوالقاسم قشیری رحمہ اللہ کو کہتے ہوئے سنا جب کہ انکے پاس شیخ بن ابوسعید بن ابی الخیر آئے تو قشیری کہنے لگے کہ محققین حضرات کہتے ہیں ہم نے جس چیز کو بھی دیکھا اسکے بعد اللہ تعالیٰ کو دیکھا یعنی مخلوق کو دیکھ کر رب تعالیٰ کا علم حاصل ہوتا ہے۔ابوسعید بن ابی الخیر نے کہا یہ مقام تو مریدین کا ہے جن کو تم محققین کہہ رہے ہو دراصل محققین حضرات وہ ہیں جو ہر چیز سے پہلے رب تعالیٰ کو دیکھتے ہیں۔

تحقیق کلام یہ ہے کہ مخلوق سے خالق کا علم حاصل کرنا یہ کم درجہ کی دلیل ہے جس کو اہل علم برھانِ انی کہتے ہیں کیونکہ اس میں اثرات کو دیکھ کر مؤثر کا پتہ چلایا جاتا ہے معلول کو دیکھ کر علت کا پتہ چلایا جاتا ہے۔لیکن خالق سے مخلوق کا پتہ چلانا اعلیٰ درجہ کی دلیل ہے جسے اہل علم نے برھان لمی کہا ہے اس میں مؤثر کو دیکھ کر اثر کا پتہ چلایا جاتا ہے علت سے معلول کو حاصل کیا جاتا ہے یہی اعلیٰ دلیل ہے واضح ہوا کہ جب اعلیٰ درجہ کی دلیل سے یہ پتہ چلا کہ رب تعالیٰ سے مخلوق کا علم حاصل ہوتا ہے۔ جب خالق کائنات کا علم پہلے ہے تو اس کا ذکر بھی پہلے ہونا چاہئے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ فعل کو مقدر نکالنا بہتر ہے یا اسم کو۔اس میں کچھ حضرات نے فعل کو مقدر نکالنا پسند کیا ہے لیکن علامہ رازی فرماتے ہیں "واقول لقائل ان یقول بل اضمار الاسم اولی" میں کہتا ہوں کہ یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ بنسبت فعل کے اسم کا مقدر نکالنا بہتر ہے۔اب اس صورت میں عبارت یوں ہوگی" بسم الله ابتداء کل شئی "اللہ کے نام سے شروع ہر چیز۔

اتنے الفاظ سے ہی واضح ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ بذاتہ تمام چیزوں کا مبدأ ہے اور ساری کائنات کا خالق ہے کوئی کہنے والا کہے یا نہ کہے کوئی ذکر کرنے والا ذکر کرے یا نہ کرے۔

یقینی بات یہی ہے کہ یہ معنی لینا ہی بہتر ہے جس سے خود بخود بغیر کسی کے کہنے کے پتہ چل جائے کہ اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا خالق ہے۔ (ماخوذ از کبیر جز اول ص ۱۰۱)

تراجم کا تقابلی جائزہ:

علامہ رازی رحمہ اللہ کی اس تقریر دل پذیر کے بعد اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کے ترجمہ کنز الایمان کی فوقیت واضح ہوگئی۔

"شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم والا ہے" (محمود الحسن صاحب)

"شروع ساتھ نام اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والے مہربان کے" (شاہ رفیع الدین صاحب)

"شروع اللہ نہایت رحم کرنے والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے" (عبدالماجد صاحب دریا آبادی)

"شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان اور نہایت رحم والے ہیں" (اشرف علی صاحب)

''شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے'' (فتح محمد صاحب)

'' اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا'' (مولانا احمد رضا خان بریلویؒ)

اس مقام میں مولنا احمد رضا خان رحمہ اللہ کے ترجمہ میں لفظ ''اللہ'' پہلے ہے اور ''شروع'' بعد میں لیکن دیگر تراجم میں ''شروع '' پہلے اور لفظ ''اللہ'' بعد میں۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کی بحث کا خلاصہ دیکھیں کہ اصل عبارت یہ ہوگئی ''بسم اللہ ابتداء کل شئی '' اللہ کے نام سے شروع ہر کام۔

واضح ہوا کہ علامہ رازی رحمہ اللہ کی تفسیر کبیر کا مطالعہ کرنے کے بعد تسمیہ کا معنی بہت خوب مولانا احمد رضا رحمہ اللہ نے کیا ہے۔

اعتراض: قرآن پاک میں تو بہتر تراکیب کو ہی استعمال کیا گیا ہے کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ﴾ میں ''اسم رب'' بعد میں اور اقرأ پہلے ہے یہ جائز تو ہے بہتر نہیں۔

جواب: ﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ﴾ میں کسی نے بھی یہ نہیں بیان کیا کہ یہ صرف جائز ہے بہتر نہیں بلکہ یہاں بعد میں ہونے کے باوجود بہتر وہی صورت ہے جو استعمال ہے :

''وانما قدم الفعل فی بالقراء ۃ باسم ربک لانها اول سورۃ نزلت فی قول وکان الامر بالقراء اهم کان تقدیم الفعل اوقع '' (مدارک)

'' اقرأ باسم ربک'' میں فعل کو مقدم ذکر کیا گیا کیونکہ اس سورۃ کی پہلی چند آیات سب سے پہلے نازل ہوئیں اس لئے یہاں قراءت زیادہ مقصود تھی تو اقرأ کو پہلے ذکر کیا گیا۔

خیال رہے کہ یہ قول صاحب مفتاح کا ہے صاحب کشاف نے تو اس مقام پر بھی ''باسم ربک'' کو پہلے ''اقرأ'' کے متعلق کیا ہی نہیں بلکہ دوسرے ''اقرأ'' کے متعلق کیا ہے جو بعد میں ہے لہذا پہلے ''اقرأ'' کا معنی صرف ''اوجد القراۃ'' ہے یعنی قرأت کو موجود کیجئے پڑھئے صرف پڑھنے کا حکم ہے پھر کہا اپنے رب کے نام سے پڑھئے۔ واضح ہوا کہ اعتراض اپنی کم سمجھی پر تو ہوسکتا ہے قرآن پاک کی ترکیب پر نہیں وہ تو بلاشبہ ایسی بلاغت پر مشتمل ہے جسے دیکھ کر ہی علم بلاغت کے ضابطے بنے۔

(از مطول ص ۱۴۸)

تنبیہ : کوشش ان شاء اللہ یہ ہوگی کہ مفسرین کرام کے مختلف اقوال کو اگر جمع کرنا ممکن ہوا تو جمع کرلوں اور اگر ایک مفسر نے ایک قول بیان کیا دوسرے نے دوسرا قول اپنے موقف پر ہر ایک نے دلائل دیئے اور دوسرے کا رد کیا۔ ان اقوال کو جمع کرنا بھی ممکن نہیں تو جو بات راجح نظر آئے گی اسے ان شاء اللہ ذکر کروں گا کئی تفاسیر بفضلہٖ تعالیٰ میرے سامنے ہیں میں کافی حد تک دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

لفظ باء کے معانی : بسم اللہ میں جو لفظ باء ہے یہ حرف جار ہے اس کے کئی معانی ہیں لیکن یہ لفظ یہاں کونسے معانی میں استعمال ہے؟

لفظ "باء" بمعنی مصاحبة : خیال رہے کہ "با" کبھی الصاق کے معنی میں استعمال ہوتی ہے اس کا معنی اتصال "ملنا، متصل ہونا) ہے لیکن جب "با" مصاحبۃ کے معنی میں استعمال ہو تو اس وقت لفظ "مع" کا معنی ہوگا یعنی معیت کا حصول۔ اب معنی یہ ہوگا کہ "اللہ کے نام سے تبرک حاصل کرتے ہوئے ہر کام کی ابتداء" عام طور پر اہل لسان (عربی زبان والے) "باسم الله اقرأ متبر کا" کہا کرتے تھے "با" کا یہ معنی نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے بھی سمجھ آتا ہے حدیث شریف میں ذکر ہے " **بسم الله الذی لا یضر مع اسمه شئی فی الارض ولا فی السماء**" اللہ کے نام سے شروع جس کے نام کی معیت میں زمین وآسمان میں کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

نبی کریم ﷺ نے لفظ "مع" استعمال فرمایا ہے۔ جس سے واضح ہو رہا ہے کہ یہاں "با" مصاحبت کے معنی میں بھی استعمال ہے "با" کو مصاحبت کے معنی میں لینا بھی ایک خصوصی فضیلت رکھتا ہے:

" ان المصاحبة ادل علی ملابسة جمیع اجزاء الفعل لا سم الله "

مصاحبت کا معنی لینا زیادہ مناسب اس لئے ہے کہ اس سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ فعل (کام) کے تمام اجزاء کو اللہ کے نام کی معیت حاصل ہے۔

(ماخوذ از بیضاوی مع حاشیہ ص ۴)

خیال رہے کہ "با" کا تبرک کے لئے آنا کوئی علیحدہ معنی نہیں البتہ اسی مصاحبت والے معنی سے تبرک والا معنی بھی خود بخود سمجھ آ رہا ہے۔

لفظ "باء" بمعنی استعانت : جب "با" کو استعانت کے معنی میں لیا جائے گا تو معنی یہ ہوگا "اللہ کے نام کی امداد سے شروع" یہ معنی بھی خصوصی فضائل کو سمیٹے ہوئے ہے کیونکہ اس میں انسان اپنی عاجزی کا اظہار کرتا ہے اور اظہارِ عبودیت (اپنے بندہ ہونے کو ظاہر) کرتا ہے۔ اس میں کامل ادب پایا جاتا ہے کیونکہ اپنی طاقت کی نفی کرتا ہے اور رب تعالیٰ کو ہی مؤثر حقیقی مانتا ہے اسی سے رحمت کے دروازے کھلتے ہیں اور ساتھ ہی اسے " لاحول ولا قوة الا باللہ " (گناہوں سے پھرنے اور نیکی کی طاقت سوائے اللہ تعالیٰ کے نہیں) کا خزانہ بھی حاصل ہو جائے گا۔ "با" کو استعانت کے معنی میں بنانا اس لئے بھی بہتر ہے کہ قرآن پاک میں صراحۃً " استعینوا " کے ساتھ تعلق آیا ہوا ہے ﴿اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ امداد طلب کرو صبر اور نماز سے "استعینوا باللہ" امداد طلب کرو اللہ سے۔ "با" کو استعانت کے معنی میں لینے سے مشرکین کا واضح طور پر رد بھی ہو جائے گا کیونکہ وہ اپنے بتوں، معبود ان باطلہ کو رب تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ مانتے تھے مسلمان " بسم اللہ " پڑھ کر ہی واضح کر دیتا ہے کہ ہمارا معبود تو فقط ایک ہے ہم کسی کی عبادت کر کے کسی کو رب تعالیٰ کا شریک ٹھہرا کر اس کے قرب کا ذریعہ نہیں مانتے۔

(ماخوذ از روح المعانی جزء اول ص ۷۴)

مزید تفصیل ان شاء اللہ ﴿وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کی تفسیر میں آئے گی۔

ہیرے اور موتی : " کسرت الباء فی البسملة تعليما للتوصل الى الله تعالىٰ " باء کا کسرہ (زیر) اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچنے کا ذریعہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو عاجز کرے، اپنی خودی مٹا دے، اپنی عبودیت سے اپنے آپ کو پست کر لے پھر رب تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا " فلا يتوصل الى نوع من انواع المعرفة الابنوع من انواع الذل والكسر " اس وقت تک معرفت حاصل نہیں ہوسکتی جب تک عجز وانکساری حاصل نہ ہو۔

حضرت عمر بن فارض رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ولو كنت لی من نقطة الباء خفضة ۔۔۔ رفعت الى ما لم تنله حيلة

اگر مجھے باء کے نقطہ سے بھی زیادہ پستی حاصل ہوتی ...... تو میں اتنے بلند منازل حاصل کر لیتا، جنھیں کسی حیلہ سے بھی نہ پاسکتا

☆ رب تعالیٰ کی ذات کے ساتھ صفات کا قیام ہے اس طرح ذات کا مرتبہ اولیٰ اور صفات کا مرتبہ ثانیہ بیان کیا جاسکتا ہے اس طرح حروف تہجی میں الف پہلے اور باء بعد میں الف سے اشارہ ذات کی طرف اور باء سے صفات کی طرف ہے "باسم اللہ"کو باء سے شروع کیا جو صفات پر دلالت کر رہی ہے نیز اللہ تعالیٰ کی صفات کوئی جمالیہ ہیں اور کوئی جلالیہ لیکن جمالیہ کو سبقت حاصل ہے جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے "سبقت رحمتی غضبی" میری رحمت کو غضب پر سبقت حاصل ہے۔

گویا کہ باء سے رب تعالیٰ کی رحمت کی طرف اشارہ پایا گیا پھر ظاہر طور پر "رحمن اور رحیم" کا ذکر کر کے اسے واضح کر دیا۔

☆ حروف جار فعلوں اور اسموں کے درمیان رابطہ کا ذریعہ ہیں باء چونکہ حرف جار ہے اسی سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خالق اور مخلوق کے درمیان واسطہ اور ذریعہ ہیں:

" واما اشارة الى الحقيقة المحمدية والتعين الاول المشار اليه بقوله صلى الله عليه وسلم اول ماخلق الله نور نبيک ياجابر وبواسطته حصلت الافاضة كما يشير اليه لو لاک ماخلقت الافلاک "

لفظ باء سے حقیقت محمدیہ اور آپ کی اولیت پر اشارہ ملتا ہے اس پر خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے جس میں آپ نے فرمایا اے جابر سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی کے نور کو پیدا کیا۔ اور یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ حضور ﷺ کائنات کے وجود کا ذریعہ اور واسطہ ہیں آپ نہ ہوتے تو کائنات کا نظام قائم نہ ہوتا۔ اس پر حدیث قدسی دلالت کر رہی ہے رب تعالیٰ نے فرمایا اے محبوب اگر آپ نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا۔

(ماخوذ از روح المعانی جزء اول ص ۵۱)

لفظ "اسم" کے متعلق بحث:

"اسم الشئی ما یعرف به ، فاسماء الله تعالیٰ هی الصور النوعية التی تدل بخصائصها" (جزاول ص ۸ ابن عربی)

کسی چیز کا اسم وہ ہے جس سے اس کی پہچان ہو اللہ تعالیٰ کے اسماء، صور نوعیہ ہیں جو اپنی

خصوصیات پر دلالت کر رہی ہیں یعنی صفت رزّاقیۃ اس کے رزاق ہونے پر، صفت رحمت اس کے رحمٰن ورحیم ہونے پر دلالت کر رہی ہے اسی طرح دوسری صفات کو بھی مدنظر رکھا جائے۔لفظ اسم اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھی بولا جاتا ہے اور اس کی صفات پر بھی کیونکہ صفات بھی اس کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں اور صفات سے ذات باری تعالیٰ کی معرفت بھی حاصل ہوتی ہے۔ (ابن عربی)

اسم کا لفظ کس لفظ سے بنا؟

زیادہ معتبر قول یہ ہے کہ اصل میں یہ لفظ سمو (سین پر زیر اور میم ساکن) تھا۔جس کا معنی ہے بلندی یعنی اسم اپنے مسمّی (جس کا نام ہے) کی رفعت اور بلندی شان پر دلالت کرتا ہے جیسے ابوخالد نے مبارک کی مدح میں کہا:

﴿ واللہ اسماک سمی مبارک ، اثرک اللہ بہ ایثار کا ﴾

اللہ تعالیٰ نے تمہیں بلند کیا رفعت عطا کی تمہارا نام ہی مبارک رکھا گیا۔اللہ تعالیٰ نے تمہیں فضیلت سے مبارک بنایا۔

ایک قول یہ ہے کہ اسم کا اصل وسم ہے جس کا معنی ہے علامت۔یعنی اسم اپنے مسمّی پر علامت اور نشانی کی حیثیت رکھتا ہے۔

علم نحو پڑھے ہوئے حضرات کو بخوبی علم ہے کہ پہلا قول ہی زیادہ معتبر ہے گرائمر کی زیادہ پیچیدہ بحثوں سے اجتناب کیا جا رہا ہے اہل علم کی دل چسپی کے لئے کچھ بحثیں علمی سطح کی ذکر کرنی بھی مجبوری ہوتی ہے لیکن عوام کے ذہنوں کو الجھاؤ سے بچانا بھی ضروری ہوتا ہے۔اس لئے کوشش یہی ہے کہ بات آسان بھی ہو اور علمی بھی تا کہ عوام اور دینی مدارس کے طلباء کے لئے یکساں مفید ہو۔

لفظ اسم کے متعلق مختصر تفصیل:

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اسم کے متعلق بہت تفصیل سے لکھا۔اس سے مختصر بحث دینی مدارس کے طلباء کے لئے شامل کی جا رہی ہے اگرچہ عوام کے لئے اس بحث کو ذکر کرنا کوئی خاص ضروری نہ تھا۔

بعض فرقوں (حشویہ، کرامیہ وغیرہ) نے یہ کہا ہے کہ اسم مسمی کا عین ہے۔ معتزلہ نے کہا کہ اسم مسمی کا غیر ہے لیکن تسمیہ کا عین ہے۔

اہل سنت و جماعت کا صحیح مذھب یہ ہے کہ اسم مسمی اور تسمیہ دونوں کا ہی غیر ہے یہی بات تحقیق پر مبنی ہے:

(۱) کیونکہ اسم کبھی موجود ہوتا ہے لیکن مسمی معدوم ہوتا ہے۔ کبھی مسمی موجود ہوتا ہے اسم معدوم ہوتا یعنی جن موجودات کے نام نہ رکھے جائیں۔ ان کے ہی نام رکھ لیں تو دونوں موجود ہوں گے۔ یہ بات ہر ذی شعود کو سمجھ آ سکتی ہے کہ موجود اور معدوم ایک نہیں معدوم تو کوئی چیز ہی نہیں۔

(۲) مسمیٰ (ذات) کبھی ایک ہوتا ہے لیکن نام اس کے کثیر ہوتے ہیں جیسے مترادف نام کبھی ہوتے ہیں اسی طرح کبھی ایک نام ہوتا ہے اور شخص کئی ہوتے ہیں۔ جیسے مشترک کا نام۔

(۳) اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ اللہ تعالیٰ کے لئے اچھے نام ہیں ان سے اس کو بلاؤ۔

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا " ان للہ تعالیٰ تسعة وتسعين اسما " بیشک اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں اس سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ایک ہے لیکن نام اسکے بہت ہیں۔

(۴) جب رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ اس سے پتہ چلا کہ رب تعالیٰ کے تمام نام اچھے ہیں ان ناموں سے ہمیں اللہ تعالیٰ نے دعاء کرنے اسے بلانے کا حکم دیا اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو رہی ہے کہ رب تعالیٰ کے اسماء ذریعہ دعاء ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعاء کی جاتی ہے وہ ذات مدعو ہوئی۔ یقینی بات ہے کہ ذات مدعو اور ہے اور الفاظِ دعا اور ہیں۔

(۵) " بسم اللہ " میں اسم مضاف ہے اور لفظ اللہ مضاف الیہ اسی طرح " تبارک اسم ربک " میں اسم مضاف ہے اور رب مضاف الیہ ہے۔ جب کہ یہ بھی واضح ہے کہ مضاف اور مضاف الیہ ایک نہیں ہوتے تو یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اسم اور وہ ذات جس کا وہ نام ہے ایک نہیں۔

(۶) ہم اسماء کی تعریف تو ان کے عربی ہونے اور فارسی ہونے سے کر لیتے ہیں ہم کہتے ہیں:

" اللہ اسم عربی و خدای اسم فارسی و اماذات اللہ تعالیٰ فمنزہ عن کونہ کذلک "

لفظ اللہ عربی ہے اور ''خدا'' اسم فارسی ہے لیکن رب تعالیٰ کی ذات کے متعلق تو اس طرح بیان کرنا ممکن نہیں پتہ چلا کہ اسم اور ہے اور مسمّی اور ہے۔ (از کبیر ص ۱۰۹)

''اسم '' کا اطلاق (بولا جانا) جن چیزوں پر:

اسم سے ذات اور حقیقت ، اور وجود اور عین مراد لئے جاتے ہیں ''وھی عندھم اسماء مترادفة '' یہ چار لفظ ایک دوسرے کے مترادف ہیں یعنی سب کا ایک مطلب ہے ﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ ﴾ میں اسم سے مراد ذات ہے صرف نام نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے رب کی ذات کی پاکی بیان کرو۔

اسی طرح رب تعالیٰ نے کفار کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ﴿ ما تعبدون من دونہ الآ اسمآءً سمّیتموھا ﴾ اس آیت میں بھی اسماء سے مراد ذاتیں ہیں۔ کیونکہ کفار بتوں کی ذاتوں کی عبادت کرتے تھے صرف ان کے ناموں کی نہیں۔ اسلئے آیت کا مطلب یوں ہوگا ''اللہ کے بغیر تم نہیں عبادت کرتے مگر ان ذاتوں کی جن کو تم نے مقرر کر رکھا ہے۔'' اگرچہ ظاہری معنی یہ ہے کہ وہ نام جو تم نے رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن اسماء سے مراد ذوات ہیں۔ (از روح المعانی ص ۵۳)

رب تعالیٰ کے اسم گرامی لفظ ''اللہ'' کے متعلق بحث:

جس طرح رب تعالیٰ کی ذات خیال ، قیاس گمان اور وہم سے بالاتر ہے اسی طرح رب تعالیٰ کے اسم گرامی لفظ ''اللہ'' میں بھی اہل علم سرگرداں رہے کہ اسے مشتق کہا جائے یا جامد۔ اگر مشتق ہے تو کس لفظ سے مشتق ہے۔

راقم کے خیال میں یہ اختلاف کوئی اختلاف نہیں بلکہ باعث رحمت ہے اس سے رب تعالیٰ کے اسم گرامی کی شان دوبالا ہو رہی ہے ہر قول میں ایک عجیب کمال ، عجیب ذوق ، عجیب حلاوت اور عجیب

شوق پایا جاتا ہے۔

لفظ "اللہ" جامد ہے: علم نحو کے امام خلیل اور سیبویہ کا قول یہ ہے کہ لفظ "اللہ" کسی لفظ سے نہیں بنا۔ بلکہ جامد ہے (جامد کہا ہی اسے جاتا ہے جو کسی سے نہ بنے اور اس سے کوئی نہ بنے) اور رب تعالیٰ کی ذات پر دلالت کر رہا ہے۔

" لا الہ الا اللہ " کا معنی کریں گے تو کہیں گے "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں" لفظ اللہ کا کوئی معنی نہیں کیا۔

اگر مشتق ہوتا تو کوئی نہ کوئی معنی مذکور ہوتا۔ بلکہ واضح طور پر کلمہ توحید سے توحید ہی تب سمجھ میں آتی ہے جب کہ اس کو صرف "علم" رکھا جائے اور معنی مشتقی نہ کیا جائے۔

جو شخص بھی کسی کی صفات ذکر کرنا چاہے پہلے وہ ذات ذکر کرتا ہے پھر اس کی صفات کو جیسے کہا جائے "خالد الفقیہ النحوی الاصولی" خالد فقہ، نحو، اصول فقہ کا عالم ہے۔

جب کہ لفظ "اللہ" رب تعالیٰ کی ذات پر دلالت کرتا ہے یعنی اُس کا ذاتی نام ہے تو اسے پہلے ذکر کیا جاتا ہے اور صفات کو بعد میں مثلاً کہا جاتا ہے " اللہ العالم القادر الحکیم " یہاں اللہ تعالیٰ کا قادر ہونا، عالم و حکیم ہونا بعد میں ذکر کیا گیا اسی سے واضح ہو گیا کہ لفظ "اللہ" رب تعالیٰ کا ذاتی نام ہے اور جامد ہے۔

اعتراض: قرآن پاک کی سورۂ ابراہیم میں ہے:

﴿ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾

یہاں صفات یعنی العزیز الحمید کو پہلے ذکر کیا گیا ہے اور موصوف یعنی لفظ "اللہ" بعد میں اس سے تو پتہ چلا کہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں کہ موصوف پہلے ہو اور صفات بعد میں۔

جواب: قاعدہ تو کلیہ ہے البتہ بعض اوقات اشتباہ اس لئے ہوتا ہے کہ ایک اور ضابطہ کو مدنظر نہیں رکھا جاتا وہ ضابطہ یہ ہے کہ بعض اوقات صفات کو ذکر کر کے ان پر کوئی حکم لگانا مقصود ہوتا ہے۔ ذکر کرنے کے بعد خیال آتا ہے پتہ نہیں کسی کو پتہ چلا ہے یا نہیں کہ یہ شخص کون ہے پھر وہ نام بھی

ذکر کر دیتا ہے۔اس صورت میں علم نحو میں نام کو صفت کا درجہ دیا جاتا ہے اور صفت پر دلالت کرنے والے الفاظ کو موصوف کی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے۔جس طرح کہا جائے " هذه الدار ملك للفاضل العالم حامد" یہ گھر عالم ،فاضل ،حامد کی ملکیت ہے۔

پہلے صرف یہ کہنا مقصود تھا کہ یہ گھر صاحب فضل ،صاحب علم شخصیت کا ہے۔پھر خیال کیا کہ نام بھی ذکر کر دیا جائے تا کہ سننے والوں کو پتہ چل جائے کہ یہ مکان اس شخص کا ہے جس کا نام حامد ہے اس لئے کہ عالم وفاضل تو اور بھی ہو سکتے ہیں اس ترکیب میں الفاضل ،العالم موصوف ہیں اور حامد صفت ہے۔

یہاں بھی ذات پر دلالت کرنے والے الفاظ پہلے ہیں ۔اور صفات پر دلالت کرنے والے لفظ بعد میں یعنی ترکیب بالعکس ہے۔

لفظ''اللہ'' کو اسم علم نہ ماننے والوں کے دلائل:

بعض اہل علم اس طرف گئے ہیں کہ لفظ''اللہ'' رب تعالیٰ کا ذاتی نام نہیں مشتق ہے صفاتی نام ہے پھر رب تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہو گیا اب کسی اور کو''اللہ'' نہیں کہا جا سکتا۔ان حضرات نے اپنے مذہب پر یہ دلائل قائم کئے ہیں۔

(۱) رب تعالیٰ نے فرمایا﴿ وَهُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ ﴾ اور فرمایا ﴿ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ ان دونوں آیتوں میں ضروری ہے کہ لفظ''اللہ'' کا صفتی معنی لیا جائے کیونکہ اہل لسان کا محاورہ " هو العالم الزاهد فی البلد" یہاں صفات کو ذکر کیا گیا ہے یہ نہیں کہا جاتا " هو زید فی البلد" اسی طرح " هو بکر" وغیرہ ہی نہیں کہا جاتا۔اس محاورہ کو دیکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ آیات میں بھی صفتی معنی ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ ترکیب میں مبتداء خبر ہیں ۔موصوف وصفت نہیں کیونکہ ضمیر نہ موصوف ہوتی ہے نہ صفت بلکہ وہ الفاظ جو خبر بن رہے ہیں ان میں معنی صفتی معتبر ہے ان سے مراد ذات نہیں۔

جب لفظ''اللہ'' کو مشتق مانا جائے تو یہ مسائل خود بخود ثابت ہو جائیں گے۔

(۱) ''الا له'' کا معنی ہو گا معبود خواہ وہ معبود بالحق ہو یا باطل طریقہ سے معبود ہو۔ اصل میں عبادت صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے کیونکہ وہ ہر قسم کے انعام عطا کرنے والا ہے اور وہی تمام کائنات کا خالق ہے اور جب اعلیٰ قسم کے انعامات صرف وہی عطا کرتا ہے تو اعلیٰ قسم کی تعظیم کا بھی وہی مستحق ہے وہ اعلیٰ قسم کی تعظیم عبادت ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ جب دوسرا کوئی عظیم انعامات عطاء کرنے کا اہل نہیں تو عظیم تعظیم کا بھی مستحق نہیں۔ یعنی عبادت کے لائق صرف وہی ذات ہے۔

(۲) تقوی کے اعلیٰ مقام پر فائز حضرات یہ کہتے ہیں کہ عبادت کرنے والے کا مقصد صرف رب تعالیٰ کو راضی کرنا ہو۔

ثواب کی طلب، عذاب سے بچنے کی خواہش۔ جنت حاصل کرنے کی تمنا جہنم سے بچنے کا خوف مقصد نہ ہو۔ کیونکہ اگر مقصود یہ چیزیں ہو جائیں تو ان کا مرتبہ اولیت درجہ رکھے گا۔ اور رب تعالیٰ کا مقام ثانوی (دوسرا درجہ) ہو جائے گا:

" ومن کان کذالک لم یکن محبا اللہ ولم یکن راغبا فی عبادۃ اللہ "

جو شخص اس طرح عبادت کرے گا کہ اس کا مقصد حصول ثواب اور جنت ہو گا وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے میں خالص نہیں ہو گا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کامل رغبت کرنے والا نہیں ہو گا۔

اس لئے اے انسان عبادت کرتے وقت تیرا مقصود صرف رب تعالیٰ ہو۔ صرف اس کی رضا ہو اس طرح تیری نظر میں ثواب و جنت کا دوسرا مرتبہ ہو گا۔ رب تعالیٰ مقصود حقیقی ہو گا جب وہ راضی ہو گا خود بخود جنت حاصل ہو گی اور ثواب بھی حاصل ہو گا۔ یہ لفظ ''اللہ '' سے مسئلہ حاصل ہوا کہ وہ معبود حقیقی ہے۔

مصادر کے لحاظ سے لفظ ''اللہ'' کی حالتیں:

(۱) "الہ (ف) الوھۃ " .الاھۃ سے مشتق جب مانا جائے تو اس کا معنی ہوتا ہے بندگی کرنا "الالہ " کا معنی معبود، خدا جب باب تفعیل سے آئے گا تو معنی ہو گا، معبود بنانا، خدا کا مرتبہ دینا، پرستش کرنا۔

چونکہ لفظ ''اللہ'' اصل میں " الہ " ہے ہمزہ کو حذف کر کے، الف، لام اس پر داخل کیا گیا لام کو

لام میں ادغام کیا تو لفظ ''اللہ'' بن گیا اب معنی معبود ہی ہوگا۔ و منه قوله الموحدین " لا اله الا اللّٰہ" معناہ " لا معبود غیر اللہ " یعنی اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں۔

(۲) " اله (س) الها (بفتح الهمزة و اللام)، حیران ہونا۔ یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے کہ وہ فلاں کام میں حیران ہے اسے کوئی راہ نہیں سوجھتی۔

رب تعالیٰ کی ذات میں بھی عقلیں حیران ہیں۔ اس لئے کہ اس کی شان یہ ہے ﴿لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ﴾ اسے نظریں نہیں پاسکتی وہ نظروں کو پالیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ نظر نہیں آتا تو غلطی سے اگر عقل اس کے وجود کا انکار کر دے تو خود ہی انسان کا نفس عقل کو جھوٹا قرار دیتا ہے۔ کیونکہ ساری کائنات اپنے وجود میں رب تعالیٰ کی محتاج ہے یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ مخلوق موجود ہو خالق موجود نہ ہو محتاج موجود ہو، اور وہ ذات موجود نہ ہو جس کی کائنات موجود ہے۔

اور عقل اگر رب تعالیٰ کو پہچاننے میں یوں غلطی کرے کہ عقل کہے کہ ہاں اللہ تعالیٰ خیال میں آسکتا ہے۔ حواس میں آسکتا ہے تو انسان کا نفس اپنی عقل کو جھوٹا کہتا ہے کہ اے عقل تجھے کیا ہوگیا عقل ہونے کے باوجود بے عقلی کا مظاہرہ کیسے؟ کیونکہ جو چیز خیال اور حس میں آجائے وہ تو حادث ہوتی ہے یعنی اپنے وجود میں غیر کی محتاج ہوتی ہے اور وہ فنا بھی ہوجاتی ہے رب تعالیٰ تو قدیم ہے نہ اس کی ابتداء ہے اور نہ انتہاء۔

معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ کو پہچاننے میں عقل متحیر ہے عقل کو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ یہ اعتراف کرے کہ رب تعالیٰ موجود ہے، اسے کمال حاصل ہے، دیگر کائنات کو موجود کرنے والا ہے، لیکن ساتھ ساتھ عقل اپنے عجز کا بھی اعتراف کرے کہ وہ ادراک سے بالاتر ہے۔ بلکہ عقل اتنی عاجز ہے کہ یہ تصور بھی نہیں کرسکتی کہ اس کا ادراک کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ ادراک کی درک (یعنی سمجھ لینے کا تصور) بھی ادراک ہے۔ وہ تو ادراک میں نہ آنے والی ذات ہے یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے عقلاء کی عقلیں رب تعالیٰ ... پہچاننے سے عاجز ہیں۔ اور کسی کی کیا مجال ہے جب کہ سید الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ فرماتے ہیں "ما عرفناک حق معرفتک" ہم نے تمہیں ایسا نہیں پہچانا جیسا کہ پہچاننے کا حق ہے۔

(۳) اگر مشتق " الهت الی فلان " سے ہو، تو معنی ہوگا "سکنت الیه "میں نے فلاں سے سکون حاصل کیا۔اب لفظ''اللہ'' کا معنی یہ ہوگا کہ یہ وہ ذات ہے جس سے سکون حاصل ہوتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر عقول کو سکون حاصل نہیں ہوتا۔اسی کے ذکر سے سکون حاصل ہوتا ہے۔ رب تعالیٰ کا اپنا ارشاد گرامی ہے:

﴿اَلَا بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ ''خبردار اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے''۔

اسی طرح روحوں کو اس وقت تک عروج حاصل نہیں ہوتا جب تک اس کی ذات کو اس کی صفات کے ذریعے نہ پہچانا جائے۔

رب تعالیٰ کا ذکر اور اس کی صفات کی معرفت باعث سکون قلب کیوں؟ اس لئے کہ یہ بات واضح ہے کہ کمال کو حاصل کرنا ہر شخص پسند کرتا ہے یعنی کمال ہر شخص کا محبوب ہے۔حقیقی کمال صرف رب تعالیٰ کو ہی حاصل ہے " وما سوی الحق فهو ناقص لذاته "اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز ذاتی طور پر ناقص ہے کیونکہ ساری مخلوق ممکن اور حادث ہے جو چیز بھی ممکن اور حادث ہو وہ عدم سے وجود میں آتی ہے واضح ہوا کہ عدم سے وجود میں آنے والی چیز ناقص ہوتی ہے۔

اور یہ بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ جو چیز لذاتہ ناقص ہو۔وہ اگر کمال حاصل کرنا چاہے تو اسے کمال اسی چیز سے حاصل ہوگا جو خود کامل لذاتہ ہو۔کامل لذاتہ صرف رب تعالیٰ ہے۔جب کامل لذاتہ محبوب ہے تو واضح ہوا کہ رب تعالیٰ ہی انسان کا حقیقی محبوب ہے محبوب کے ذکر سے دل کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

اور خاص کر کے ممکن کا اپنا کوئی ذاتی وجود نہیں ہوتا بلکہ وہ وجود حقیقی کا محتاج ہوتا ہے۔جب وجود خارجی میں وہ اپنے قیام اور وجود میں ذات باری تعالیٰ کا محتاج ہے تو یقیناً وجود عقلی میں بھی اسی ذات کا محتاج ہے اسی کی رحمت کا منتظر رہتا ہے دل اسی کے فضل وکرم کے دامن سے لپٹنے کے لئے بے تاب ہوتا ہے۔جب انسان کے دل کو رب تعالیٰ کے فضل وکرم کا سہارا مل جاتا ہے تو اسے قرارر حاصل ہو جاتا ہے اسے سکون مل جاتا ہے۔

واضح ہوگیا کہ رب تعالیٰ کا نام لفظ ''اللہ'' اپنے اس اشتقاقی معنی کے لحاظ سے بے چین دلوں کا چین ہے بے قراروں کو اسی نام سے قرار ملتا ہے یہی نام ہے جس سے سکونِ قلب حاصل ہوتا ہے یہی وہ نام ہے جس سے اضطرار اور پریشانی کا زوال ہوتا ہے۔سبحان اللہ لفظ ''اللہ'' پڑھنے سے بے سہاروں کو سہارا مل گیا بے چاروں کو چارہ مل گیا۔

(۴) لفظ ''اللہ'' یا مشتق ہے " اله الفصيل " سے جس کا معنی ہے اونٹنی یا گائے کا بچہ اپنی ماں کی طرف لپکا۔

اس معنی کے لحاظ سے رب تعالیٰ کے اسم گرامی ''اللہ'' کا مطلب یہ ہوگا " **ان العباد مولهون مولعون بالتضرع اليه في كل الاحوال**" بیشک بندے اپنے تمام احوال میں عجز وانکساری سے اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں اسی سے شدید محبت کرتے ہیں۔

حقیقت یہی ہے کہ انسان جب کسی عظیم مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے اور کسی مضبوط آفت میں مبتلا ہوتا ہے تو وہاں ہر چیز کو بھول جاتا ہے صرف رب تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے "**فيقول بقلبه ولسانه يا رب يارب**" وہ اپنے دل اور اپنی زبان سے "یار ب یارب" کہہ کر پکارتا ہے اے میرے رب اے میرے رب۔لیکن جب وہ مصائب وآلام سے نکل آتا ہے آسائش میں آجاتا ہے نعمتیں اسے حاصل ہوجاتی ہیں پھر وہ اپنی خلاصی کو ضعیف اسباب اور گھٹیا احوال کی طرف منسوب کردیتا ہے یہ حالت پہلی حالت کے مخالف ہے اس لئے کہ یہی اسباب واحوال اگر نجات دھندہ تھے تو مصائب وآلام کے وقت بھی ان کی طرف ہی رجوع کرنا تھا۔

> " وان كان مصلح المهمات هو الله تعالىٰ في وقت البلاء وجب ان يكون الحال كذلک في بسائر الاوقات "
>
> جب کہ مصیبت کے وقت مشکلات کو دور کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے تو تمام اوقات میں یعنی مصیبت کے ٹل جانے پر بھی اللہ تعالیٰ کو ہی " دافع البليات "(مصائب کو ہٹانے والا) كاشف المهمات (مشکلات کا دور کرنے والا) سمجھے۔

اوز وجہ یہ ہے کہ خیر اور راحت اللہ تعالیٰ سے ہی مطلوب ہے تو انسان کا مطلوب ومقصود بھی وہی ہوگا اسی کی طرف توجہ ہوگی اور وہی محبت کا مرکز ہوگا۔

اعتراض: " ان المحسن فی الظاهر اما الله او غیرہ " بیشک ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ احسان فرماتا ہے۔ اسی طرح اس کی مخلوق میں سے بھی اس کے بندے احسان فرماتے ہیں۔ پھر کیا مطلب ہے بندہ تمام احسان صرف رب تعالیٰ کی طرف سے ہی سمجھے۔

جواب: " فان کان غیرہ فذلک الغیر لا یحسن الا اذا خلق الله فی قلبہ داعیۃ الاحسان فالحق سبحانہ وتعالیٰ ھو المحسن فی الحقیقہ ، والمحسن مرجوع الیہ فی کل الاوقات ، والخلق مشغو فون بالرجوع الیہ "

(کبیر جزء اول ص ا)

اگر بظاہر یہ سمجھ آئے کہ احسان کرنے والا اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے تو وہ احسان بھی درحقیت اللہ کا ہی ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہی اسے احسان کرنے کی قدرت دی۔ اللہ تعالیٰ نے ہی اس کے دل میں یہ ڈالا کہ تو نے فلاں پر احسان کرنا ہے تو اسی وجہ سے اللہ کے بندے نے احسان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ محسن حقیقی ہے۔ اور اس کی مخلوق کا احسان اس کی عطا سے ہے وہ احسان کرنے میں بھی اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

لہذا یہ کہنا کہ تمام احسان صرف رب تعالیٰ کے ہیں یہ صحیح ہے۔ اور یوں کہنا بھی درست ہے کہ یہ احسان رب تعالیٰ کی عطا اور اس کے فضل سے اس کے بندے نے کیا ہے۔

ایک بات یہ بھی ذہن میں رکھ لی جائے تا کہ اسے دوبارہ ﴿وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ کی بحث میں نہ ذکر کرنا پڑے، کیونکہ رب تعالیٰ معاون حقیقی ہے اور اس کی مخلوق اسی کی عطاء کردہ طاقت، اسی کے انعام، اسی کی بے پایاں رحمت، اسی کے فضل وکرم اور اسی کی رضا سے معاون مجازی ہے۔ کاش کہ لوگ جہالت، ضد، ہٹ دھرمی کو دور کر کے اہل علم کی کتابوں کا مطالعہ کریں تو انہیں سمجھ آئے کہ دین کیا ہے۔

واصلین الی الحق کا مقام:

ابھی تک جو بحث جاری ہے اس سے یہ سمجھ آیا کہ وہ حضرات جن کو تقوی کا اعلیٰ مقام حاصل ہو جاتا ہے ان کے دل میں اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی اور کا مقام نہیں رہتا، بلکہ وہ اپنے آپ کو فانی سمجھتے ہیں اور تمام مخلوق کو درجہ فنا میں سمجھتے ہیں۔ اسی پر علامہ رازی رحمہ اللہ نے ایک واقعہ بیان فرمایا ذرا آپ بھی سنیں۔

ایک بزرگ شیخ کے پاس ملن کے مرید آئے کہ ہم اکثر اوقات وسوسوں میں مبتلا رہتے ہیں ان سے نجات حاصل کرنے کا کیا ذریعہ ہے؟ شیخ نے کہا میں دس سال لوہاروں کا کام کرتا رہا دس سال دھوبیوں کا اور دس سال چوکیدار بن کر دروازہ پر پہرہ دیتا رہا، پھر کہیں غیروں کے خیالات دل سے نکلے اور واپس لوٹنے کی جگہ نہ ملی۔

آپ کے مریدین نے کہا ہم نے تو آپ کو یہ کام کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آپ نے کہا کام تو یہ میں کرتا رہا البتہ تم دیکھ نہیں سکے۔

ہاں اب سمجھنے کی کوشش کرو۔ بیشک دل لوہے کی طرح ہے میں لوہار بن کر جہنم کی آگ کے خوف کے ہتھوڑے سے دس سال اسے کوٹتا رہا۔ اس کے بعد دس سال میں اسے گناہوں، لغزشوں کی میل کچیل سے دھو کر صاف کرتا رہا اس کے بعد پھر دس سال میں " لا الہ الا اللہ " کی تلوار لے کر دل کے دروازے پر پہرہ دیتا رہا پھر کہیں غیروں کی محبت کو دل سے نکالنے میں کامیاب ہوا، اس وقت سے لے کر آج تک اس دل میں صرف اللہ تعالیٰ کی محبت جاگزیں ہے۔ کیونکہ جب دل کا میدان غیر اللہ سے خالی ہو جائے اور اس میں رب تعالیٰ کی محبت راسخ ہو جائے۔ تو اللہ تعالیٰ کے جلال کے سمندروں میں سے ایک نور کا قطرہ اس کے دل میں آ جاتا ہے۔ اب وہ دل اس ایک قطرہ میں غرق ہو جاتا ہے۔ باقی تمام چیزیں اس دل کو مستغرق اور فانی سمجھ کر اس سے دور ہو جاتی ہیں لیکن حقیقت میں اب دل کو بقاء حاصل ہوئی۔ وہ دل اللہ تعالیٰ کے راز "لا الہ الا اللہ" کا مسکن بن گیا۔

واضح ہوا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو گیا اس کے دل میں صرف اللہ تعالیٰ سما سکتا ہے اگر کوئی اللہ کا محبوب اس کے دل میں آئے گا تو وہ صرف اس وجہ سے کہ وہ اللہ کا محبوب ہے۔ یا اللہ مدد، یا اللہ مدد کے نعرے اور دیواروں، بسوں اور ویگنوں پر یا اللہ مدد اور صرف خدا سے مانگو کے اشتہار اور چوراہوں پر چندہ مانگنے کے کیمپ یہ دوغلی پالیسی یہ دھوکہ بازی، مکاروں کے مکر و فریب کو واضح کرتی ہے۔ ہاں مشائخ کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی کا نہ آنا، رب کا قرب خاص حاصل ہونے کی علامت ہے۔

(۵) لفظ اللہ یا مشتق ہے "ولہ" (ض،س) سے جس کا معنی ہے متحیر ہونا، عقل کا چلا جانا۔ اس

معنی کے لحاظ پر رب تعالیٰ کا اسم گرامی ''اللہ'' کا معنی ہو گا کہ وہ ذات جس کی معرفت کے حصول میں عقلیں گم ہو گئیں۔

اس لئے کہ مخلوق کی دو قسمیں ہیں ایک وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی معرفت کے سمندر کے ساحل (کنارہ) پر پہنچ جاتے ہیں ان کو واجدین کہا جاتا ہے۔اور دوسرے وہ ہیں جو اس مقام تک بھی نہ پہنچنے کی وجہ سے محرومین کہلاتے ہیں۔

واجدین یعنی ساحلِ بحرِ معرفت تک پہنچنے والے اس لئے عقلیں گم کئے ہوتے ہیں کہ وہ جب معرفت کے سمندر کے کنارے تک پہنچتے ہیں تو وہ صمدیت کے میدانوں میں سرگرداں ہو جاتے ہیں۔یعنی اس سے آگے ان کو اللہ تعالیٰ کی بے نیازی کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ اس مقام پر اپنے آپ کو تنہا سمجھتے ہیں اس سے یہ پتہ چلا کہ مقام ولایت کے اعلیٰ مقام پر فائز حضرات بھی رب تعالیٰ کی معرفت میں متحیر اور عقلیں گم کئے ہوتے ہیں۔

محرومین یعنی وہ لوگ جو معرفت کے دریا کے کنارے تک بھی نہیں پہنچ پاتے وہ حیرت کی تاریکیوں اور جہالت کی ضلالت (بھٹک) میں سرگرداں ہونے کی وجہ سے عقلوں کو گم کئے ہوتے ہیں۔

یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ انسانی روحیں ایک دوسرے سے توحید و تمجید کے میدان میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتی ہیں۔کوئی آگے نکل جاتی ہیں کوئی پیچھے رہ جاتی ہیں۔

پیچھے رہ جانے والی روح گویا کہ غبار کی تاریکیوں میں آ جانے کی وجہ سے متحیر ہوتی ہیں جس طرح عقل گم کیا ہوا وادی میں بھٹک رہا ہوتا ہے اور آگے نکل جانے والی روح عالم انوار میں پہنچ جاتی ہیں اس لئے وہ عالم کرامات کے انوار میں آ جانے کی وجہ سے متحیر ہوتی ہیں۔کیونکہ وہ اور آگے جانے کی فکر میں ہوتی ہیں۔ذات باری تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے، لیکن وہاں تک رسائی حاصل نہ ہونے کی وجہ سے ان کا بھی وہی حال ہوتا ہے جو عقل گم کئے ہوئے حضرات کا ہوتا ہے۔

(۲) اگر لفظ ''اللہ'' مشتق ہو '' لاہ یلیہ لیھا '' سے تو اس وقت معنی ہو گا بلند ہونا رب تعالیٰ کو مرتفع (بلند) کہنے کی وجہ کیا ہے؟ جب کہ وہ بلندی و پستی سے پاک ہے کیونکہ ان چیزوں کا تعلق مکین

سے ہے وہ تو مکان سے پاک ہے اس ذات کبریاء کے بلند ہونے کی وجہ یہ ہے:

" والحق سبحانه وتعالیٰ هو المرتفع عن مشابهة الممكنات ومناسبة المحدثات "

رب تعالیٰ ممکنات کی مشابہت سے پاک ہے اور حادث اشیاء کی مناسبت سے پاک ہے یہی اس کی حالت ارتفاع ہے کہ وہ ممکنات وحوادث کی مناسبت ومشابہت سے مرتفع ہے۔

"لان الواجب لذاته ليس الا هو" "اس لئے کہ واجب لذاتہ سوائے اس ذات کے اور کوئی نہیں"۔

" الكامل لذاته ليس الا هو" "کیونکہ کامل لذاتہ اس کے بغیر اور کوئی نہیں"۔

" والاحد الحق فی هويته ليس الا هو " "اپنی حقیقت وماہیت میں ایک اور حق اس کے علاوہ اور کوئی نہیں"۔

" والموجد لكل ماسواه الا هو " "تمام چیزوں کو معرض وجود میں لانے والا اس کے بغیر اور کوئی نہیں"۔

ہاں اگر یوں کہہ دیا جائے کہ رب تعالیٰ کو مکان کے لحاظ سے بلندی حاصل ہے تو یہ کہنا بھی جائز ہے البتہ یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ کیسے؟ وہ اس طرح کہ تمام کائنات کو مکان میں مکین ہونا بالعرض حاصل ہے۔ جب کوئی چیز مکان میں ہوگی تو اسے مکان کے لحاظ سے بلندی یا پستی حاصل ہوگی۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ جب مکین کو مکان سے بلندی حاصل ہوگی تو مکان اس سے پہلے بلند ہوگا۔ اگر یہی بات رب تعالیٰ کی ذات میں تسلیم کی جائے تو لازم یہ آئے گا۔

" فلو كان هذا الارتفاع بسبب المكان لكان ذلك المكان اعلى واشرف من ذات الرحمن "

یعنی اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ رب تعالیٰ کو ارتفاع (بلندی) مکان کی وجہ سے حاصل ہے تو رب تعالیٰ کی ذات سے مکان کو اعلیٰ اور اشرف ماننا پڑے گا یہ سراسر باطل ہے کہ تصور بھی کیا جاسکے کہ اللہ تعالیٰ کو علو (بلندی) حاصل ہے کہ اس کا مکان اعلیٰ ہے۔

ہاں پھر کس طرح رب تعالیٰ کی بلندی مکان کے لحاظ پر تسلیم کی جائے؟ " فهو تعالیٰ مرتفع عن ان يقال ان ارتفاعه بحسب المكان " وہ یوں کہا جائے گا کہ رب تعالیٰ کے متعلق یہ کہنا کہ اسے مکان کی وجہ سے ارتفاع حاصل ہے وہ اس تصور، خیال، اقوال باطلہ سے مرتفع ہے۔

یہ ہے رب تعالیٰ کی بلندی مکان کے حساب سے۔ آسان لفظوں میں یوں کہیں رب تعالیٰ کو بلندی حاصل ہے بالذات، اس کی بلندی اسباب ومکانات کے تابع نہیں اور مخلوق کی بلندی بالعرض

ہے جو اسباب اور مکانات کے تابع ہے۔

(۷) اگر لفظ ''اللہ'' کو " لاہ یلوہ ولوھا " سے مشتق مانا جائے تو معنی ہوگا محجوب ہونا۔ یہ بھی خیال رہے کہ اصل میں معنی ہے ''سراب کی چمک '' لیکن جس طرح ریت دور سے اپنی چمک سے پانی دکھائی دیتی ہے لیکن پانی محجوب ہوتا ہے اسی مناسبت سے محجوب ہونے کا معنی لیا گیا ہے۔

رب تعالیٰ کو محجوب کہنے کی وجہ یہ ہے "انہ بکنہ صمدیتہ محتجب عن العقول " بیشک اللہ تعالیٰ اپنی حقیقت صمدیت (بے نیازی) کی وجہ سے عقلوں سے محجوب ہے کہ عقلیں اسے پانے سے قاصر ہیں۔

بلکہ یوں کہا جائے کہ جس طرح سورج کی روشنی جب دیواروں پر پڑ رہی ہوتی ہے سورج سامنے ہوتا ہے تو انسان بظاہر یہ سمجھتا ہے کہ دیوار خود بخود روشن ہے لیکن سورج کے غائب ہونے پر پتہ چلتا ہے کہ وہ روشنی دراصل سورج کی تھی۔ اسی طرح کائنات کا وجود دراصل رب کائنات کے وجود حقیقی کا عکس ہے بظاہر پتہ چلتا ہے کہ لوگ خود بخود موجود ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں اگر رب تعالیٰ کی ذات پر طلوع ہونا، غروب ہونا محال نہ ہوتا تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ اگر بالفرض محال اللہ تعالیٰ غائب ہوتا تو کائنات کا وجود بھی غائب ہو جاتا۔ اس لئے کہ کائنات کا وجود ذاتی طور پر اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں وجود باری تعالیٰ کا محتاج ہے کائنات کا وجود۔ رب تعالیٰ کے وجود کی ضوء کا عکس ہے کائنات کے وجود کی ضوء۔ لیکن لوگوں کی عقلوں سے یہ بات محجوب ہے اسی لئے بعض محققین نے کیا خوب کہا:

"سبحان من احتجب عن العقول بشدۃ ظھورہ واختفی عنھا بکمال نورہ"

پاک ہے وہ ذات جو بہت زیادہ ظاہر ہونے کے باوجود عقلوں سے محجب (عقل میں نہ آنے کی وجہ سے پوشیدہ) ہے اور کامل طور پر بوجہ نورانیت کے آب و تاب سے چمکتے ہوئے بھی عقلوں سے مخفی ہے۔

(۸) لفظ ''اللہ'' کبھی مشتق ہوتا ہے الہ (س) الھا، سے جس کا معنی کبھی " الھت علیہ " سے لیا جاتا ہے جس کا معنی ہوتا ہے ''میں نے اس پر بہت جزع وفزع کیا'' اور کبھی معنی ہوتا ہے کسی کے پاس جا کر جزع وفزع کرنا، پریشانی کا اظہار کرنا جب اپنی پریشانی کو بے قراری کی حالت میں کسی کے

سامنے بیان کیا جائے، تو اسے رحم آتا ہے اسوقت کہا جاتا ہے " فالهه (بروزن سمعه) ای اجاره " یعنی اس نے اس شخص کو پناہ دے دی۔

ہر مصیبت، ہر پریشانی سے پناہ دینے والا رب تعالیٰ ہی ہے لہذا اس کے معنی کے لحاظ پر مولائے کائنات کو اس لئے اللہ کہا جاتا ہے کہ وہ ہر مشکل میں پناہ دینے والا ہے۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾

تم فرماؤ کس کے ہاتھ ہے ہر چیز کا قابو اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے خلاف کوئی پناہ نہیں دے سکتا

اسی کی طرف رجوع کیا جائے کیونکہ منعم حقیقی وہی ہے "وما بكم من نعمة فمن الله" تمہارے پاس جو نعمت ہے سب اللہ کی طرف سے ہے انسان کو طعام عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی تو ہے ﴿وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ﴾ وہ کھلاتا ہے اور کھانے سے پاک ہے۔ کائنات کو موجود کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے ﴿ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ﴾ فرمادو ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ ہر پریشانی میں رب تعالیٰ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور وہی پناہ عطا فرماتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

بحث مذکور سے اقوال اولیاء کرام کی حلاوت:

ابھی تک رب تعالیٰ کے اسم گرامی لفظ "اللہ" کے متعلق جو بحث کی اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ اولیاء عظام کے کلمہ توحید کے معانی اسی بحث کی۔ " لا مقصود الا الله " اللہ کے بغیر اور کوئی مقصود ہی نہیں۔

اور یہ معنی کیا جاء تجلی ہیں۔ عام مشہور معنی میں تو اتفاق ہے کسی کا کوئی اختلاف نہیں کہ " لا اله الا الله " کا معنی اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

تاہم یہ معانی بھی ذوق وحلاوت سے خالی نہیں۔ " لا اله الا الله " کا معنی یہ کیا جائے "لا مطلوب الا الله " اللہ کے سوا کوئی مطلوب نہیں۔

اور معنی یہ کیا جائے " لاموجود الا الله " اللہ کے بغیر وجود حقیقی کے لحاظ سے کوئی موجود ہی نہیں۔

سبحان اللہ! کیا خوب تھے وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی معرفت میں قرآن وحدیث کو سمجھنے میں عمریں صرف کر دیں۔ دنیا کی عیاشی ان کے سامنے مچھر کے پر سے بھی زیادہ حقیر تھی۔ آج بھی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے دینی مدارس میں پڑھنے والے طلباء اور انکے والدین اور پڑھانے والے علماء کرام اسی طرز پر چل رہے ہیں۔

لیکن افسوس کہ انگریز کے آلہ کار یہودیوں کے پٹھو، زہر پر مٹھائی چڑھا کر یعنی کمپیوٹر اور انگریزی تعلیم سے بڑے عہدے مل جانے کی لالچ دلا کر علماء کو جاہل بنانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں تاکہ ہماری مرضی کے مطابق یہ فتوے دے دیا کریں۔ نہ دین کو سمجھیں اور نہ ہی کسی بات پر اڑ جائیں کہ یہ دین کے خلاف ہے گریجویٹ نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں یہ ڈاکٹر، وکیل، انجینئر، سائنس دان کو مولوی بنانے کی ترغیب نہیں دیتے البتہ مولوی کو انگریز کا آلہ کار بنانے کی فکر ہمیشہ ان کو کھائے جا رہی ہے مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ یہ خواب ان کا پورا نہیں ہوگا۔ تاریخ کا وہ سیاہ دن ہو گا جس دن دینی مدارس حکومت کی سرپرستی کو قبول کر لیں گے۔ بہاولپور یونیورسٹی جیسا ہی حال ہوگا۔

اسم اعظم کیا ہے: ایک قول کے مطابق " ذوالجلال والاکرام " ایک اور قول یہ ہے "الحی والقیوم " اور بعض حضرات نے کہا ﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ﴾ بعض حضرات اس کے قائل ہیں " اسماء اللہ کلها عظیمة مقدسة ولا یجوز وصف الواحد منها بانه اعظم " اللہ تعالیٰ کے تمام نام ہی عظیم اور مقدس ہیں کسی ایک کو اعظم نہ کہا جائے۔ لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ اسم اعظم لفظ ''اللہ'' ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا حقیقی نام ہے۔ اور ذات مخصوصہ پر دلالت کر رہا ہے اور باقی تمام صفاتی نام ہیں۔

(از کبیر جزء اول ص ۱۱۵)

عربی کا کوئی بھی لفظ اللہ کی مثل نہیں:

جس طرح رب تعالیٰ کی ذات پاک بے مثل ہے اسی طرح اس کا نام مبارک لفظ اللہ بھی بے مثل ہے عربی کا کوئی لفظ بھی ہو جب اس سے کوئی حرف حذف کر دیا جائے (ہٹا دیا جائے) تو اس کی

اپنی اصلی حیثیت معنوی ختم ہو جاتی ہے یا تو وہ بالکل بے معنی رہ جاتا ہے۔اور یا معنی بدل جاتا ہے لیکن سبحان اللہ مولائے کائنات کا اسم گرامی کتنا ہی ذیشان ہے کتنا ہی باکمال ہے کہ اس سے کوئی لفظ بھی حذف کیا جائے اس کی معنوی حیثیت برقرار رہتی ہے۔وہ ہر حال میں خالق کائنات پر ہی دلالت کرتا ہوا نظر آئے گا۔

آیئے ذرا اس لفظ ''اللہ'' کے کمال کی جھلک کو دیکھئے۔اگر لفظ ''اللہ'' کے الف کو حذف کریں اور باقی لفظ کو اپنے حال پر رہنے دیں تو لفظ ہوگا ''للہ'' یہ لفظ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہی خاص ہے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اللہ کے لئے ہی ہیں آسمانوں اور زمین کے لشکر۔اور ارشاد گرامی ﴿وَ لِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہیں آسمانوں اور زمین کے خزانے۔

الف کو حذف کرنے کے ساتھ ساتھ لام بھی حذف کر دیا جائے تو اب لفظ باقی رہنے والا ''لہ'' ہے یہ لفظ بھی رب تعالیٰ کی ذات کے لئے بولا گیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اسی کی قبضہ قدرت میں آسمانوں اور زمین کی چابیاں ہیں۔رب تعالیٰ کا اور ارشاد گرامی ہے ﴿لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ﴾ اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کے لئے حمد ہے۔

اگر الف لام کے حذف کرنے کے بعد دوسرے لام کو بھی حذف کر دیا جائے تو باقی رہے گا ''ہٗ'' یہ لفظ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ فرما دیجئے وہ اللہ ایک ہے اور فرمایا ﴿هُوَ الْحَيُّ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ وہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہے اس کے بغیر اور کوئی معبود نہیں۔

اعتراض: جو تم نے مثالیں ذکر کی ہیں ان میں ''ھو'' ہے اور لفظ ''اللہ'' کا الف اور دونوں لاموں کے حذف کرنے سے لفظ ''ہٗ'' رہ جاتا ہے مثال سے مسئلہ کس طرح ثابت ہوتا ہے۔

جواب: جب پیش کو کھینچ کر پڑھا جائے تو ''واوٗ'' خود بخود سمجھ میں آتی ہے۔اس لئے ''ہٗ'' پر الٹی پیش اور ''ھو'' کا ایک ہی مطلب ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ ''ھو'' کی واو معرض زوال میں ہے

کیونکہ تثنیہ میں "هما" اور جمع میں "هم" ہے جو لفظ معرض زوال میں ہو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

(از کبیر جزء اول ص ۱۶۳)

رب تعالیٰ کا کوئی اسم گرامی لفظ اللہ کا مثل نہیں:

ابھی تک جو بیان کیا گیا ہے وہ لفظ "اللہ" کی لفظی حالت اور لفظی خوبی تھی۔ لیکن غور و فکر کرنے سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ لفظ "اللہ" کی معنوی خوبی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے کسی اور اسم گرامی کو حاصل نہیں۔ اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ کے لئے "رحمن ورحیم" کو ذکر کیا تو اس کی صفت رحمت کو ذکر کیا اور جب "قهار" کہا تو اس کے قہر کو ذکر کیا اور جب "علیم" کہہ کر پکارا تو اس کی صفت علم کو ذکر کیا اور جب "قدیر" اور "قادر" کہا تو اس کی صفت قدرت کو ذکر کیا۔ غرضیکہ ایک اسم گرامی سے ایک صفت کا پتہ چلا دوسری کا پتہ نہ چل سکا۔ اسی طرح دوسرے اسم گرامی سے ایک اور صفت کا پتہ چلا اس صفت سے بھی کسی دوسری صفت کا علم حاصل نہ ہوا۔ "واما اذا قلت یا اللہ فقد وصفته بجميع الصفات" لیکن جب تم "یا اللہ" کہو تو تم نے تمام صفات ذکر کر دیں "لان الا له لایکون الها الا اذاکان موصوفا بجميع هذه الصفات" اس لئے کہ "اله" اس وقت تک "اله" نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ ان تمام صفات کمالیہ سے متصف نہ ہو:

"فثبت ان قولنا "اللہ" قد حصلت له هذه الخاصية التي لم تحصل لسائر الاسماء"

اسی سے یہ ثابت ہوا کہ بیشک رب تعالیٰ کے اسماء گرامی میں سے جو خاصیت اور فوقیت لفظ اللہ کو حاصل ہے وہ کسی اور اسم گرامی کو حاصل نہیں۔

(کبیر جزء اول ص ۱۶۴)

لفظ اللہ کے بغیر کلمہ شہادت کی تکمیل نہیں:

بیشک کلمہ شہادت وہ کلمہ ہے جس کی وجہ سے کافر کفر سے اسلام کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن کافر کو اسلام لفظ "اللہ" کی وجہ سے حاصل ہوا۔

"فلو ان الکافر قال اشهد ان لا اله الاالرحمن او الا الرحیم او الا الملک او الا القدوس لم یخرج من الکفر ولم یدخل فی الاسلام"

اگر کافر یہ کہے " اشهد ان لا اله الا الرحمن "یا کہے "اشهد ان لا اله الا الرحیم " یا کہے "اشهد ان لا اله الا الملک "یا یہ کہے "اشهد ان لا اله الا القدوس" تو وہ کفر سے نہیں نکلے گا،اور نہ ہی اسلام میں داخل ہوگا۔"اما اذا قال اشهد ان لا اله الا الله،فانه یخرج من الکفر ویدخل فی الاسلام " لیکن جب کافر نے "اشهد ان لا اله الا الله "کہا تو وہ کفر سے نکل جائے گا اور اسلام میں داخل ہو جائے گا۔اس سے واضح ہوا کہ جو خاصیت وفوقیت لفظ "اللہ" کو حاصل ہے وہ کسی اور اسم گرامی کو حاصل نہیں۔

اللہ اللہ کرنے کا عظیم فائدہ:

اللہ تعالیٰ کے ذکر میں عظیم فائدہ ہے اور اسے شرف وکمال حاصل ہے۔نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

" اذا ذکرنی عبدی فی نفسه ذکرته فی نفسی واذا ذکرنی فی ملأ ذکرته فی ملأ خیر من ملأه"

جب میرا بندہ مجھے دل میں یاد کرتا ہے تو میں اسے دل میں یاد کرتا ہوں۔اور جب وہ مجھے جماعت میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اس کی جماعت سے بہتر جماعت میں یاد کرتا ہوں۔

جب یہ ثابت ہوا تو اسی سے یہ بھی واضح ہوا " افضل الاذکار ذکر الله بالثناء الخالی عن السوال " سب ذکروں سے بہتر "اللہ" کا ذکر ہے کیونکہ اس میں صرف اللہ تعالیٰ کی تعریف ہے جو سوال سے خالی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا رب تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: " من شغله ذکری عن مسئلتی اعطیته افضل ما اعطی السائلین " جو شخص میرے ذکر میں مشغول رہنے کی وجہ سے مجھ سے سوال نہ کرے میں اسے سوال کرنے والوں سے زیادہ عطا کرتا ہوں۔

بندہ چونکہ فقیر اور محتاج ہے جو شخص فقیر اور محتاج ہوتا ہے وہ جب بھی کسی کی خدمت کرتا ہے اور اسے کوئی خطاب کرے تو اس میں وہ ایسے آداب استعمال کرتا ہے جس سے طلب اور سوال کی جھلک نظر آتی ہے۔

جب فقیر غنی کو کہے "یاکریم" اسی سے پتہ چل گیا کہ وہ دراصل یہ کہنا چاہتا ہے "اکرم" مجھ پر کرم کرو، احسان کرو، مہربانی کرو۔ اور اگر کہے "یا نفاع" اے نفع دینے والے تو اسی سے واضح ہوجاتا ہے کہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ مجھے نفع پہنچاؤ یعنی مجھ پر مہربانی کرو مجھے کوئی مال عطا کرو۔

اس بحث سے ہی یہ واضح ہوجاتا ہے کہ بندہ جب کہتا ہے "یا رحمن" تو اس بندے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اے اللہ مجھ پر رحم کر۔ خواہ وہ ظاہر طور پر رحم کا سوال کرے یا نہ کرے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے باقی ناموں میں بھی کسی چیز کی طلب کا سوال نظر آتا ہے۔ یا کسی چیز سے بچنے کا سوال نظر آئے گا مثلاً جب یہ کہے "یاقھار" اے قہر کرنے والے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے اللہ مجھے اپنے قہر وغضب سے بچا۔

" وقد بینا ان الذکر انما یعظم شرفه اذا کان خالیا عن السوال والطلب "

جب ہم پہلے واضح کرچکے ہیں کہ وہی ذکر بہتر ہے جو سوال اور طلب سے خالی ہو۔ جب انسان کہے" یااللہ " "یاھو " ان میں سوال کی جھلک نہیں پائی گئ بلکہ خالص اللہ تعالیٰ کا ذکر پایا گیا۔"فوجب ان یکون اعظم الاذکار "پس ضروری ہے کہ خالص اللہ تعالیٰ کا ذکر یعنی"یا اللہ یااللہ" کرتے رہنا اسی طرح "یاھو، یاھو" کرنا ہی بہتر ذکر ہے۔

(از کبیر جزء اول ص ۱۵۱)

الرحمن الرحیم : دونوں اسم ہیں مبالغہ کا معنی ان میں پایا گیا ہے۔ یعنی بہت رحم کرنے والے کو رحمٰن اور رحیم کہا جاتا ہے۔ یہ الفاظ رحم رحما (س) سے لئے ہوئے ہیں۔ "الرحمة" کا لغوی معنی یہ ہے دل کا نرم ہونا اور نفس کا میلان جو کسی پر مہربانی کرنے اور احسان کرنے کا تقاضا کرے۔

اعتراض: اللہ تعالیٰ تو دل اور جسمانی تمام اعضاء سے پاک ہے۔ وہاں دل کا نرم ہونا اور احسان کرنے والا معنی مراد نہیں لیا جاسکتا تو کس طرح رب تعالیٰ کو رحمٰن ورحیم کہا جائے گا۔

جواب: "اسماء اللہ تعالیٰ انما تؤخذ باعتبار الغایات " اللہ تعالیٰ کے وہ اسماء جو ظاہری معنی کے لحاظ سے اس کی ذات پر نہیں بولے جاسکتے ان میں غایات (نتائج ومقاصد) کا اعتبار

کیاجاتا ہے۔رب تعالیٰ کو "رحمن ورحیم" صرف اس معنی کے لحاظ سے کہاجائے گا کہ وہ مہربانی کرتا ہے اور فضل فرماتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کو المستھزئ (ٹھٹھا کرنے والا) نہیں کہاجائے گا بلکہ اس کا معنی ہوگا وہ ٹھٹھا کرنے والوں کو بدلہ دینے والا ہے۔اسی طرح رب تعالیٰ کو "الماکر" اس لئے نہیں کہاجاتا کہ وہ مکر کرنے والا ہے بلکہ اس لئے کہاجاتا ہے کہ وہ خفیہ تدبیر کرنے والا ہے۔

رحمن اور رحیم میں فرق : عربی کا ایک مشہور ضابطہ ہے:" زیادة المبانی تدل علی زیادة المعانی " حروف کی زیادتی معانی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے۔جیسے قطع (طاء مخفف) کا معنی ہے، اس نے کاٹا۔اور قطّع (طاء مشدد) کا معنی ہے،اس نے ٹکڑے ٹکڑے کیا۔

رحمان میں پانچ حروف ہیں (رحمٰن کی کھڑی زبر دراصل الف ہی ہے)اور رحیم میں چار حروف ہیں۔یقیناً رحمٰن کے معنی میں زیادتی ہوگی بنسبت "رحیم" کے۔

اس زیادتی کا اعتبار دوطرح ہے ایک کمیت (مقدار،تعداد) کے لحاظ سے اور دوسرا کیفیت کے لحاظ سے۔

مقدار کے لحاظ سے "رحمن" کے معنی میں زیادتی کا اعتبار اس طرح کریں گے کہ کہاجائیگا "یا رحمن الدنیا "اے دنیا میں رحم کرنے والے۔چونکہ دنیا میں رب تعالیٰ کی رحمت عام ہے مومنوں اور کافروں سب کو شامل ہے۔اور کہاجائے گا "یارحیم الآخرة" اے آخرت میں رحم کرنے والے۔آخرت میں رب تعالیٰ کی رحمت مومنوں سے خاص ہوگی۔اس لئے واضح ہوا کہ "رحمان" کے معنی میں زیادتی ہے۔

کیفیت کے لحاظ سے اس کا عکس (الٹ) اعتبار کرنا پڑے گا ،یعنی کہاجائے گا "یا رحمن الآخرة "اے آخرت میں رحم کرنے والے اور کہاجائے گا"یا رحیم الدنیا" اے دنیا میں رحم کرنے والے چونکہ اخروی نعمتیں عظیم ہیں جلیل القدر ہیں اس لئے کیفیت کے معنی کے لحاظ سے "رحمان" کا تعلق اخروی نعمتوں سے زیادتی ثابت کرے گا کیونکہ دنیا کی نعمتیں اخروی نعمتوں کے مدمقابل گھٹیا حقیر یعنی تھوڑی شان والی ہیں۔

رحمٰن کو مقدم کرنے کی وجہ:

جب رحمان کے معنی میں زیادتی ہے تو عقل کا یہ تقاضا ہے کہ رحیم کو پہلے ذکر کیا جاتا کیونکہ ادنی سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہوتی ہے لیکن جب دنیا کی نعمتوں سے نفع حاصل کرنا پہلے ہے اور اخروی نعمتوں کا حصول بعد میں تو اس لئے "رحمن" کو پہلے ذکر کیا گیا کیونکہ رحمٰن کا تعلق جب دنیا سے ہوگا مومنوں اور کافروں پر رحمت کرنے کا اعتبار ہوگا تو رحمٰن کا ذکر یقیناً پہلے ہی مناسب ہوگا۔

(از بیضاوی ص ۵)

سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی حکمت کو کامل طور پر انسان کی ناقص عقل کیسے سمجھ سکتی ہے۔

لفظ "رحمٰن" رب تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے:

اگرچہ لغوی معنی کے لحاظ سے ہر رحم کرنے والے انسان کو بھی رحمٰن کہنا بظاہر عقل کا تقاضا تھا لیکن " انه صار كالعلم من حيث انه لايوصف به غيره "یہ لفظ اللہ تعالیٰ کا حقیقی علم (نام) کی حیثیت میں ہوگیا، یہ نام کسی اور کا نہیں ہوسکتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ منعم حقیقی ہے۔ بہت زیادہ رحم کرنے والا ہے، انتہاء درجہ تک رحم کرنا صرف رب تعالیٰ کا خاصہ ہے کسی اور سے اتنا عظیم رحم کرنے کا تصور ممکن ہی نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مخلوق میں سے کوئی بھی اگر مہربانی کرتا ہے انعام عطا کرتا ہے تو وہ اس کا بدلہ حاصل کرنے کی تمنا رکھتا ہے یا وہ آخرت میں ثواب حاصل کرنا چاہتا ہے یا وہ چاہتا ہے کہ دنیا میں لوگ میری تعریف کریں یا وہ چاہتا ہے کہ مجھے اس کے بدلہ میں مال مل جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے انعامات، اس کے فضل وکرم اور احسان اور رحم کرنے میں کسی قسم کے بدلہ کی امید کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے لفظ رحمٰن رب تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے۔

اور وجہ یہ ہے کہ مخلوق میں سے اگر کوئی رحم کرتا ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطاء کردہ قوت سے ذاتی طور پر مخلوق کو رحم کرنے کی قدرت وطاقت نہیں۔ لیکن باری تعالیٰ کا فضل وکرم اور رحم کرنا ذاتی ہے۔ اس لئے رحمٰن کا لفظ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہوگیا۔ (از بیضاوی)

" والحق ان الرحمن ابلغ لزيادة البناء ولذا اختص بالله دون الرحيم قال ابن عباس هما اسمان رقيقان احدهما ارق من الآخر " (مظهری)

حق یہ ہے کہ رحمٰن کے معنی میں زیادہ مبالغہ ہے کیونکہ اس میں الفاظ زیادہ ہیں۔اسی وجہ سے یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔لیکن رحیم کا لفظ رب تعالیٰ سے خاص نہیں۔بلکہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف میں بھی "رؤف رحیم" ذکر ہے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ دونوں نام ہی رقیق ہیں لیکن ایک ان میں سے بنسبت دوسرے کے زیادہ ہی رقیق ہے۔

تین اسماء گرامی اور ان کی ترتیب میں فائدہ:

اللہ تعالیٰ نے اپنے اسماء گرامی میں تین کا ذکر کیا اور ان میں سے پہلے لفظ "اللہ" ذکر کیا اس لئے کہ یہ رب تعالیٰ کا ذاتی نام ہے۔یقیناً ذات پہلے ہوتی ہے۔پھر اس ذات کے ساتھ صفات کا تعلق ہوتا ہے اس کے بعد لفظ رحمٰن کا ذکر کیا کیونکہ یہ رب تعالیٰ کا صفاتی نام ہے لیکن رب تعالیٰ کی ذات سے خاص ہونے کی وجہ سے دوسری جگہ پر اسے ذکر کیا۔اس کے بعد لفظ رحیم کو ذکر کیا اس لئے کہ یہ رب کائنات کا صفاتی نام ہے اور اس کی ذات سے خاص بھی نہیں۔

تین نام ذکر کر کے واضح کر دیا کہ معبود حقیقی وہی ہے اس کے بغیر کوئی عبادت کے لائق نہیں۔اور دنیاوی اور اخروی نعمتیں دینے والا فقط وہی ہے مصائب وآلام میں اسی کی طرف رجوع کیا جائے۔اور فقط اسی کی عبادت کی جائے جب کسی بندے کو رحم کرنے والا سمجھے تو پھر بھی عقیدہ یہی ہو کہ یہ رب تعالیٰ کی طرف سے دی ہوئی طاقت سے مجھ پر رحم کر رہا ہے۔ (از بیضاوی بزیادۃ)

تین نام ذکر کرنے کی اور حکمت یہ ہے:

کہ قرآن پاک میں مخاطبین کی تین قسمیں ہیں۔جس طرح رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَّمِنْهُمْ سَابِقٌ ۢ بِالْخَيْرَاتِ ﴾

یعنی ان تین قسموں میں سے ایک وہ لوگ ہیں جو اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے ہیں یعنی گناہوں میں مبتلاء رہتے ہیں، دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو بین بین ہوتے ہیں نیکی بھی کر لی گناہ بھی ہو گئے، تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو نیکیوں میں سبقت لے جانے والے ہیں۔

اس کے بعد یوں سمجھیں کہ رب تعالیٰ نے گویا کہ تسمیہ میں اس طرح ذکر فرما دیا ﴿اِنَا اللہُ لَسَابِقِیْنَ﴾ وہ لوگ جو نیکیوں میں سبقت لے جانے والے ہیں ان کے لئے میں اللہ ہوں یعنی جمیع صفات کمالیہ کا مالک ہوں۔ وہ ہمہ وقت میری الوہیت کا خیال کریں مجھے ہی فقط اپنے دل میں بسائے رہیں۔ توجہات کا مرکز مجھے ہی بنائیں۔

"وانا الرحمن للمقتصدین" اور میں مقتصدین (یعنی بین بین راہ چلنے والے جو کبھی گناہ بھی کر لیتے ہیں اور نیکی بھی کرتے ہیں) کے لئے رحمٰن ہوں۔ وہ اگر کوئی غلطی کر لیں تو میری رحمت سے فائدہ اٹھائیں توبہ کریں۔

"وانا الرحیم للظالمین" اور میں ظالموں کے لئے رحیم ہوں یعنی بڑے سے بڑا گنہگار بھی میری رحمت سے مایوس نہ ہو بلکہ صدق دل سے توبہ کرے تو میں اسے بھی بخش دوں گا اور میری رحمت کے دروازے اس کے لئے بھی کھلے ہیں۔ اور رب تعالیٰ نے تسمیہ میں اپنے تین نام ذکر فرما کر گویا کہ یوں ارشاد فرمایا:

" اَللہُ ھُوَ مُعْطِی الْعَطَاءِ وَالرَّحْمٰنُ ھُوَ الْمُتَجَاوِزُ عَنْ زَلاتِ الْاَوْلِیَاءِ ،
وَالرَّحِیْمُ ھُوَ الْمُتَجَاوِزُ عَنِ الْجَفَاءِ "

وہ ذات کبریاء اللہ ہے کیونکہ وہ انعامات عطا فرماتا ہے، اور رحمان اس لئے ہے کہ وہ اپنے دوستوں کی لغزشوں سے درگزر فرماتا ہے، اور رحیم اس لئے کہ اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والوں کے ظلم کو بھی معاف فرما دیتا ہے وہ اس کے حضور گردن جھکا کر تو دیکھیں۔

رب تعالیٰ کی رحمت کاملہ کو دیکھیں:

اب رب تعالیٰ کی رحمت کاملہ کا انداز آپ یوں کریں کہ وہ مالک کائنات انسان کے بہت بڑے جرائم کو دیکھتا ہے لیکن پردہ پوشی فرماتا ہے۔ انسان بعض اوقات ایسے جرائم میں مبتلا ہوتا ہے کہ اگر اس کے ان جرائم پر اس کے ماں باپ مطلع ہو جائیں تو یہ بھی اسے چھوڑ جائیں۔ اگر اس کی زوجہ کو پتہ چل جائے تو وہ بھی اس سے بگڑ جائے اس پر جفا کرنے کی راہیں تلاش کرنی شروع کر دے اگر اسکے متبعین

اس پر مطلع ہوجائیں۔تو وہ بھی اس سے دور بھاگ جائیں۔اگر اس کے پڑوسی کو پتہ چل جائے تو وہ گھر کو برباد کرنے کی کوشش کرے۔لیکن رب تعالیٰ اس کے جرائم کو دیکھ کر گویا کہ یوں کہتا ہے اے انسان

"وانا اعلم کل ذلک واستره بکرمی لتعلم انی اله کریم"

میں تیرے تمام جرائم ،غلط کاریوں کو جانتا ہوں لیکن پھر بھی میں اپنے کرم سے ان کی پردہ پوشی کر رہا ہوں تا کہ تجھے معلوم ہوجائے میں "اللہ کریم" ہوں۔

(از کبیر جزء اول ص ۱۷۱)

بسم اللہ شریف کا ہر حرف اپنے دامن میں کمال لئے بیٹھا ہے:

الباء۔ بسم اللہ کی باء بَر (باء کی زبر) پر دلالت کر رہی ہے "فھو البار علی المؤمنین" یعنی وہ مومنوں پر مہربان ہے دنیا اور آخرت میں مختلف انعامات واکرامات سے نوازنے کی وجہ سے اس کی مہربانی کوئی مخفی نہیں

"واجل بره ان یکرمھم یوم القیامة برؤیته"

رب تعالیٰ کی عظیم مہربانی یہ ہوگی کہ وہ اپنے بندوں کو قیامت کے دن اپنے دیدار سے مشرف فرمائے گا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ کسی مسلمان بزرگ کا پڑوسی یہودی بیمار ہوگیا وہ اس کی عیادت کے لئے گئے اور اسے کہا،تو اسلام قبول کرلے اس نے کہا میں کس وجہ سے ایمان قبول کروں؟ وہ بزرگ کہنے لگے جہنم کی آگ کے خوف سے اس نے کہا مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔وہ بزرگ کہنے لگے جنت کے حصول کی کامیابی کے لئے ہی اسلام قبول کرلو۔وہ کہنے لگا مجھے اس کی خواہش نہیں۔ انہوں نے پوچھا تم کیا چاہتے ہو اس یہودی نے کہا "علی ان یرینی وجھه الکریم" میں اس شرط پر ایمان لاتا ہوں کہ وہ مجھے اپنا دیدار کرادے۔

اس بزرگ نے کہا" اسلم علی ان تجد ھذا المطلوب "اسلام قبول کرلو تمہیں یہ مطلوب حاصل ہوجائے گا۔اس یہودی نے کہا تم مجھے اس کے متعلق ایک خط لکھ دو کہ وہ مجھے اپنی زیارت کرا دے انہوں نے اسے خط لکھ دیا۔اس نے اسلام قبول کرلیا اس کے ساتھ ہی اس کی وفات ہوگئی۔

مسلمانوں نے اس کی نماز جناہ ادا کی اور دفن کیا۔وہی بزرگ کہتے ہیں میں نے اسے خواب میں دیکھا کہ وہ (جنت میں) ٹہل رہا ہے۔(خراماں خراماں چل رہا ہے) میں نے اس سے پوچھا اے شمعون تیرے رب نے تیرے ساتھ کیا سلوک کیا؟

اس نے کہا"غفرلی وقال لی اسلمت شوقا الی "میری رب نے میری بخشش فرما دی اور مجھے کہا (کہ یہ میرا انعام تم پر اس لئے ہے) کہ تم نے میرے ملاقات کے شوق کی وجہ سے ایمان قبول کیا۔

السین : بسم اللہ کے لفظ سین سے رب تعالیٰ کے سمیع ہونے کی خبر ملتی ہے کہ وہ اپنے بندوں کی دعاؤں کو سنتا ہے۔

روایت کیا گیا ہے کہ حضرت زید ابن حارثہ ایک منافق کے ساتھ مکہ سے طائف کی جانب چلے جب یہ دونوں جنگل میں یعنی بے آباد زمین میں پہنچے تو منافق کہنے لگا کہ ہمیں اس جنگل میں کچھ دیر آرام کر لینا چاہئے۔اس طرح وہ دونوں جنگل میں داخل ہو گئے۔حضرت زید سو گئے تو منافق نے آپ کو مضبوطی سے باندھ دیا اور قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔حضرت زید نے اس سے کہا تو مجھے کیوں قتل کرنا چاہتا ہے؟ " قال ان محمدا یحبک وانا ابغضه "اس منافق نے کہا محمد ﷺ تمہارے ساتھ محبت کرتے ہیں اور میں ان سے بغض رکھتا ہوں۔(یعنی میں محمد (ﷺ) سے بغض رکھنے کی وجہ سے ان کے محبوب کو قتل کرنا چاہتا ہوں۔

زید نے عرض کیا " یا رحمن اغثنی "اے رحمٰن میری فریاد کو پہنچ۔ اچانک منافق نے آواز سنی کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے۔ "ویحک لاتقتله " تو برباد ہو جا اسے قتل نہ کر منافق اس بیابان جنگل سے باہر نکلا۔ادھر ادھر اس نے دیکھا اسے کوئی نظر نہ آیا اس نے پھر قتل کرنے کا ارادہ کیا۔اسے پھر ایک آواز آئی جو پہلے کی بنسبت قریب تھی کہ اسے نہ قتل کر۔ منافق نے پھر دیکھا اسے کوئی نظر نہ آیا اس نے تیسری مرتبہ پھر قتل کا ارادہ کیا۔اب اس نے اور زیادہ قریب سے آواز سنی اسے نہ قتل کر ابھی جنگل سے باہر نکل کر اس نے دیکھنے کا ارادہ کیا ہی تھا "فرأى فارسا معه رمح فضربه الفارس ضربة فقتله " تو اسے ایک سوار نظر آیا۔جس کے پاس نیزہ تھا اس گھڑ سوار نے اسے نیزہ مارا اور قتل کر دیا۔پھر اس سوار نے اس بیابان جنگل میں داخل ہو کر حضرت زید کی رسی کو کھولا اور انہیں کہا۔کیا تم مجھے

پہچانتے ہو پھر اس نے خود ہی اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا:

"انا جبریل حین دعوت کنت فی السماء السابعة فقال اللہ عزوجل ادرک عبدی وفی الثانیة کنت فی السماء الدنیا وفی الثالثة بلغت الی منافق"

کہ میں جبریل ہوں جب تم نے دعاء کی تو میں ساتویں آسمان میں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا کہ میرے بندے کی امداد کرو (تو میں نے وہاں سے ہی آواز دی) دوسری مرتبہ آسمان دنیا (پہلے آسمان) پر تھا۔ اور تیسری مرتبہ میں منافق کے پاس پہنچ گیا۔ (اس کا کام تمام کر دیا)۔ سبحان اللہ! مالک الملک بندے کی دعاء کو سن کر کیسے شرف قبولیت بخشتا ہے۔

المیم: "اما المیم فمعناہ من العرش الی ما تحت الثری ملکہ وملکہ"

بسم اللہ شریف کے میم سے پتہ چل رہا ہے کہ عرش سے لے کر تحت الثریٰ (سب زمینوں سے نیچے تر زمین) تک تمام کائنات رب تعالیٰ کی ملکیت میں ہے اور اسی ذات کی بادشاہی عرش سے تحت الثریٰ تک ہے۔

مطلب واضح ہے کہ میم سے "من العرش" میں "من" کے میم اور "ما تحت الثری" میں "ما" کی میم کی طرف اشارہ ہے۔

سدی نے بیان کیا حضرت سلیمٰن ابن داؤد علیہما السلام کے زمانہ میں قحط پڑ گیا لوگ آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے "یا نبی اللہ لو خرجت بالناس الی الاستسقاء" اے اللہ کے نبی اگر آپ لوگوں کو لے کر باہر نکلیں اور بارش طلب کرنے کے لئے دعاء کریں تو بہت ہی بہتر ہے آپ لوگوں کو لے کر نکلے تو آپ نے دیکھا کہ ایک چیونٹی اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر ہاتھ پھیلا کر یہ دعا کر رہی ہے

"اللھم انا خلق من خلقک ولا غنی لی عن فضلک"

اے اللہ تیری مخلوق میں سے میں بھی مخلوق ہوں میں تیرے فضل سے بے پرواہ نہیں۔

"فصب اللہ تعالیٰ علیھم المطر" اللہ تعالیٰ نے اسی وقت ان پر بارش برسا دی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا:

"ارجعوا فقد استجیب لکم بدعاء غیر کم" لوٹ چلو تمہارے لئے دعا اور مخلوق کی قبول ہو گئی۔

یہاں تک "باسم" کی لفظی بحث بیان کی گئی لفظ اللہ اور الرحمٰن اور الرحیم کے متعلق تفصیلا پہلے ذکر کیا جاچکا ہے۔

تاہم لفظ "اللہ" کے ذکر کے متعلق علامہ رازی رحمہ اللہ اپنا موقف یوں بیان کرتے ہیں۔

اے لوگو! یقین کرلو، جان لو میں اپنی ساری زندگی "اللہ، اللہ" کرتا رہا جب میری موت آئے گی میں کہوں گا "اللہ" جب قبر میں مجھ سے سوال ہوگا میں کہوں گا اللہ اور جب قیامت میں حاضر ہوں گا تو کہوں گا اللہ۔ اور جب میں نامہ اعمال اپنے ہاتھ میں پکڑوں گا تو کہوں گا "اللہ" اور جب میرے اعمال کا وزن ہوگا تو میں کہوں گا "اللہ" اور جب میں پل صراط سے گزروں گا تو کہوں گا "اللہ" اور جب میں جنت میں داخل ہوں گا تو کہوں گا "اللہ" اور جب میں رب تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہوں گا تو کہوں گا "اللہ"۔ (از کبیر جز، اول ۱۷۰)

فائدہ: ﴿ اَللّٰہُ یُوْجِبُ وَلَایَتِہٖ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ☆ وَالرَّحْمٰنُ یُوْجِبُ مَحَبَّتِہٖ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَھُمَ الرَّحْمٰنُ وُدًّا☆ وَالرَّحِیْمُ یُوْجِبُ رَحْمَتِہٖ، وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا﴾

تسمیہ میں رب تعالیٰ نے اپنے اسم گرامی "اللہ" کو ذکر کر کے اپنے بندوں کو سمجھایا کہ جب تم میری الوھیت کا تذکرہ کرو گے اور اس پر ایمان لاؤ گے تو تمہیں میری ولایت حاصل ہوگی جس طرح خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ اللہ ولی ہے ایمان والوں کا۔

اور الرحمٰن ذکر کر کے یہ واضح کیا کہ اے میرے بندو مجھے الرحمٰن کہہ کر یاد کرنے والو میرے الرحمٰن ہونے پر ایمان لانے والو تمہیں میری محبت حاصل ہوگی ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُو الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَھُمَ الرَّحْمٰنُ وُدًّا﴾ بیشک وہ جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے عنقریب ان سے رحمٰن محبت کرے گا۔

اور الرحیم ذکر کر کے بتایا کہ اے میرے بندو مجھے الرحیم ماننے والو اور الرحیم کہہ کر میرا ذکر کرنے والو تمہیں میری رحمت حاصل ہوگی تمہیں میرا یہ ارشاد یاد رہنا چاہیے ﴿وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا﴾ وہ مومنوں پر رحم کرنے والا ہے۔

بسم اللہ شریف پڑھنے کے فضائل:

(۱) ایک مرتبہ موسیٰ علیہ السلام شدید مریض ہو گئے اور پیٹ میں درد ہو گیا اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی تکلیف کے مندفع (دور) ہونے کی التجا کی۔رب تعالیٰ نے آپ کو ایک جڑی بوٹی بطور دوا کھانے کا حکم دیا آپ نے وہ بوٹی کھائی تو آپ کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے شفا حاصل ہوگئی۔

کچھ عرصہ بعد آپ کو پھر تکلیف ہوگئی آپ نے اسی جڑی بوٹی (جنگلی گھاس) کو پھر استعمال کیا لیکن مرض میں اضافہ ہو گیا۔آپ نے رب کے حضور عرض کیا مولائے کائنات ماجرا کیا ہے میں نے پہلے وہی دوا استعمال کی شفاء حاصل ہوگئی دوبارہ اس سے تکلیف میں اضافہ ہو گیا؟ رب تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ پہلی مرتبہ تم اس گھاس کے پاس میرے حکم سے گئے تھے اور میرے حکم سے ہی تم نے اسے استعمال کیا تھا اس لئے تمہیں شفا حاصل ہوئی دوسری مرتبہ اس گھاس کے پاس خود ہی چلے گئے تھے کہ شائد اس گھاس میں یقینی طور پر شفاء ہے تو تمہاری مرض میں اضافہ ہو گیا۔

" اما علمت ان الدنیا کلها سم قاتل وتریاقها اسمی "

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمام دنیا زہر قاتل ہے اس کا تریاق صرف میرا نام ہے۔واضح ہوا کہ شفاء رب تعالیٰ کے نام میں ہے

دوا صرف ظاہری سبب ہے۔اس لئے دوا استعمال کرنے سے پہلے بسم اللہ شریف پڑھے اور ایمان یہ ہو کہ شفاء تو رب تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوتی ہے دوا تو صرف ایک ذریعہ ہے۔

(کبیر جزء اول ص ۱۴۷)

(۲) حضرت عمر بن ابی سلمہ کہتے ہیں میں چھوٹا تھا نبی کریم ﷺ کے زیر پرورش تھا میرا ہاتھ برتن میں گھوم رہا تھا (یعنی میں کبھی ادھر سے کھاتا، کبھی ادھر سے) تو نبی کریم ﷺ نے مجھے فرمایا:

" بسم الله و کل بیمینک و کل مما یلیک " (بخاری، مسلم، مشکوۃ، کتاب الاطعمة)

بسم اللہ پڑھو اور اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور جو تمہارے قریب ہو وہ کھاؤ۔

وضاحت حدیث: سم امر کا صیغہ ہے (باب تفعیل سے) جس کا معنیٰ " قل باسم اللہ" اور " اذکر اسم اللہ " اللہ کا نام کہو (ابتداء طعام میں) یا معنیٰ یہ ہے کھانے کی ابتداء میں

''اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کرو'' مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے۔

" کل مما یلیک ، ای مما یقربک لا من کل جانب "

جو کھانا تمہارے قریب ہو سامنے ہو وہ کھاؤ ہر طرف سے نہ کھاؤ اور ادھر ادھر ہاتھ نہ بڑھاؤ۔

" وهذا الحكم اذا كان الطعام في جميع الجوانب بمثابة واحدة اما اذا كان فيه اختلاف يعتد به فلا بأس بالأ كل من كل جانب " (مرقاة)

یہ حکم جو ہے کہ ادھر ادھر سے کھانا نہ کھایا جائے بلکہ سامنے سے کھایا جائے یہ اس وقت ہے جب تمام جانب کھانا ایک جیسا ہو اگر دستر خوان پر مختلف کھانے ہوں تو اپنی طبیعت کے مطابق کوئی کھانا بھی لیا جا سکتا ہے۔

اس حکم پر دلیل ترمذی کی حدیث ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے ایک طشت لایا گیا جس میں کھجوریں تھیں لیکن وہ مختلف قسم کی تھیں یعنی کوئی پکی اور کوئی کچی تو آپ نے حضرت عکراش ابن ذویب کو فرمایا:

" یا عکراش کل من حیث شئت فانه غیر لون واحد "

اے عکراش جہاں سے چاہو وہاں سے کھاؤ کیونکہ یہ مختلف رنگوں کی کھجوریں ہیں۔

(۳) نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" من اکل ولم یسم الله فاکل معه الشیطن " (رواه فی شرح السنة)

''جس شخص نے کھانا کھایا اور بسم اللہ نہ پڑھی شیطان اس کے ساتھ کھانا کھاتا ہے''

(۴) حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ ہوتے جب کھانا لایا جاتا ہم اس وقت تک ہاتھ کھانے پر نہیں رکھتے تھے جب تک نبی کریم ﷺ شروع نہ فرماتے اور اپنا ہاتھ کھانے پر نہ رکھتے ایک دفعہ ہم حاضر تھے آپ کے پاس کھانا لایا گیا ایک چھوٹی لڑکی دوڑتی ہوئی آئی اس نے اپنے ہاتھ کو طعام کی طرف بڑھایا۔" فاخذ رسول الله صلى الله عليه وسلم يدها " نبی کریم ﷺ نے اس کے ہاتھ کو پکڑ لیا۔ پھر ایک اعرابی بہت تیزی سے آیا اس نے اپنا ہاتھ کھانے پر رکھا آپ نے اس کے ہاتھ کو بھی پکڑ لیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

" ان الشيطان يستحل الطعام ان لايذكر اسم الله عليه "

بیشک شیطان اس کھانے کو اپنے لئے حلال سمجھتا ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ کا نام ذکر نہ

کیا جائے۔

بیشک شیطان اس لڑکی کو لے آیا تھا تا کہ اس کے ذریعے وہ اپنے لئے طعام حلال کر سکے۔ میں نے اس کے ہاتھ کو پکڑ لیا پھر وہ اعرابی کو لے آیا تا کہ اس کے ذریعے طعام کو حلال کر سکے۔ میں نے اس کے ہاتھ کو پکڑ لیا۔

" والذی نفسی بیدہ ان یدہ فی یدہ مع یدھا " (مسلم ،مشکوۃ کتاب الاطعمۃ)

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے بیشک اس (شیطان) کا ہاتھ اس لڑکی کے ہاتھ کے ساتھ میرے ہاتھ میں ہے۔

(۵) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" اذااکل احدکم فنسی ان یذکر اللہ علی طعامہ فلیقل بسم اللہ اولہ وآخرہ (ای فی اولہ وآخرہ یعنی علی جمیع اجزائہ " (ترمذی ،ابو داؤد ،مشکوۃ)

جب کوئی شخص تم میں سے کھانا کھائے اللہ کا نام لینا بھول جائے تو یہ پڑھے "بسم اللہ اولہ وآخرہ" یعنی میں اللہ کے نام سے ابتداء کر رہا ہوں اور اسی کے نام سے انتہاء کر رہا ہوں یعنی کھانے کے تمام اجزاء میں اللہ تعالیٰ کے نام کو شامل کر رہا ہوں۔

(۶) امیہ بن مخشی کہتے ہیں ایک شخص کھانا کھا رہا تھا اس نے بسم اللہ نہ پڑھی جب اس کا طعام سوائے ایک لقمہ کے باقی نہ رہا جب اس نے وہ لقمہ اپنے منہ کی طرف اٹھایا تو کہا "بسم اللہ اولہ وآخرہ" تو نبی کریم ﷺ مسکرائے اور فرمایا:

"مازال الشیطان یاکل معہ فلما ذکر اسم اللہ استقاء ما فی بطنہ "

(ابو داؤد ،مشکوۃ کتاب الاطعمۃ)

شیطان اس کے ساتھ کھاتا رہا جب اس نے اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کیا تو شیطان نے قے کر کے جو اس کے پیٹ میں تھا باہر نکال دیا۔

قے کرنے سے مراد برکت کا لوٹ آنا ہے جو برکت بسم اللہ کے نہ پڑھنے سے زائل ہوگئی تھی گویا کہ وہ برکت شیطان کے پیٹ میں بطور امانت تھی جب بسم اللہ پڑھی تو وہ واپس طعام کی طرف لوٹ آئی۔ (از مرقاۃ)

(۷) مستحب یہ ہے کہ بسم اللہ ہر فعل کے اول میں پڑھے کھانا کھاتے وقت، کوئی پینے کی چیز پیتے وقت، ذبح کے وقت، (البتہ ذبح کے وقت مکمل تسمیہ نہ پڑھے بلکہ "بسم اللہ، اللہ اکبر" پڑھے) جماع کے وقت، طہارت کے وقت، کشتی وغیرہ پر سوار ہوتے وقت وغیرھا۔

رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ﴾ کھاؤ اسے جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے ﴿وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللهِ مَجْرٖهَا وَمُرْسٰهَا﴾ اور (نوح نے) کہا سوار ہوجاؤ اس (کشتی) میں اللہ کے نام سے ہی اس کا چلنا ہے اور اس کا لنگر انداز ہونا ہے۔

(۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اغلق بابک واذکر اسم اللہ واطفِئ مصباحک واذکر اسم اللہ وخمر اناءک واذکر اسم اللہ واوک سقاءک واذکر اسم اللہ" (قرطبی)

تم اپنا دروازہ بند کرو تو اللہ کا نام ذکر کرو، اپنا چراغ بجھاؤ تو اللہ کا نام ذکر کرو، اپنے برتن کو ڈھانپو تو اللہ کا نام ذکر کرو، اپنے مشکیزہ وغیرہ کا منہ بند کرو تو اللہ کا نام ذکر کرو۔

یعنی ان تمام کاموں میں "بسم اللہ" پڑھنے کا حکم دیا گیا تا کہ شیطان سے بچاؤ ہو سکے اور خیر و برکت حاصل ہو سکے۔

(۹) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"لو ان احدکم اذا اراد ان یأتی اھلہ قال بسم اللہ اللھم جنبنا الشیطن وجنب الشیطن مارزقتنا فانہ ان یقدر بینھما ولد فی ذلک لم یضرہ شیطن"

اگر تم میں سے کوئی شخص اپنی زوجہ سے جماع کرنے کا ارادہ کرے تو بسم اللہ پڑھے پھر یہ دعاء پڑھے "اللھم جنبنا الشیطن وجنب الشیطن ما رزقتنا" اے اللہ ہمیں شیطان سے دور رکھ اور جو تو نے ہمیں ولد عطاء کرنا ہے اسے بھی شیطان سے بچا۔

اگر اس کی تقدیر میں اس جماع سے کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اسے شیطان کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ (قرطبی جزء اول ص ۹۸)

عثمان ابن العاص نے جب اسلام قبول کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے جسم میں درد ہوتا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا " ضع یدک علی الذی تألم من جسدک وقل بسم اللہ ثلاثا " اپنے ہاتھ کو اپنے جسم میں درد کی جگہ رکھ کر تین مرتبہ بسم اللہ پڑھو۔پھر سات مرتبہ یہ دعا پڑھو:

" اعوذ بعزة اللہ وقدرته من شرما اجد واحاذر " (قرطبی)

(۱۱) " عن عائشة رضی اللہ عنها قالت کان رسول اللہ ﷺ اذا مسی طهوره سمی اللہ تعالیٰ ثم یفرغ الماء علی یدیه " (دار قطنی، قرطبی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب وضو کرنے کے لئے لوٹے کو ہاتھ میں لیتے تو بسم اللہ پڑھتے ،پھر اپنے ہاتھوں پر پانی انڈیلتے۔

(۱۲) " قال النبی صلی اللہ علیه وسلم سترمابین الجن وعورات بنی آدم اذا دخل الکنیف ان یقول بسم اللہ " (ابن ماجہ، ترمذی، قرطبی)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ انسانوں کے ننگیز اور جنوں کے درمیان پردہ حائل ہوجاتا ہے جب کوئی شخص بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت بسم اللہ پڑھے۔یعنی بسم اللہ پڑھنے سے انسان کے ننگے جسم پر شیاطین مطلع نہیں ہوسکتے۔

(۱۳) نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" کل امر ذی بال لم یبدأ فیه باسم اللہ فهو ابتر" (بیضاوی)

ہر ذی شان کام جو بسم اللہ کے بغیر شروع کیا جائے وہ بے برکت ہوتا ہے۔

(۱۴) سعید بن ابی سکینۃ کہتے ہیں مجھے خبر ملی ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو " بسم اللہ الرحمن الرحیم " لکھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا "جودها فان رجلا جودها فغفرله" اسے عمدہ طریقہ سے لکھو کیونکہ ایک شخص نے بسم اللہ شریف کو عمدہ طور پر لکھا تو اس کی بخشش ہوگئی۔

سعید کہتے ہیں مجھے یہ خبر ملی کہ ایک شخص نے ایک کاغذ کو دیکھا جس میں "بسم اللہ الرحمن

الرحیم " لکھا ہوا تھا " فقبلہ ووضعہ علی عینیہ فغفرلہ " اس نے اس کاغذ کو چوما اور اپنی آنکھوں پر لگایا تو اس کی مغفرت ہو گئی۔

اسی سے قرآن پاک کو چوم کر آنکھوں پر لگانا باعث برکت ہونا ثابت ہو گیا۔ ہر ہر مسئلہ میں کسی نہ کسی سر پھرے کا آڑے آنا عجیب حماقت ہے۔ قرآن پاک کو چوم کر آنکھوں پر لگانے کے مخالفین بھی نظر آئیں گے سبحان اللہ ان کی کیا بدقسمتی۔

بشر حافی کی توبہ : وفیات الاعیان اور رسالہ قشیریہ میں ذکر کیا گیا ہے ایک مرتبہ بشر حافی کہیں جا رہے تھے راستہ میں انہوں نے ایک کاغذ دیکھا جس پر اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی لکھا ہوا تھا لیکن وہ پاؤں کے نیچے روندا جا رہا تھا انہوں نے وہ کاغذ اٹھایا، مہنگے داموں خوشبو خرید کر اس کاغذ پر لگائی اور اسے دیوار کے سوراخ میں ڈال دیا، رات کو سو گئے خواب میں دیکھتے ہیں کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے " یا بشر طیبت اسمی لا طیبنک فی الدنیا والأخرۃ " اے بشر تو نے میرے نام کو خوشبو لگائی ہے میں تجھے دنیا اور آخر میں خوشبودار بناؤں گا۔ بشر جب نیند سے بیدار ہوئے تو گناہوں سے توبہ کر لی پہلے چور تھے پھر ولی بن گئے۔ (از قرطبی مع حاشیہ)

(۱۵) قیصر روم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف خط لکھا کہ میرے باپ کے سر کو درد ہوتا ہے اسے آرام نہیں آ رہا آپ کے پاس کوئی دوا ہو تو بھیج دو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی طرف ایک ٹوپی بھیج دی جب وہ ٹوپی اپنے باپ کے سر پر رکھتا تو اسے آرام آ جاتا۔ اور جب ٹوپی اتار لیتا تو اسے پھر سر درد شروع ہو جاتا اسے بڑا تعجب لاحق ہوا :

" ففتش القلنسوۃ فاذا فیھا کاغذ مکتوب فیہ بسم اللہ الرحمن الرحیم "

(اس نے ٹوپی کی تفتیش کی تو دیکھا کہ اس میں ایک کاغذ ہے جس میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" لکھا ہوا ہے۔ (کبیر)

(۱۶) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" مَنْ تَوَضَّأَ وَلَمْ يُذْكَرِ اسْمَ اللهِ كَانَ طَهُوْرًا لِتِلْكَ الْاَعْضَاءِ وَمَنْ تَوَضَّأَ وَذُكِرَ اسْمَ اللهِ تَعَالٰى كَانَ طَهُوْرًا لِجَمِيْعِ بَدَنِهٖ "

جس شخص نے وضو کیا اور اللہ تعالیٰ کا نام اس میں ذکر نہ کیا تو اسے صرف وضو والے اعضاء کی پاکیزگی حاصل ہوگی۔ اور اگر وضو کرتے وقت کسی شخص نے اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر کر لیا۔ تو اس کے تمام بدن کو پاکیزگی حاصل ہو جائے گی۔

اے انسان ذرا غور کر، جب وضو کرتے وقت اللہ تعالیٰ کے نام کے ذکر سے تمام بدن کو پاکیزگی حاصل ہو جاتی ہے تو یقیناً جب تو خلوص قلب، صمیم قلب سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے گا تو تیرے دل کو بھی کفر اور بدعات سے پاکیزگی حاصل ہوگی۔ (کبیر)

(۱۷) ایک مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک قبر سے گزر ہوا آپ نے دیکھا کہ عذاب والے فرشتے اس میت کو عذاب دے رہے ہیں۔ پھر کہیں آپ کا اسی قبر سے گزر ہوا تو آپ نے دیکھا کہ رحمت کے فرشتے وہاں موجود ہیں نور کی شعائیں وہاں سے اٹھ رہی ہیں آپ نے بڑا تعجب کیا نماز پڑھی اللہ سے دعا کی کہ اے مولائے کائنات ماجرا کیا ہے پہلے اسے عذاب ہو رہا تھا اب اسے فیضانِ رحمت حاصل ہے رب تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی اور بتایا اے عیسیٰ! یہ شخص بڑا گنہگار تھا جب سے مرا ہے اس وقت سے عذاب میں مبتلا تھا لیکن جب یہ فوت ہوا تھا اس کی زوجہ حاملہ تھی اس کا ایک بچہ پیدا ہوا اس نے اس بچے کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بڑا ہو گیا اور اس نے ایک مکتب میں بچے کو چھوڑا جہاں معلم نے اسے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھایا "فاستحییت من عبدی ان اعذبہ بنار ای فی بطن الارض وولدہ یذکر اسمی علی وجہ الارض" مجھے حیا محسوس ہوئی کہ میں اپنے بندے کو آگ کا عذاب دوں زمین کے اندر، جس زمین کے اوپر اس کا بچہ میرا نام ذکر کر رہا ہے۔ (کبیر)

(۱۸) عمرہ فرغانیہ ایک عارفہ ولیہ کاملہ تھیں ان سے کسی نے سوال کیا کہ اس میں کیا حکمت ہے کہ جنبی اور حیض والی عورت کو قرآن پاک پڑھنے سے منع کیا گیا ہے لیکن "بسم اللہ" پڑھنے سے منع نہیں کیا گیا۔ انہوں نے بہت خوبصورت جواب دیا "لان التسمیۃ ذکر اسم الحبیب والحبیب لا یمنع من ذکر الحبیب" اس لئے کہ تسمیہ میں حبیب (اللہ تعالیٰ) کے نام کا ذکر ہے اور یہ قانون ہے کہ حبیب کو حبیب کے ذکر سے منع نہیں کیا جاتا۔

(۱۹) بسم اللہ میں رب تعالیٰ کا اسم گرامی "رحیم" مذکور ہے۔ رب تعالیٰ کی رحمت کاملہ کا ظہور چھ

مقاموں میں بہت واضح ہوگا۔قبر میں اور اس کے حشرات سے بچاؤ کے لئے ، قیامت اور اس کی تاریکیوں میں ، نامہ اعمال پڑھتے وقت اور اس وقت جو خوف طاری ہوگا ، پل صراط اور اس سے گزرنے کے خوف کے وقت ، جھنم کی آگ اور اس کے مقامات سے بچاؤ کیلئے ۔

(از کبیر)

(۲۰) ایک نیک ، بزرگ ، عارف شخص تھے ۔انہوں نے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" لکھ کر احباب کو دے دی اور وصیت کی کہ اسے میرے کفن میں رکھ دینا آپ سے پوچھا گیا اس کا تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟ انہوں نے کہا:

" اقول یوم القیمة الھی بعثت کتابا وجعلت عنوانه بسم اللہ الرحمن الرحیم فعاملی بعنوان کتابک "

میں قیامت کے دن عرض کروں گا اے میرے مولا تو نے ہمیں اپنی مقدس کتاب عطا فرمائی۔جس کا عنوان تو نے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کو بنایا۔لہذا اب میرے ساتھ اسی قسم کا معاملہ فرما جو تیری کتاب کے عنوان سے واضح ہو رہا ہے۔

اسی سے کفن پر بسم اللہ کلمہ شریف لکھنے کا ثبوت بھی مل گیا۔

(۲۱) "بسم اللہ الرحمن الرحیم" میں انیس حرف ہیں اس میں دو فائدے ہیں ۔ایک یہ کہ جہنم کے "زبانیه" فرشتے انیس کی تعداد میں ہیں جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا "علیھا تسعة عشر" جہنم پر محافظ فرشتے انیس مقرر ہیں "فاللہ تعالیٰ یدفع باسھم بھذہ الحروف التسعة عشر" اللہ تعالیٰ بسم اللہ کے انیس حروف کے تیروں سے ان زبانیہ کو دور فرما دے گا یعنی ان کی برکت سے ان سے محفوظ فرمائے گا۔

دوسرا فائدہ یہ ہے اللہ تعالیٰ نے دن رات میں چوبیس ساعتیں بنائی ہیں پھر پانچ نمازیں پانچ ساعتوں میں فرض کیں ان پانچ ساعتوں کے گناہوں کے لئے پانچ نمازوں کو کفارہ بنایا باقی انیس ساعتوں کے لئے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے انیس حرفوں کو کفارہ بنایا۔

(از کبیر جزء اول ص ۱۷۲)

(۲۲) دیلمی نے مسند فردوس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث بیان کی " ان المعلم اذا قال للصبی قل بسم اللہ الرحمن الرحیم فقال کتب للمعلم وللصبی لا بویہ براء ۃ من النار " (الدر المنثور جزء اول ص ۹)

کہ معلم جب بچے کو "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھاتا ہے تو اس معلم اور بچے اور بچے کے والدین کے لئے آگ سے بری ہونا لکھ دیا جاتا ہے۔

(۲۳) بیان کیا گیا ہے کہ فرعون نے خدائی کا دعویٰ کرنے سے پہلے ایک محل بنوایا اور حکم دیا کہ اس کے باہر والے دروازہ پر "بسم اللہ" لکھ دی جائے۔ جب اس نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ رب تعالیٰ نے اسے اپنا حکم پہنچانے کے لئے موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا آپ نے اسے دعوت حق دی لیکن اس پر کوئی بھلائی کا اثر نہ ہوا۔

موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے باری تعالیٰ میں نے اسے کتنی مرتبہ ایمان لانے کی دعوت دی لیکن مجھے اس میں کوئی بھلائی کی راہ نظر نہیں آئی۔

رب تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ:

" لَعَلَّکَ تُرِیْدُ اَهْلَکَهٗ ، اَنْتَ تَنْظُرُ اِلٰی کُفْرِهٖ وَاَنَااَنْظُرُ اِلٰی مَا کَتَبَهٗ عَلٰی بَابِهٖ "

تم چاہتے ہو کہ اسے ہلاک کر دیا جائے لیکن تم اس کے کفر کو دیکھ رہے ہو، میں اس کے دروازہ پر لکھی ہوئی "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کو دیکھ رہا ہوں۔

جس شخص نے اپنے خارجی دروازہ پر "بسم اللہ" کو لکھا تو وہ جب تک اس محل میں رہا ہلاکت سے محفوظ رہا تو وہ شخص جس نے اپنے سیاہ دل پر کفر اور کبائر سے تائب ہوتے ہوئے "بسم اللہ" کو لکھ دیا اس کا حال کیا ہوگا؟ یقیناً اس کے دل کو نورانیت حاصل ہوگی۔ (از کبیر)

(۲۴) رب تعالیٰ نے جب "بسم اللہ" میں اپنے نام "رحمن اور رحیم" ذکر فرمائے ہیں۔ تو یقیناً وہ اپنے ناموں کے مطابق بندوں سے سلوک فرمائے گا البتہ جب بندے بھی اس کے بندے **بنیں**۔

ایک مرتبہ ایک سائل ایک شخص کے گھر آیا جس گھر کا دروازہ بڑا بلند تھا سوال کیا اس نے معمولی سا عطیہ دے دیا۔ دوسرے دن وہ سوالی ایک کلہاڑا لے کر آ گیا دروازہ کو خراب کرنا شروع کر دیا اسے کہا گیا تو یہ کیا کر رہا ہے اس نے کہا "اما ان یجعل الباب لائقا بالعطیة او العطیة لائقة بالباب" اونچے دروازے والو یا دروازہ عطیہ کے مطابق کر دو یا عطیہ دروازہ کی شان کے مطابق کر دو۔

بلاتشبیہ وتمثیل جب ہمارے رب تعالیٰ کی رحمت کا ایک ذرہ ،لوگوں کی رحمت کے دریا پر بھی بھاری ہے تو اس کے حضور "بسم اللہ" پڑھنے والا گویا کہ عرض کر رہا ہوتا ہے اے مولائے کائنات جب تو نے اپنی مقدس کلام قرآن مجید کی ابتداء میں ہی اپنے بندوں کو اپنی صفات بتادی ہیں "فلا تجعلنا محرومین عن رحمتک وفضلک" تو ہمارے ساتھ ایسا سلوک نہ فرمانا جو ہمیں تیری رحمت اور تیرے فضل سے محروم کر دے۔ (از کبیر)

(۲۵) اکثر طور پر دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ بادشاہ کے غلام جب بھی کوئی مال ،گھوڑے ،خچر ،گدھے وغیرہ خریدتے ہیں تو ان پر خصوصی نشانات لگا دیتے ہیں کہ یہ شاہی گھوڑے وغیرہ ہیں۔ تاکہ ان کے دشمن یا چور وغیرہ ان پر ہاتھ نہ ڈالیں جب انسان بھی ہر وقت اپنے دشمن شیطان کے حملہ سے دوچار ہے تو اسے چاہیے کہ وہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھ کر اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی کو اپنے لئے نشان بنالے کہ میں رب تعالیٰ کا بندہ ہوں مجھ پر حملہ کرنے والے خبردار مجھے ایک عام انسان نہ سمجھنا۔ اس طرح وہ شیطان کے حملہ سے محفوظ رہے گا۔ (از کبیر)

رب تعالیٰ کی رحمت عظیمہ:

اللہ تعالیٰ کی رحمت اپنے بندوں پر کتنی ہی زیادہ ہے اس کا اندازہ لگانا بھی انسانی طاقت سے بالاتر ہے۔ آیئے دیکھئے کہ اگر کسی نے قرض دینا ہو تو وہ مدیون جب اسے شخص کو دور سے دیکھے جس کا اس نے قرض دینا ہوتا ہے تو وہ اس سے دور بھاگتا ہے کہ کہیں یہ مجھ سے قرض کا مطالبہ ہی نہ کر دے لیکن اللہ تعالیٰ وہ کریم ذات ہے کہ بندے اس کے مقروض ہیں جو اس کے حقوق کو کما حقہ ادا نہیں کر رہے گناہوں کا بوجھ بھی اپنے سروں پر اٹھائے ہوئے ہیں لیکن یوں کہیں کہ رب تعالیٰ کی طرف سے

آواز آتی ہے۔" لا تفروا منی ، بل اقول ففروا الی اللہ "اے میرے بندو میرے مقروضو مجھ سے دور نہ بھاگو، بلکہ میری طرف بھاگ کر آؤ۔میری رحمت کی پناہ لے لو " فانی انا الذی اقضی دیونکم واغفر ذنوبکم " میں تو وہ رحیم ہوں کہ جب تم میرے پاس آؤ گے مجھ سے فریاد کرو گے تو میں خود ہی تمہارے قرضے ادا کر دوں گا یعنی تمہارے قرضے معاف کر دوں گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دوں گا۔تم دنیا کے نظام کو دیکھتے ہو لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میری رحمت کے انداز کچھ اور ہی ہیں:

" ان الملوک یغلقون ابوابھم عن الفقراء دون الاغنیاء وانا افعل ضد ذلک "

بادشاہ غریبوں کو دیکھ کر اپنے دروازے بند کر لیتے ہیں امیروں کے لئے اپنے دروازے کھلے رکھتے ہیں۔لیکن میں غریبوں ،فقیروں کے لئے دروازے کھلے رکھتا ہوں۔ان کو ہی اپنا قرب عطا کرتا ہوں وہی اللہ والے کہلاتے ہیں۔

وہ امیر وہ اغنیاء جو میرے حقوق نہیں ادا کرتے ،فقیروں کی حاجت مندی کا خیال نہیں کرتے اپنے مال ودولت کی وجہ سے اتراتے ہیں میں ان کے لئے اپنے دروازے بند کر لیتا ہوں ان کو مجھ سے دوری حاصل رہتی ہے۔ (از کبیر جزء اول ص ۱۶۲)

قیامت کے دن رب تعالیٰ کی رحمت بہت زیادہ ہوگی:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

" ان اللہ تعالیٰ مائۃ رحمۃ انزل منھا رحمۃ واحدۃ بین الجن والانس والطیر والبھائم والھوام فیھا یتعاطفون ویتراحمون واخر تسعۃ وتسعین رحمۃ یرحم بھا عبادہ یوم القیامۃ "

بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنی سو رحمتوں میں سے صرف ایک رحمت دنیا والوں کو عطا کی ہے اسی کی وجہ سے جن ،انسان ،پرندے ،چوپائے اور کیڑے مکوڑے ایک دوسرے پر مہربانی کرتے ہیں اور رحم کرتے ہیں اور ننانوے رحمتیں رب تعالیٰ اپنے بندوں پر قیامت کو فرمائے گا۔

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے صرف سمجھانے کے لئے یہ ارشاد فرمایا ہے یعنی بات مثال کے طور پر یہ ہے کہ یوں سمجھیں گویا کہ ایک سو میں ایک رحمت دنیا والوں کو حاصل ہے " والافبحار الرحمة غیر متناهية " ورنہ رب تعالیٰ کی رحمت کے دریا لا محدود ہیں ان کی کوئی حد نہیں اور نہ ہی کوئی شمار ہے۔ (از کبیر)

قیامت میں گناہگاروں سے کلام:

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" ان اللہ عزوجل یقول یوم القیامة للمذنبین هل احببتم تعالیٰ ، فیقولون نعم أی رب فیقول اللہ تعالیٰ ولم ؟ فیقولون رجونا عفوک وفضلک ، فیقول اللہ تعالیٰ ان قد اوجبت لکم مغفرتی "

" بے شک اللہ تعالیٰ قیامت کے دن گناہگاروں سے فرمائے گا کیا تم میرے ساتھ ملاقات کرنا پسند کرتے ہو وہ عرض کریں گے ہاں اے اللہ تعالیٰ (ہم تجھ سے ملنے کو محبوب سمجھتے ہیں) رب تعالیٰ فرمائے گا کیوں؟ وہ کہیں گے ہم تیری طرف سے معافی اور تیرے فضل کی امید کرتے ہیں رب تعالیٰ ارشاد فرمائے گا بے شک میں نے تمہارے لئے مغفرت کو لازم کر دیا"۔

بچے پر ماں اتنا رحم نہیں کرتی جتنا اللہ تعالیٰ بندوں پر رحم کرتا ہے:

ایک جنگ میں ایک بچہ شدید گرمی کی وجہ سے بے قرار تھا۔ ندا دی جا رہی تھی کہ کون اسے شدید گرمی سے بچائے اور اس پر رحم کرے۔ ایک عورت نے دیکھا وہ بچے کے پاس آئی اسے پکڑا، اور اپنے پیٹ کے ساتھ اسے لگایا پھر خود گرم سنگریزوں والی زمین پر لیٹ گئی بچے کو شدید گرمی سے بچانے کے لئے اپنے سینے پر بٹھایا اور کہہ رہی تھی "ابنی ، ابنی " یہ میرا بیٹا ہے یہ میرا بیٹا ہے۔

لوگوں نے جب یہ ماجرا دیکھا تو ان کی آنکھوں میں آنسو جاری ہو گئے، ماں کی ممتا پر تعجب کرتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے یہ دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا:

" اعجبتم من رحمة هذه بابنها فان الله تعالیٰ ارحم بکم جمیعا من هذه المرأة بابنها "

کیا تم اس پر تعجب کرتے ہو کہ یہ اپنے بیٹے پر اتنی زیادہ رحیم ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ تم تمام پر اس سے بھی زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ (از کبیر)

رحمٰن ورحیم سے متعلق عجیب بحث:

تمام اشیاء کی چار قسمیں ہیں:

(۱) وہ جو نفع مند ہوں اور ضروری بھی۔ (۲) وہ جو نفع مند ہوں اور ضروری نہ ہوں۔

(۳) وہ جو ضروری ہوں نفع مند نہ ہوں۔ (۴) نفع مند نہ ہوں اور ضروری بھی نہ ہوں۔

پہلی قسم: وہ جو نفع مند ہو اور ضروری بھی ہوں۔ ان کی پھر دو قسمیں ہیں کیونکہ ان کا تعلق یا دنیا سے ہوگا یا آخرت سے۔ جب دنیا میں اس کا ہونا ضروری ہو اور نفع مند بھی، اس کی مثال سانس ہے، کیونکہ سانس ایک لحظہ بھی منقطع ہو جائے۔ تو موت واقع ہو جائے۔ وہ جس کا تعلق آخرت سے ہے اس کی مثال اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے اس لئے کہ اگر دل سے ایک لحظہ بھی زائل ہو جائے تو دل مردہ ہو جاے اور دائمی عذاب کا مستحق ہو جائے۔

دوسری قسم: وہ جو نفع مند ہوں لیکن ضروری نہ ہوں۔ جیسا کہ دنیا میں مال اور تمام دنیاوی علوم وغیرہ۔

تیسری قسم: وہ چیزیں جو ضروری ہوں لیکن نفع مند نہ ہوں یہ وہ تمام چیزیں ہیں جن کو ہم بظاہر نقصان دہ، ضرر انداز سمجھتے ہیں جس طرح بیماریاں، موت، غربت، بڑھاپا۔

لیکن خیال رہے کہ اس قسم کا تعلق آخرت سے نہیں اس لئے کہ آخرت میں جن چیزوں میں منافع پائے جاتے ہیں ان میں ضرر کے پائے جانے کا کوئی احتمال نہیں یہی چیزیں جن کا ذکر کیا ہے آخرت میں یہی نفع مند ہیں۔

چوتھی قسم: وہ جو نفع مند نہ ہوں اور ضروری بھی نہ ہوں جیسے دنیا میں فقر اور آخرت میں عذاب۔ ان میں کوئی نفع نہیں اور ان کا پایا جانا ضروری بھی نہیں۔

تنبیہ : فقر تیسری قسم اور چوتھی قسم کی مثال دی ہے اس لئے کہ مطلقاً فقر ضروری ہے کیونکہ کوئی نہ کوئی تو فقیر ہونا ہی ہے لیکن ہر شخص کا فقیر ہونا ضروری بھی نہیں اب دونوں قسموں کی مثال بنانا واضح ہوگیا۔

اس تمہید کے بعد جو ابھی تک چار قسموں کی صورت میں پیش کی ہیں اس سے جب یہ واضح ہو چکا ہے کہ سانس ضروری ہے اور نفع مند بھی کیونکہ اگر ایک لحظہ سانس منقطع ہو جائے تو موت واقع ہو جائے۔ اسی طرح یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت آخرت میں ضروری اور نفع مند ہے کیونکہ اگر ایک لحظہ دل سے زائل ہو جائے تو دل مردہ ہو جائے۔

اسی سے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ سانس منقطع ہونے سے جو موت واقع ہوتی ہے وہ آسان ہے کیونکہ اسی میں تکلیف ایک معمولی وقت کے لئے ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی معرفت کے زوال سے دل پر آنے والی موت بہت مشکل ہے اس لئے کہ اس کا درد ہمیشہ کے لئے باقی رہے گا۔

سانس کے اثرات : سانس کے دو اثر ہیں۔ ایک یہ کہ اچھی، پاکیزہ، خوشگوار ہوا انسان کے اندر داخل ہوتی ہے اور دل تک پہنچتی ہے جس کی وجہ سے دل معتدل اور سلامتی میں رہتا ہے۔

سانس کا دوسرا اثر یہ ہے کہ فاسد گرم اور جلا دینے والی ہوا دل سے باہر نکالی جاتی ہے۔

فکر کے اثرات: سانس کی طرح فکر کے بھی دو اثر ہیں ایک یہ کہ حجت و برھان (دلائل یقینیہ) کی بادِ نسیم کا دل تک پہنچانا جس کی وجہ سے ایمان اور معرفت میں اعتدال برقرار رہے۔

فکر کا دوسرا اثر یہ ہے کہ شکوک وشبہات کی وجہ سے پیدا ہونے والی ہوا کو دل سے نکالنا تاکہ یہ دل کو برباد نہ کر دے۔

<u>ان کے بعد یہ جاننا ضروری ہے:</u> ان تمام امور کے جاننے کے بعد انسان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ یہ جانے کہ یہ تمام محسوسات اپنی مقدار میں متناہی (ایک حد پر ختم ہونے والی) ہیں اور وجود کے بعد آخر میں ان پر فنا نے بھی واقع ہونا ہے جو شخص ان حالات پر مطلع ہو گیا وہ آفات سے امن میں باقی رہے گا اور بھلائی اور خوشی کو حاصل کر لے گا۔

حصولِ کمال کب؟ اتنا علم حاصل ہونے کے باوجود اس وقت تک کمال حاصل نہیں ہوگا جب تک اے انسان تیری عقل پر یہ بات منکشف نہ ہوجائے اور تجھے یہ پتہ نہ چل پائے:

" کل ما وجدته ووصلت اليه فهو قطرة من بحار رحمة الله وذرة من انوار احسانه فعند هذا ينفتح علي قلبک معرفة کون الله تعالیٰ رحمانا رحيما "

'' کہ تجھے جو بھی حاصل ہوا جس مقام تک تو پہنچا وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بے حد سمندروں میں سے ایک قطرہ ہے اور اس کے احسانوں کے انوار میں سے ایک ذرہ ہے ۔جب تجھے یہ علم حاصل ہوجائے گا تو تیرے دل پر معرفت کے دروازے کھل جائیں گے۔اور تجھے پتہ چل جائے گا کہ اللہ تعالیٰ رحمٰن ورحیم ہے''۔(از کبیر جز،اول ص ۱۶۴)

عجیب سے عجیب تر بحث: اے انسان اگر تو رب تعالیٰ کے رحمٰن ورحیم ہونے کو پہچانا چاہتا ہے تو یہ سمجھ لے کہ تو ایک ایسا جوہر ہے جو مرکب ہے نفس،بدن،روح اور جسم سے۔ تیرا نفس ابتدائی طور پر جاہل تھا کچھ نہیں جانتا تھا جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاللهُ اَخرَجَكُمْ مِن بُطُوْنِ اُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعلَمُوْنَ شَيْأً وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشكُرُوْنَ ﴾ پ ۱۴ آیت ۷۸

'' اور اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے پیدا کیا۔کہ تم کچھ نہ جانتے تھے ۔اور تمہیں کان اور آنکھ اور دل دیئے کہ تم احسان مانو ''

پھر اے انسان آہستہ آہستہ تو حساس قوتوں کے مراتب میں سوچ کرنے سے اور قوت محرکہ کے مراتب میں فکر کرنے سے اور قوت مدرکہ کے مراتب میں تأمل کرنے سے اور قوت عاقلہ کے مراتب میں غور وفکر سے کچھ سمجھ حاصل کرتا ہے پھر عقل سے سمجھ میں آنے والی اشیاء اور ان کی جہات میں غور وفکر سے کچھ ادراک حاصل کرتا ہے۔

لیکن یہ بات تو اچھی طرح سمجھ لے کہ ان چیزوں کی کوئی انتہاء نہیں۔اس لئے کہ اگر کوئی عقل مند شخص معقولات کے علم کو حاصل کرنا شروع کر دے اور اس کے حصول میں بجلی کی تیز رفتاری کی طرح کام کرے اور تیز آندھی کی طرح،تیزی دکھائے پھر بھی وہ اس تگ ودو میں ہمیشہ ہی رہے گا کسی حد کو

نہیں چھو سکے گا کیونکہ ساری عمر کی محنت اور تیزی پھرتیلا پن، اور طوفانی رفتار سے حصول کے باوجود ایک معمولی سا علم اور معرفت کا حصہ پاسکے گا۔ اس لئے کہ معلومات غیر متناھیہ (بے حد) ہیں ان تک پہنچنا ممکن نہیں۔ متناہی (ایک حد تک) درجہ کا حاصل ہونے والا علم غیر متناہی (لامحدود) کے مقابل قلیل ہی قلیل ہے۔ اے انسان جب تجھے یہ سمجھ آجائے گی تو تیرے سامنے، اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلاً﴾ (تمہیں علم نہیں دیا گیا مگر تھوڑا) کی حقانیت وصداقت جگمگانے لگے گی۔

تیرا بدن چار چیزوں سے مرکب ہے "آگ، مٹی، پانی، ہوا" ہر ایک تاثیر میں مختلف ہے آگ کو حرارت (گرمی) حاصل ہے مٹی کو یبوست (خشکی) حاصل ہے۔ پانی کو رطوبت (تری، نمی) حاصل ہے ہوا کو برودت حاصل ہے۔

جب تجھے یہ معلوم ہوجائے کہ تیرے اعضاء میں کیا منافع پائے جاتے ہیں اور کیا آثار ان میں مرتب ہوتے ہیں تو تمہیں رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ (اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو، تو شمار نہیں کرسکو گے) کا مطلب روز روشن کی طرح سمجھ آجائیگا۔

" وحینئذ ینجلی لک اثر من آثار کمال رحمته فی خلقک وھدایتک ،فتفھم شیأ قلیلا من قوله الرحمن الرحیم " (الکبیر)

اب تم پر یہ بھی واضح ہوجائے گا کہ اس کی رحمت کے آثار تمہارے اخلاق اور ھدایت میں کیسے کیسے پائے جاتے ہیں۔

رب تعالیٰ رحیم ہے اور بندے بھی رحیم ہیں فرق کیا ہے؟

" قلنا الحق ان الرحمة لیست الا لله ثم بتقدیر ان تکون لغیر الله رحمة الا ان رحمة اکمل من رحمة غیرہ "

حق یہ ہے کہ رحمت صرف رب تعالیٰ کو ہی حاصل ہے، یعنی وہی حقیقی رحمت ہے، وہی کامل رحمت ہے، وہی رحمت وہ رحمت ہے جو کسی سے نہیں حاصل ہوئی۔ اگر بالفرض یہ تسلیم کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر اوروں کو بھی رحمت حاصل ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی عطا سے حاصل ہوگی رب تعالیٰ کی رحمت کی مقابل ناقص ہوگی۔ پہلی بات پر دلائل ملاحظہ فرمائیں کہ رحمت رب تعالیٰ کو ہی حاصل ہے:

(۱) بیشک اللہ تعالیٰ کا جود بغیر کسی بدلہ کے پایا جاتا ہے۔اور بندوں کی سخاوت میں بدلہ پیش نظر ہوتا ہے ۔بدلہ کی کئی صورتیں ہیں۔

ایک جسمانی اور دوسری روحانی۔ جسمانی جس طرح کسی کو روپے دیئے کہ یہ مجھے کپڑا دے گا۔ روحانی میں پھر مختلف وجوہ پائی جاتی ہیں:

ایک یہ کہ اس لئے مال دیا جائے کہ یہ میری خدمت کرے گا ۔دوسری وجہ یہ ہے کہ مال دیا جائے کہ اس سے تعاون حاصل ہوگا۔تیسری وجہ یہ ہے کہ اس لئے مال عطا کیا جائے کہ یہ میری اچھی تعریف کرے گا ۔چوتھی وجہ یہ ہے کہ اس لئے کسی کو مال دیا جائے کہ اس میں مجھے بہت بڑا ثواب حاصل ہوگا۔پانچویں وجہ مال دے کر عوض حاصل کرنے کی یہ ہے کہ انسان چاہتا یہ ہے میں کسی کو مال عطا کروں تا کہ میرے دل سے مال کی محبت جاتی رہے اور مجھے محبت مال کی دوری سے رب تعالیٰ کا قرب حاصل ہوجائے ۔چھٹی وجہ یہ ہے کہ انسان کبھی مال اس لئے دیتا ہے کہ میری رقت جنسیہ زائل ہوجائے کیونکہ انسان کبھی کمزور دل ہوتا ہے کہ مال خرچ کرنے سے اس کا دل تھوڑا ہوتا ہے اس کے زوال کے لئے وہ مال خرچ کرتا ہے۔

یہ تمام قسمیں روحانی عوض کی ہیں جو ابھی تک بیان کی ہیں۔لہذا اس بحث سے واضح ہوا کہ انسان اس لئے عطا کرتا ہے کہ اسے اس عطا کے ذریعے کوئی نہ کوئی کمال حاصل ہوجائے " **فیکون ذلک فی الحقیقة معاوضة ولایکون جودا ولاھبة ولا عطیة** "اس قسم کی عطا کو حقیقت میں معاوضہ کہا جائے گا نہ یہ جود ہے اور نہ ہی ھبہ اور نہ ہی عطیہ۔

" اما الحق سبحانه وتعالی فانه کامل لذاته فیستحیل ان یعطی لیستفید به کمالا ،فکان الجواد المطلق والراحم المطلق ھو اللہ تعالیٰ "

لیکن اللہ تعالیٰ کامل لذاتہ ہے اس کے لئے محال ہے کہ وہ اس لئے کوئی چیز عطا کرے کہ اس کے ذریعے وہ کمال حاصل کرے رب تعالیٰ جواد مطلق ہے اور راحم مطلق ہے یعنی اس کا جود اور اس کی رحمت بلاغرض اور بلاعوض ہے ۔لہذا حقیقت میں رحمت کاملہ اسے ہی حاصل ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کے بغیر ساری کائنات اپنے وجود میں رب تعالیٰ کی محتاج ہے ۔یعنی رب تعالیٰ نے

کائنات کو پیدا کیا۔اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جب تک کسی کو وجود وحیات ہی حاصل نہ ہواس نے کسی پر رحم کیسے کرنا ہے،اور جب وجود حاصل ہونا ہے تو رب تعالیٰ کی عطاء سے، یقیناً انسان کا کسی پر رحم کرنا دراصل رب تعالیٰ کی عطا سے ہے اس لئے واضح ہوا کہ حقیقت میں رحم کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

(۳) انسان کبھی کوئی کام کرتا ہے اور کبھی چھوڑتا ہے جب انسان کسی کام کے کرنے کو چھوڑنے پر ترجیح دیتا ہے تو اس کے دل میں کام کرنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے وہ اس کام کو ترجیح دیتا ہے جب تک اس کے دل میں کام کرنے کی تمنا نہ ہو تو وہ کسی پر رحم بھی نہیں کرسکتا۔اور جب اس کے دل میں کسی کی مجبوری اور پریشان حالی کو دیکھ کر یا رشتہ داری وقربت کو دیکھ کر رحم کرنے کی خواہش پیدا ہوگی تو وہ رحم کرے گا۔دل میں کسی پر رحم کرنے کی تمنا پیدا کرنا اور اس کے لئے اسباب پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کا ہی کام ہے کیونکہ سب چیزوں کا وہی خالق ہے:

"وماذاک الاالله تعالیٰ فیکون الراحم فی الحقیة هو الله تعالیٰ"

جب رحم کرنے کی طاقت اسباب اور خواہش اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی اور سے حاصل نہیں تو حقیقت میں رحم کرنے والا بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

(۴) اگر کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں شخص نے گندم بطور عطیہ دے دی لیکن اس وقت تک اس سے نفع حاصل کرنا ممکن نہیں جب تک معدہ کا نظام ہضم درست نہ ہو۔اس کا یہ کہنا کافی نہیں۔

اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں شخص نے باغ تو بطور عطیہ دے دیا ہے لیکن اس باغ کو لہلہاتے ہوئے پھولوں سے اس وقت تک دل کو خوش نہیں کیا جاسکتا جب تک نظر درست نہ ہو یہ کہنا بھی کافی نہیں۔بلکہ حق یہ ہے کہ یوں کہا جائے کھیتوں اور باغوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے ان کو آفات وبلیات سے بچانا صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔گندم سے اور باغ سے نفع اسی وقت حاصل کیا جاسکے گا جب اللہ تعالیٰ چاہے گا۔نظام ہضم کو درست ہونے کے باوجود آنکھوں کی بینائی صحیح وسلامت ہونے کے باوجود اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت نہ ہوئی تو انسان نفع نہیں حاصل کر سکے گا "فوجب ان یقال المنعم والراحم فی الحقیقة هو الله تعالیٰ" پس ضروری ہے کہ یہ کہا جائے کہ حقیقی طور منعم اور رحم کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر تسلیم کر لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر اس کی مخلوق بھی رحم کرتی ہے تو یہ کہنا پڑے گا" ان رحمة الله اکمل و اعظم " ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی کامل اور عظیم تر ہے۔

اس کی بھی چند وجوہ ہیں:

(۱) یہ بات کسی صاحب عقل پر پوشیدہ نہیں کہ انعام عطا کرنے والے کی شان بلند ہوتی ہے اور جسے انعام دیا جائے اس کی شان گھٹیا ہوتی ہے اور اسے منعم یعنی انعام دینے والے کے سامنے عاجز ہونا پڑتا ہے۔اسی سے یہ واضح ہوا کہ " فاذا حصل التواضع بالنسبة الی حضرة الله فذاک خیر من حصول هذه الحالة بالنسبة الی بعض الخلق "انسان کو چاہئے کہ وہ مخلوق کے سامنے عاجز ہونے کے بجائے رب تعالیٰ کی تواضع کرے یہی اس کے لئے بہتر ہے۔ (از کبیر)

یہ تو ہر ذی شعور انسان سمجھ سکتا ہے کہ کہاں انسان کے سامنے عجز وانکساری اور کہاں رب کائنات کے حضور اپنے عجز وانکساری کو پیش کرنا۔پتہ چلا کہ بندے سے رحمت کا حصول پست مقام رکھتا ہے اور رب تعالیٰ سے رحمت کا حصول علو مرتبت کا سبب ہے۔

(۲) اے انسان ایک اور خیال تو کر اللہ تعالیٰ جب تجھے دنیا میں نعمتوں سے نوازتا ہے تو تم سے ایسے اعمال کا مطالبہ کرتا ہے جو تمہیں اخروی نعمتوں کے حاصل ہونے کا مستحق بنا دیتے ہیں۔اور اللہ تعالیٰ کے بغیر جب کوئی اور رحم کرے گا تو وہ تمہیں حکم دے گا کہ تم میری خدمت میں مشغول رہو۔اور میرے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ہی اپنا وقت صرف کرو۔

" ولاشک ان الحالة الاولی افضل "

''یقینی بات ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی افضل اور اعلیٰ ہے''۔

(۳) جس پر انعام کیا جائے اور رحم کیا جائے وہ انعام کرنے والے کا اپنے آپ کو غلام سمجھتا ہے ''وعبودیة الله اولی من عبودیة غیر الله ''اللہ تعالیٰ کی غلامیت ہی مخلوق کی غلامیت سے بہتر ہے پتہ چلا کہ رحمت باری تعالیٰ کو ہی مخلوق کی رحمت پر برتری حاصل ہے وہی اعلیٰ اور اکمل ہے۔

(۴) بادشاہ جب تم پر انعام کرتا ہے تو وہ تمہارے حالات کی تفاصیل سے بے خبر ہوتا ہے بعض

اوقات تمہیں ایسے انعام سے نوازتا ہے جس کی تمہیں ضرورت نہیں ہوتی ۔اور جس چیز کی تمہیں ضرورت ہے وہ تمہیں نہیں عطا کرتا۔اور وہ تمہاری امداد تمام اوقات میں کرنے کی طاقت ہی نہیں رکھتا اور تمہاری تمام مرادیں پوری نہیں کرسکتا لیکن اللہ تعالیٰ تمام معلومات کو جانتا ہے تمام ممکنات پر قادر ہے تمہاری ہر حاجت کو جانتا ہے۔جب تمہیں کوئی حاجت درپیش آئے وہ اسے جانتا ہے اگر تم اس سے کسی چیز کا مطالبہ کرو تو وہ عطا کرنے پر قادر ہے یقیناً اس کی رحمت افضل ہے۔ (از کبیر)

(۵) جس شخص سے انعام حاصل ہو،انسان اس کا احسان مند ہوتا ہے۔خواہ وہ احسان جتلائے یا نہ جتلائے "وقبول المنة من الحق افضل من قبولها من الخلق" اللہ تعالیٰ کے احسان کو قبول کرنا اور اسی کا احسان مند ہونا ہی افضل ہے بنسبت مخلوق کے احسان کو قبول کرنے سے۔ (کبیر)

علامہ رازی رحمہ اللہ کی فیصلہ کن بات:

" فثبت بما ذکر نا ان الرحمن الرحیم ھو اللہ تعالیٰ وبتقدیر ان یحصل رحمن آخر رحمة اللہ تعالیٰ اکمل وافضل واعلی واجل واللہ اعلم "

ابھی تک جو ہم نے ذکر کیا ہے اس سے یہ ثابت ہوا کہ رحمٰن اور رحیم اللہ تعالیٰ ہی ہے۔اور اگر مخلوق میں سے کسی کی رحمت کو مانا جائے تو یقیناً اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی اکمل اور افضل اور اعلی اور اجل (بزرگ تر) ہے۔ (از کبیر جز اول ص ۱۶۷)

تنبیہ: یہ بات ذہن میں رکھی جائے تا کہ دوبارہ نہ لوٹائی جائے کہ رحمت کی نسبت جب بندوں کی طرف کریں تو وہ رحمت رب تعالیٰ کی عطا سے ہوگی رب تعالیٰ کی رحمت کے مقابل ناقص ہوگی غیر حقیقی ہوگی۔اور جب رحمت کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف کریں تو وہ حقیقی ہوگی، اعلیٰ ہوگی،ذاتی ہوگی، عظیم تر ہوگی۔﴿ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ﴾ کی بحث میں بھی یہی نکتہ ذہن میں ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے استعانت حقیقی ہے اور غیروں سے غیر حقیقی اللہ تعالیٰ کی معاونت ذاتی ہے باقیوں کی اس کی عطاء سے ہے۔

مسائل: سورۃ نمل میں جو بسم اللہ شریف ہے ﴿ اِنَّهٗ مِنْ سُلَیْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴾ میں یہ مکمل آیت نہیں بلکہ آیت کا حصہ ہے اس میں سب کا اتفاق ہے کہ یہ آیت کی جزء ہے اور قرآن پاک کا حصہ ہے لیکن وہ "بسم اللہ" جو سورتوں کے اول میں ہے اس میں اگرچہ کئی

اقوال ہیں صحیح قول یہ ہے کہ وہ بھی قرآن پاک کی آیت ہے لیکن ہر سورۃ میں نہیں بلکہ تمام سورتوں میں سے ایک سورۃ کا حصہ ہے کوئی سورۃ معین نہیں۔ کسی ایک سورۃ میں بھی حصہ سمجھ لیں تو درست ہے دوسری سورتوں میں صرف فرق کرنے کے لئے ہے کہ معلوم ہو جائے ایک سورۃ ختم ہوگئی دوسری شروع ہو رہی ہے۔ (از قمر الاقمار حاشیہ نور الانوار)

مسئلہ: امام جب بلند آواز سے قراءت کرے تو تعوذ اور تسمیہ آہستہ آواز میں پڑھے اس مسئلہ پر کئی احادیث مبارکہ شاہد ہیں تاہم صحاح ستہ سے کچھ حدیثیں نقل کی جارہی ہیں۔

☆ " عن انس ان النبی ﷺ وابابکر وعمر کانوا یفتتحون الصلوٰة بالحمد لله رب العلمین (رواه الشیخان) وزاد مسلم لایذکرون بسم الله الرحمن الرحیم فی اول قراء ة ولا فی اخرها " (بخاری باب ما یقرأ بعد التکبیر، مسلم باب حجة من قال لایجهر بالبسملة)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نماز الحمد لله رب العلمین سے شروع فرماتے تھے مسلم کی روایت میں یہ بھی مزید ذکر ہے کہ (یہ تینوں حضرات) بسم الله الرحمن الرحیم قراءت کے اول میں اور آخر میں نہیں پڑھتے تھے۔ مراد یہی ہے کہ بلند آواز سے نہیں پڑھتے تھے۔ جیسا کہ دوسری حدیثوں میں واضح طور پر ذکر ہے۔

☆ " وعنه قال صلیت مع رسول الله صلی الله علیه وسلم وابی بکر وعمر وعثمان رضی الله عنهم فلم اسمع احدا منهم یقرأ بسم الله الرحمن الرحیم " (مسلم باب مذکور)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر اور عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ نماز ادا کی میں نے ان میں سے کسی ایک سے بسم الله الرحمن الرحیم پڑھتے ہوئے نہیں سنا۔

☆ " وعنه قال صلیت خلف رسول الله ﷺ وابی بکر وعمر وعثمان رضی الله عنهم فلم اسمع احدا منهم یجهر بسم الله الرحمن الرحیم "

(نسائی باب ترک الجهر بسم الله الرحمن الرحیم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز ادا کی اور ابوبکر اور عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز ادا کی کسی ایک کو بھی بسم الله الرحمن الرحیم بلند آواز سے پڑھتے ہوئے نہیں سنا۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کی بحث دینی طلباء کے ذوق کے لئے:

جس طرح پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں اہل علم سرگرداں ہیں۔کما حقہ اس کی معرفت کسی کو بھی حاصل نہ ہوئی آخری فیصلہ یہی ہوا کہ وہ ذات پاک ”برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم“ خیال، قیاس، گمان اور وہم سے بالاتر ہے۔ادراک کے تمام مدارج سے ماوراء ہے۔

اسی طرح اس کے اسم گرامی میں بھی اہل علم نے اپنے اپنے علم کے گھوڑے دوڑائے اتفاقی طور پر ایک منزل حاصل نہ ہوسکی ذاتی نام اسم جامد بھی کہا گیا۔مشتق ہوکر بھی ذاتی نام کا قول کیا گیا۔مشتق مانتے ہوئے صفاتی نام کہا گیا پھر کس لفظ سے مشتق ہے مختلف قول ہیں یعنی لفظ اللہ میں بھی اھل علم سرگرداں رہے تمام نے باہم اتفاق کرتے ہوئے کوئی فیصلہ نہ کیا۔اسی طرح رب تعالیٰ کی صفات میں یہی صورت حال ہے:

" ولصعوبة هذا المقام ذهب المعتزلة والفلاسفة الى نفى الصفات والكرامية الى نفى قدمها والاشاعرة الى نفى عينيتها وغيريتها " (شرح عقائد)

اللہ تعالیٰ کی صفات کی بحث کا مقام مشکل ہونے کی وجہ سے معتزلہ اور فلاسفہ نے اس کی صفات کا ہی انکار کیا ہے۔اور کرامیہ فرقہ نے رب تعالیٰ کی صفات کے قدیم ہونے کا انکار کیا ہے اور اشاعرہ نے صفات کی عینیت اور غیریت کی نفی کی ہے۔

اہل حق کا مذہب رب تعالیٰ کی صفات میں یہ ہے "وھی لا ھو ولا غیرہ" یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات نہ عین ذات ہیں اور نہ ہی ذات کا غیر ہیں۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات قدیم ہیں اگر ان کو ذات کا غیر مانا جائے تو لازم یہ آئے گا کہ رب تعالیٰ کے غیر کو قدیم ہونے کا مقام حاصل ہوجائے یہ بھی درست نہیں اور اگر صفات باری تعالیٰ کو عین ذات مانا جائے تو کثیر قدماء تسلیم کرنے پڑیں گے۔حالانکہ ایک ہی ذات پاک قدیم ہے۔جب رب تعالیٰ کی صفات کو نہ ذات کا عین تسلیم کیا اور نہ ہی غیر تو یہ دونوں در پیش آنی والی مشکلات حل ہوگئیں "فلایلزم قدم الغیر ولا تکثر القدماء" نہ غیر کا قدیم ہونا لازم آئے گا اور نہ قدماء میں تکثر۔

نصاری کا باطل قول:

نصاری تین اقنوم مانتے ہیں اقنوم یونانی اور رومی زبان میں بمعنی ''اصل'' آتا ہے۔ وہ ایک اقنوم کو وجود اور دوسرے کو علم اور تیسرے کو حیوۃ (حیات) کہتے ہیں۔ان کے گمان میں رب تعالیٰ کی ذات مقدسہ یہی تین صفات ہی ہیں۔ وہ ان کو اقانیم ثلاثہ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ تین ہی ان کے نزدیک اصل الموجودات ہیں۔ پھر وہ وجود کو اب (باپ) اور علم کو ابن (بیٹا) اور حیوۃ کو روح القدس کہتے ہیں۔ پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اقنومِ علم عیسیٰ علیہ السلام کے بدن کی طرف منتقل ہوگیا ہے۔

ان کا مذہب باطل ہی اس لئے ہے کہ وہ تکثر قدماء کے گویا کہ قائل ہیں۔ اور رب تعالیٰ کی صفات کے انتقال اور ذات باری سے جدا ہونے ختم ہونے کے قائل ہیں۔ یہ سب لغویات ہیں۔ اگر کسی نے نصاری کے باطل اقوال کا تفصیلی مطالعہ کرنا ہو تو راقم کی کتاب تذکرۃ الانبیاء کا مطالعہ کرے۔

معتزلہ کا عجیب انداز پر بھٹکنا:

معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم تو ہے لیکن اسے صفت علم حاصل نہیں، قادر ہے لیکن صفت قدرت اسے حاصل نہیں، سمیع ہے لیکن صفت سمع حاصل نہیں، وغیر ذلک۔

لیکن یہ ان کا کہنا غلط ہے اتنی واضح بات ہے کہ صفت کے بغیر موصوف کو موصوف ہونے کا مقام کیسے مل سکتا ہے۔ ہم روز مرہ مشاہدات سے یہ حاصل کر سکتے ہیں کہ بغیر سواد کے اسود کا پایا جانا ممکن نہیں۔

رب تعالیٰ نے بھی اپنی صفات کا ذکر فرمایا مثال کے طور پر دیکھیں کہ ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے ''ان اللہ علیم قدیر'' بیشک اللہ تعالیٰ علیم وقدیر ہے۔ یقینی بات ہے کہ بغیر علم اور قدرت کے علیم وقدیر کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق کچھ تفصیل:

<u>صفات ازلیہ یا صفات حقیقیہ یہ ہیں:</u> علم، قدرۃ، حیوۃ، قوۃ، سمع، بصر، ارادہ ومشیت۔

ان صفات حقیقیہ میں سے صرف ایک صفت "**حیوۃ**" وہ صفت ہے جس میں اضافت ونسبت نہیں۔اور باقی صفات میں اضافت ونسبت کا اعتبار پایا گیا ہے۔مثال کے طور پر "**علم**" ہے یہ ایسی صفت ہے کہ اس کا معلوم کے ساتھ تعلق لازم ہے اسی طرح "**قدرۃ**" وہ صفت ہے جس کا تعلق ایجاد مقدور سے لازم ہے۔

"**فهذه الصفات وان كانت حقيقية الا انه يلزمها لوازم من باب النسبة والاضافات**"

یہ صفات اگرچہ حقیقیہ ہیں مگر ان کو اضافت ونسبت قیاس کیا جائے۔

صفات اضافیہ کی چند قسمیں ہیں:

(۱) اس کا معلوم ومذکور ہونا جس طرح مسبح ممجد (مفعول) جس طرح کہا جاتا ہے "**یا ایها المسبح بكل لسان یا ایها الممدوح عند كل انسان یا ایها المرجوع الیه فی كل حین واوان**" اے ہر زبان سے تسبیح بیان کی ہوئی ذات، اے ہر انسان کے ممدوح؛ اے وہ ذات کہ ہر وقت میں تیری طرف ہی رجوع کیا جاتا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا فاعل ہونا افعال کے لئے یہ صفت اضافیہ محضہ ہے۔لیکن یہ اس وقت ہوگا جب تکوین کو صفت زائدہ نہ تسلیم کیا جائے۔اب اس تمہید کے بعد یہ بات سمجھی جائے کہ جس ذات کو موجد کہا جائے گا اسے فقط مطلقا موجد کہنا مقصود ہوگا یا کہ فلاں چیز کا اور فلاں حکمت کے پیش نظر وہ موجد ہے یہ کہنا مقصود ہوگا۔جب صرف موجد کہنا مقصود ہو تو اس کے لئے مختلف الفاظ مترادفہ استعمال کئے جاتے ہیں۔

اگرچہ بظاہر وہ تمام الفاظ قریب المعنی ہوتے ہیں لیکن ان میں فرق بھی پایا گیا ہے۔ وہ کل دس الفاظ ہیں۔

﴿ الموجد، المحدث، المكون، المنشئ، المبدع، المخترع، الصانع، الخالق، الفاطر، البارى، الموجد معناه المؤثر فى الوجود ﴾

موجد اسے کہا جاتا ہے جو وجود میں مؤثر ہو "**المحدث معناه الذى جعله موجودا بعد ان كان معدوما**" محدث اسے کہا جاتا ہے جو معدوم کو موجود کرے "**المكون**" تقریبا الموجد کا مرادف

ہے " المنشئی " یہ مشتق ہے " النشؤ " سے جس کا معنی ہے النماء (بڑھنا) "وھو الذی یکون قلیلا قلیلا علی التدریج " یہ اسے کہا جاتا ہے جو آہستہ آہستہ تدریجی طور پر کسی چیز کو معرض وجود میں لائے۔"المبدع ھو الذی یکون دفعة واحدة " مبدع وہ ہے جو کسی چیز کو یکا یک معرض وجود میں لائے اس میں تدریج نہیں المنشی اور المبدع کو الموجد کی انواع ہونے کی حیثیت حاصل ہے اور الموجد کو جنس کی حیثیت حاصل ہے "المخترع "کا معنی المبدع کے قریب ہی ہے۔"الصانع " تقریبا اسے کہا جاتا ہے جو تکلف سے کوئی کام کرے۔"الخالق " کا مشہور معنی پیدا کرنے والا رب تعالیٰ کی طرف جب منسوب ہو تو علم قدرۃ ارادہ ومشیت کو مستلزم ہوگا۔"الفاطر"مشتق ہے الفطر سے جس کا معنی پھاڑنا اس کا معنی بھی تقریبا یہ ہے کہ دفعۃ واحدۃ (یکا یک) کسی چیز کو معرض وجود میں لانا"الباری " کسی چیز کو اس کی مصلحت کے مطابق معرض وجود میں لانا عام طور پر کہا جاتا ہے "برئی القلم " قلم کو درست کر دیا اور غرض معین کے موافق کر دیا۔

یہ تمام الفاظ صرف کسی کے موجد ہونے پر دلالت کر رہے ہیں۔اگر کسی معین چیز کی ایجاد مراد لی جائے تو اس کے لئے اس چیز کے مطابق لفظ استعمال ہوگا۔جیسے نفع مند چیز کی تخلیق کی وجہ سے نافع کہا جائے ،تکلیف دہ چیز کی تخلیق کی وجہ سے ضار کہا جائے ، حیات کی تخلیق کی وجہ "محیی"، موت کی تخلیق کی وجہ سے " ممیت" کہا جائے ، جب کسی کو اکرام سے خاص کرے تو "بر لطیف" کہا جائے۔جب کسی کو قہر سے خاص کرے تو " قھار وجبار" کہا جائے اور جب کسی کو کم عطاء کرے تو "قابض "اور جب کسی کو زیادہ عطا کرے تو "باسط " کہا جائے۔اور اگر گناہوں کی جزاء عذاب سے دے تو "منتقم " اور اگر گناہوں کو معاف فرما دے تو" غفور ،رحیم ، رحمن" کہا جائے۔خیال رہے اگر حال میں اعطاء کم ہو "قابض " اور اگر زیادہ ہو تو "باسط " کہا جاتا ہے لیکن اگر مرتبہ،حشمت میں کمی کرے تو"خافض "اور اگر زیادہ کرے تو" رافع " کہا جاتا ہے۔

" اذا عرفت ھذا فنقول ان اقسام مقدورات اللہ تعالیٰ بحسب الانواع والاجناس غیر متناھیة فلا جرم یمکن ان یحصل اللہ تعالیٰ اسماء غیر متناھیة بحسب ھذا الاعتبار "

جب یہ واضح ہو گیا تو ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے مقدورات انواع واجناس کے لحاظ پر

غیر متناہی (لامحدود) ہیں تو اس اعتبار سے اس کے نام بھی غیر متناہی ہی ہوں گے۔

تنبیہ: اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی توقیفیہ ہیں یا غیر توقیفیہ اس کی بحث انشاء اللہ صفات کی بحث کے بعد ہوگی۔

فائدہ: ایک چیز کے مقابل جب دوسری چیز ہو تو وہ پہلی کی ضد ہوگی۔ یا اسے عدم سے تعبیر کیا جائے گا جیسا کہ المعز اور المذل اور اسی طرح المحیی اور المميت ایک دوسرے کے مقابل ہیں ان کو ایک دوسرے کی ضد کہا جائے گا۔ لیکن القابض اور الباسط اسی طرح الخافض اور الرافع بھی ایک دوسرے کے مقابل ہیں لیکن ان میں تقابل عدم اور وجود کا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ "قبض" کا معنی ہے کثیر مال نہ عطا کرنا اور "بسط" کا معنی ہے کثیر مال عطا کرنا۔ اسی طرح "خفض" کا معنی ہے بڑا مرتبہ نہ دینا اور "رفع" کا مطلب ہے بڑا مرتبہ دینا۔ لیکن اعزاز اور اذلال میں یہ صورت نہیں پائی جاسکتی۔ وہ ایک دوسرے کی ضد نہیں "لانہ فرق بین ان لایعزہ وبین ان یذلہ" اس لئے کہ کسی کو عزت نہ دینا اور ذلیل کرنا علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جس کو عزت نہ دی جائے۔ اسے ذلیل بھی کیا جائے عزت نہ دینے کو ذلت مستلزم نہیں۔

فائدہ: کبھی الفاظ ایک دوسرے کے معنی کے لحاظ سے قریب ہوتے ہیں۔ پتہ چلتا ہے کہ ان میں ترادف ہے لیکن کامل تأمل سے ان میں ایک لطیف فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر "الرؤف" اور "الرحیم" کا ایک معنی سمجھ آتا ہے لیکن ان میں فرق پایا جاتا ہے:

" الرؤف امیل الی جانب ایصال النفع والرحیم امیل الی جانب دفع الضرر "

اس لئے کہ رؤف اسے کہا جاتا ہے جس کا میلان نفع پہنچانے کی جانب ہو۔ اور الرحیم اسے کہا جاتا ہے جس کا میلان ضرر (نقصان، تکلیف) کو دور کرنے کی جانب ہو۔ اسی طرح الفاتح ، الفتاح اور النافع ، النفاع اور الواهب ، الوهاب کا ایک ہی معنی نظر آتا ہے۔ لیکن ان میں بھی فرق ہے:

" الفاتح یشعر باحداث سبب الخیر، والواهب یشعر بایصال ذلک الخیر الیه ، والنافع یشعر بایصال ذلک النفع الیه بقصد ان ینتفع ذلک الشخص به "

کیونکہ الفاتح کا معنی ہے خیر (بھلائی، بہتری) کے اسباب پیدا کرنے والا۔ اور الواهب کا

معنی ہے وہ بھلائی اس تک پہنچانا النافع کا معنی ہے کہ نفع اس تک پہنچانا اور یہ ارادہ بھی رکھنا کہ اسے نفع حاصل ہو جائے کہ وہ اس سے فائدہ حاصل کر سکے۔

صفات سلبیہ : اللہ تعالیٰ کی صفات سلبیہ کو جاننے کے لئے ایک ضابطہ کو ذہن میں رکھا جائے۔وہ یہ ہے کہ سلب یا تو ذات کی طرف لوٹے گی، اور یا صفات کی طرف عائد ہو گی، اور یا افعال کی طرف اسے منسوب کیا جائے گا، وہ سلب جو ذات کی طرف عائد ہے اس کے بہت افراد ہیں آسان لفظوں میں یوں کہا جائے "انه تعالیٰ لیس کذا ولا کذا" کہ بیشک اللہ تعالیٰ اس طرح نہیں اور اس طرح نہیں۔مثلاً یہ کہا جائے وہ جوہر نہیں، وہ جسم نہیں، وہ مکان میں نہیں، وہ حیز میں نہیں، وہ حال نہیں، وہ محل نہیں۔

فائدہ : اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔﴿ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ ﴾ اللہ تعالیٰ غنی ہے اور تم فقیر ہو۔

اور ارشاد ہے۔ ﴿وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ﴾ اور آپ کا رب غنی، رحمت والا۔ان ارشادات گرامیہ سے پتہ چلا کہ وہ جب غنی ہے تو محتاج نہیں۔لہذا واضح ہوا کہ وہ اپنی ذات میں اور صفات حقیقیہ میں اور صفات سلبیہ میں کسی کا محتاج نہیں۔یہاں سے ہی ایک اور بات سمجھ آ گئی کہ وہ ﴿ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ﴾ ہے کیونکہ کسی کا باپ ہونا یا اولاد ہونا اس کی احتیاجی پر دلالت کرتا ہے جب وہ احتیاجی سے پاک ہے تو یقیناً باپ ہونے اور اولاد ہونے سے بھی پاک ہے۔

☆ وہ سلب جو صفات کی طرف عائد ہے اس کے لئے آسان قانون یہ ہے " کل صفة تکون من صفات النقائص فانه یجب تنزیه الله تعالیٰ عنها " ہر صفت جو نقص پر دلالت کرتی ہو اللہ تعالیٰ کا اس سے پاک ہونا ضروری ہے۔صفات کی طرف عائد ہونے والی صفات کی چار قسمیں ہیں۔

(۱) بعض وہ ہیں جو علم کی اضداد (ضدوں) کے قبیلہ سے ہیں۔

(۲) بعض وہ ہیں جو قدرۃ کی اضداد کے قبیلہ سے ہیں۔

(۳) بعض وہ ہیں جو استغناء کی اضداد کے قبیلہ سے ہیں۔

(۴) بعض وہ ہیں جو وحدۃ کی اضداد کے قبیلہ سے ہیں۔

جن کا تعلق علم کی اضداد سے ہے : ان کی پھر چند قسمیں ہیں:

(۱) **نیند**، اس لئے کہ جب تک کوئی شخص نیند کی حالت میں ہوتا ہے اسے علم حاصل نہیں ہوتا۔اتنی دیر کے لئے اس کا علم موقوف ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ کا علم موقوف رہے ایک معمولی وقت کے لئے بھی اسے بے علم تسلیم کیا جائے (العیاذ باللہ) یہ ممکن ہی نہیں۔یہی وجہ ہے کہ خود مالک الملک نے اپنی صفات کو بیان کرتے ہوئے فرمایا ﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾ اسے نہ اونگھ آئے نہ نیند۔

(۲) **نسیان**، (بھولنا) اللہ تعالیٰ نسیان سے پاک ہے اس لئے کہ نسیان کی حالت میں بھی علم کا زوال ہے خواہ معمولی ہی ہو کیونکہ جتنی مقدار میں نسیان ہو گا۔اور جتنی دیر کے لئے نسیان ہوگا اسی مقدار اور اسی وقت کے لئے علم موقوف ہوگا۔اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾ اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں۔

(۳) **جہالت**، اللہ تعالیٰ جہالت سے پاک ہے جب واضح بات ہے کہ جہالت علم کی ضد ہے تو جہالت سے علم کا اٹھنا لازم آئے گا۔رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ﴾ اس سے غائب نہیں ذرہ بھر کوئی چیز آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔

(۴) عام طور پر بعض چیزوں کا علم دوسری بعض چیزوں کے علم سے مانع ہوتا ہے کیونکہ انسان جب بعض معلومات کی طرف مشغول ہوتا ہے تو دوسری بعض معلومات کی طرف توجہ ہی نہیں کرسکتا۔لیکن اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے اسے ہر وقت ہر چیز کا علم حاصل ہے" فانه تعالیٰ لایشغله شأن عن شأن" بیشک اللہ تعالیٰ کو ایک حال دوسرے حال سے پھیر نہیں سکتا۔

جن کا تعلق قدرۃ کی اضداد سے ہے:

وہ صفات سلبیہ جو قدرت کی اضداد کے قبیلہ سے ہیں۔ان کی بھی چند قسمیں ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ اپنے افعال میں تھکاوٹ اور مشقت سے پاک ہے اس لئے کہ جو تھک ہار جائے وہ زمین وآسمان کا نظام کیسے چلا سکتا ہے وہ تو اپنی مخلوق سے کسی وقت بھی غافل نہیں۔رب تعالیٰ کا اپنا ارشاد گرامی ہے ﴿وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ﴾ اور تھکان ہمارے پاس نہ آئی۔

(۲) رب تعالیٰ اپنے فعل میں آلات وذرائع کا محتاج نہیں۔اور اسے کسی چیز کے معرض وجود میں لانے کے لئے نہ تو مادہ کی ضرورت ہے جسطرح انسان کوئی کرسی بنانا چاہے تو اسے لکڑی اور لکڑی کاٹنے اور درست کرنے کے لئے آلات کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے اور نہ ہی اسے مدت کی ضرورت ہے وہ جب چاہے اسی وقت وہ چیز موجود ہوجاتی ہے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَا اَرَدْنَاهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَه' كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ جو چیز ہم چاہیں اس سے ہمارا فرمانا یہی ہوتا ہے۔کہ ہم کہیں ہو جا وہ فوراً ہوجاتی ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی قدرت میں کثیر کام کرنے یا قلیل کام کرنے میں کوئی فرق نہیں۔جب کہ انسان تھوڑا کام بڑی چستی سے اور پھرتیلے طریقہ سے کر لیتے ہیں لیکن زیادہ کام سے انہیں تھکان محسوس ہوتی ہے۔بعض اوقات تو زیادہ کام کرنے سے انسان عاجز ہی آجاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا اپنی شان بیان فرماتے ہوئے ارشاد گرامی ملاحظہ ہو۔﴿ وَمَا اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ اور قیامت کا معاملہ نہیں مگر جیسے ایک پلک کا جھپکنا بلکہ اس سے بھی قریب بیشک اللہ سب کچھ کرسکتا ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ کی قدرت کی انتہاء ہوجائے اور عجز آجائے یہ ناممکن ہے اللہ تعالیٰ ہمیشہ کے لئے قادر ہی قادر ہے اس کی قدرۃ کی نہ ابتداء ہے نہ انتہاء رب کائنات نے ارشاد فرمایا:

﴿ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَاءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَاقَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ☆ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴾

بے شک اللہ نے سنا جنہوں نے کہا کہ اللہ محتاج ہے اور ہم غنی اب ہم لکھ رکھیں گے ان کا کہا اور انبیاء کو ان کا ناحق شہید کرنا اور فرمائیں گے کہ چکھو آگ کا عذاب یہ بدلا ہے اس کا جو تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجا اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو عذاب کا مستحق ٹھہرایا جنہوں نے اس ذات کبریاء کو محتاج کہا یا انبیاء کرام کو ناحق شہید کیا تو واضح ہوا کہ ایسی کوئی گھڑی نہیں آسکتی جس میں رب

تعالیٰ کی قدرت ختم ہو جائے اور محتاجی آ جائے لیکن انسانوں میں ہم آئے دن مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ ان کی طاقت کا اختتام ہوتا رہتا ہے اور عجز آتا رہتا ہے۔

وہ سلب جو استغناء کی طرف عائد ہے:

جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے۔ ﴿ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ﴾ اور وہ کھلاتا ہے کھانے سے پاک ہے۔ اور رب تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ﴿ وَهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ ﴾ اور وہ پناہ دیتا ہے اس کے خلاف کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔

وہ سلب جو وحدۃ کی طرف عائد ہے:

یعنی اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں اس سے شرکت کی نفی پائی گئی جن آیات و احادیث میں رب کے شرکاء اور اضداد اور انداد کی نفی پائی گئی ہے۔ ان تمام میں سلب وحدۃ کی طرف عائد ہے کہ وہ ذات وحدہ لاشریک لہ ہے۔

سلب کی وہ قسمیں جو افعال کی طرف عائد ہیں:

اس کے لئے آسان ضابطہ یہ ہے کہ جہاں یہ ذکر ہوگا اللہ تعالیٰ اس طرح نہیں کرتا وہاں افعال کی طرف سلب کی نسبت ہوگی۔ کہ یہ افعال اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں اس کی مثالیں قرآن پاک میں بہت زیادہ پائی گئی ہیں دس مثالیں اس کی علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان کی ہیں۔ لیکن ان دس مثالوں میں مسئلہ بند نہیں۔ اس لئے علامہ نے فرمایا" فالقرآن مملوا منہ " قرآن اس سے بھرا ہوا ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے کسی، چیز کو باطل (بے فائدہ بے مقصد) پیدا نہیں فرمایا، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بے کار نہ بنائے یہ کافروں کا گمان ہے اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی حکایت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ﴿ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ﴾ اور آسمانوں اور زمین کی

پیدائش میں غور کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) اے رب ہمارے تو نے یہ بیکار نہ بنایا۔

(۲) رب تعالیٰ نے کسی چیز کو کھیل نہیں بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ ☆ وَمَاخَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ﴾ اور ہم نے نہ بنائے۔ آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ کھیل کے طور پر ہم نے انہیں نہ بنایا مگر حق کے ساتھ۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو عبث (بے فائدہ) پیدا نہیں فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ ﴿ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ☆ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ﴾ تو کیا یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں بیکار بنایا اور تمہیں ہماری طرف پھرنا نہیں تو بہت بلندی والا ہے اللہ سچا بادشاہ۔

(۴) اللہ تعالیٰ کفران نعمت پسند نہیں فرماتا ارشاد باری تعالیٰ یہ ہے ﴿ وَلَا یَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ﴾ اور اپنے بندوں کی ناشکری اسے پسند نہیں۔

(۵) اللہ تعالیٰ ظلم کا ارادہ نہیں فرماتا، رب کائنات کا ارشاد گرامی ہے ﴿ وَمَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ﴾ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کا ارادہ نہیں فرماتا۔

(۶) اللہ تعالیٰ کو فساد پسند نہیں رب قدوس کا ارشاد یہ ہے ﴿ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ ﴾ اور اللہ فساد کو پسند نہیں فرماتا۔

(۷) اللہ تعالیٰ بغیر کسی جرم کے سزا نہیں دیتا، ارشاد رب کائنات یہ ہے۔ ﴿ مَایَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ ﴾ اور اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم حق مانو اور ایمان لاؤ۔

(۸) مطیع لوگوں کی اطاعت کا رب تعالیٰ کو کوئی فائدہ نہیں اور گنہگاروں کے معاصی سے رب تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں رب کائنات نے ارشاد فرمایا ﴿ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ﴾ اگر تم بھلائی کرو گے اپنا بھلا کرو گے اور اگر برا کرو گے تو اپنا (ہی برا کرو گے)۔

(۹) کسی ایک کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور افعال میں کوئی اعتراض کرے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْئَلُوْنَ ﴾ اس سے نہیں

پوچھا جاتا جو وہ کرے اور ان سب سے سوال ہوگا۔

(۱۰) اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ اور وعید کی مخالفت نہیں فرماتا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ وَمَا اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ﴾ میرے ہاں بات بدلتی نہیں اور نہ میں بندوں پر ظلم کروں۔

تنبیہ : اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور افعال کی طرف منسوب ہونے والی سلب کی قسمیں ان مذکورہ اقسام میں بند نہیں، یہ صرف سمجھانے کے لئے چند مثالیں پیش کیں۔ ورنہ ان کی کوئی حد نہیں۔ ضابطہ ان کے لئے وہی ہے جو صفات سلبیہ کی بحث کی ابتداء میں بیان کر دیا گیا ہے۔ کہ ہر وہ چیز جس میں نقص ہو، عیب ہو، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں ہو سکتی۔

اس پر یہ خیال کرنا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ تو یہ چیزیں اس کی قدرت سے باہر کیسے ہیں کہ وہ جھوٹ نہیں بول سکتا، اور وہ چوری نہیں کر سکتا وغیرہ، اس کا آسان جواب صرف یہ ذہن میں رکھ لیا جائے کہ عیوب و نقصائص اس قابل نہیں کہ رب تعالیٰ کی قدرت میں داخل ہوں، کیونکہ یہ اس کی شان کے مطابق محال ہیں۔ محالات قدرت سے باہر ہیں۔

فائدہ : اللہ تعالیٰ واحد ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں، یعنی اس کی حقیقت مخصوصہ میں اس کا کوئی شریک نہیں، اور نہ ہی صفت الٰہیہ میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ ہی ارواح و اجسام کی تخلیق میں اس کا کوئی شریک ہے۔ اور نظام عالم اور تدبیر عرش میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی "القدوس" ہے، اسی سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ، وہ ذات اپنی حقیقت میں تمام ماہیات سے مختلف ہے۔ اس لئے کہ رب تعالیٰ اپنی حقیقت میں کامل ترین ہے۔ باقی حقیقتیں اور ماہیتیں سب کی سب ناقص ہیں۔ رب تعالیٰ کا اسم گرامی "السلام" ہے۔ جو اس معنی پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ ذات کسی ایسی صفت سے متصف نہیں کہ جس میں نقص پایا جائے وہ تمام ناقص صفات سے پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی "العزیز" ہے جس سے پتہ چل رہا ہے کہ اس کی کوئی نظیر نہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے جو اسماء گرامی ہیں ان سے اللہ تعالیٰ کی صفات کا پتہ چل جاتا ہے۔ کہ ان صفات کا تعلق کون سی صفات سے ہے۔ علامہ رازی رحمہ اللہ نے اگرچہ یہاں طویل بحث

کی ہے کہ بعض اسماء صفات حقیقیہ پر دلالت کر رہے ہیں۔اور بعض صفات سلبیہ پر لیکن طوالت سے بچتے ہوئے اپنی اس مختصر تحریر میں شامل نہیں کر رہا۔ (صفات کی بحث ماخوذ از کبیر جز اول ص ۱۳۰ تا ص ۱۳۸)

دینی مدارس کے طلباء کے ذوق کے لئے ایک اور بحث:

اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء مبارکہ توقیفیہ ہیں یا اصطلاحیہ یعنی غیر توقیفیہ ہیں۔

بعض حضرات نے کہا اللہ تعالیٰ کے اسماء مبارکہ توقیفیہ ہیں ۔

توقیفیہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ قرآن پاک اور احادیث صحیحہ پر موقوف ہیں ۔یعنی اللہ تعالیٰ پر کسی اسم اور صفت پر اس وقت تک اطلاق نہیں ہوسکتا۔جب تک ان کا ذکر قرآن مجید میں یا صحیح حدیثوں میں نہ ہو۔ بعض حضرات نے کہا" **کل لفظ دل علی معنی یلیق بجلال اللہ و صفاته فهو جائز والافلا** " ہر وہ لفظ جو اللہ تعالیٰ کی شان اور اس کی بزرگی ،اور اسی طرح اس کی صفات کی عظمت پر دلالت کرے اس کا اطلاق جائز ہے ورنہ جائز نہیں ہوگا۔

نکتہ: علامہ غزالی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ اسم اور چیز ہے صفت اور۔آپ نے فرمایا:

" **اسمی محمد واسمک ابوبکر فهذا من باب الاسماء واما الصفات فمثل هذا الانسان بکونه طویلا فقیها کذا و کذا** "

میرا نام محمد ہے اور تمہارا نام ابوبکر ہے اسے اسم کہا جاتا ہے لیکن جب کہا جائے کہ یہ انسان لمبا ہے۔یہ فقیہ ہے زاہد ہے، متقی ہے، سخی ہے وغیرہ یہ صفات ہیں۔

" **اذا عرفت هذا الفرق فیقال اما اطلاق الاسم علی اللہ فلایجوز الا عند وروده فی القرآن والخبر واما الصفات فانه لا یتوقف علی التوقیف** "

جب تمہیں اسم اور صفت میں فرق کا پتہ چل گیا۔تو اب یہ کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء تو وہی ہوں گے جن کا ذکر قرآن پاک اور احادیث میں ہوگا البتہ صفات اللہ تعالیٰ کی بے حد ہیں وہ توقیفیہ نہیں۔

اسماء کو توقیفیہ کہنے والوں کی دلیل:

وہ حضرات یہ کہتے ہیں کہ ہم دیکھتے ہیں ایک شخص عالم طب ہو تو اس علم طب کی وجہ سے طبیب کہہ لیا جاتا ہے۔ اسی طرح اسے فقیہ، متقن، متبین کہا جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کو عالم تو کہہ سکتے ہیں لیکن طبیب، فقیہ، متقن اور متبین نہیں کہہ سکتے۔

اس دلیل کا جواب یہ دیا گیا کہ طبیب تو اللہ تعالیٰ کو کہنا جائز ہے کیونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ بیمار ہو گئے تو آپ کو کہا گیا کہ ہم کوئی طبیب لے آئیں تو آپ نے فرمایا" الطبیب امرضنی " میرا طبیب تو وہی ہے جس نے مجھے بیمار کیا ہے۔

البتہ رب تعالیٰ کو فقیہ نہیں کہہ سکتے لیکن اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ فقیہ وہ ہوتا ہے جو متکلم کے کلام سے شبہات کے داخل ہونے کے بعد اس کی غرض کو سمجھے۔ اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق یہ معنی درست نہیں لہذا وہ فقیہ نہیں۔

اللہ تعالیٰ کو متقن نہ کہہ سکنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ لیا ہوا ہے "یقن الماء فی الحوض " سے یہ اس وقت بولتے ہیں جب پانی حوض میں جمع ہو جائے اس لغوی معنی کے مطابق "یقین " یہ ہے کہ بہت سی علامات جمع ہو جائیں ان کی اجتماعی حالت سے یقین حاصل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کا علم علامات واسباب سے پاک ہے۔

اللہ تعالیٰ کو متبین نہ کہہ سکنے کی یہ وجہ ہے کہ تبیین کا مطلب یہ ہے" خفاء کے بعد ظہور" اس لئے کہ تبیین کو بینونۃ اور ابانۃ سے لیا ہوا ہے جس کا معنی ہوتا ہے دوامر متصل کے درمیان تفریق کرنا۔ اور جب دل میں اشتباہ پڑ جائے کہ شائد یہ اس کے مشابہ ہے پھر اس کی وضاحت حاصل ہو جائے کہ دونوں کا حکم علیحدہ علیحدہ ایک دوسرے سے حکم میں جدا ہیں اسی کا نام بینونۃ ہے اور اسی وضاحت کی وجہ سے اس کا نام بیان اور تبیین ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ اشتباہ کے بعد وضاحت، اخفاء کے بعد ظہور سے پاک ہے اس لئے اس کو متبین نہیں کہہ سکتے۔

جو حضرات توقیف کے قائل نہیں ان کے دلائل:

(۱) اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات فارسی، ترکی اور ہندی میں بھی پائے گئے ہیں حالانکہ کسی کا بھی ذکر قرآن پاک اور احادیث میں نہیں۔ باوجود اس کے کہ مسلمانوں کا اجماع ہے اس پر کہ یہ جائز ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ اللہ تعالیٰ کے اچھے نام ہیں ان سے ہی اسے پکارو کسی اسم کو اس وقت تک حسین نہیں کہا جا سکتا جب تک وہ صفات مدح اور نعوت جلالیہ پر دلالت نہ کرے۔

لہٰذا واضح ہوا کہ ہر وہ اسم جو مدح والی صفات اور بزرگی والی صفات پر دلالت کرے گا وہ حسین ہوگا اور اسی کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذات پاک پر صحیح ہوگا۔

(۳) الفاظ کا کامل فائدہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب کہ معانی کی رعایت پائی جائے۔ جب معانی صحیح ہوں تو ان سے منع کرنا اور صرف معین الفاظ کا اطلاق صحیح قرار دینا درست نہیں۔

فائدہ: علامہ غزالی رحمہ اللہ نے فرمایا ایسے نام جن میں عیوب اور نقائص پائے جائیں وہ ہم آپس میں ایک دوسرے کے لئے بولیں تو خلاف ادب سمجھا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے لئے ایسے الفاظ کا استعمال یقیناً بے ادبی ہوگا۔

" اما ذکر الصفا ت بالالفاظ المختلفة فهو جائز فی حقنا من غیر منع فکذلک فی حق الباری تعالیٰ "

لیکن مختلف الفاظ کے ذریعے تعریف کرنا، صفات بیان کرنا، جب ہمارے حق میں جائز ہے تو اسی طرح اللہ تعالیٰ کے حق میں بھی جائز ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کا موقف:

آپ فرماتے ہیں میں نے پند ونصائح کی کتب میں سے کسی کتاب میں دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے چار ہزار نام ہیں۔

ایک ہزار قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں مذکور ہیں۔اور ایک ہزار تورات میں اور ایک ہزار انجیل میں اور ایک ہزار زبور میں۔

اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ان کے علاوہ ایک ہزار اور نام لوح محفوظ میں ہیں جن کو عالم بشر میں نہیں بھیجا گیا۔

اس کے بعد آپ اپنا موقف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔" واقول هذا غير مستبعد فانا بيّنّا ان اقسام صفات الله بحسب السلوب والاضافات غير متناهية " میں کہتا ہوں یہ کوئی بعید بات نہیں اس لئے کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات سلبیہ اور صفات اضافیہ بے حد ہیں۔

پھر اس آگے ترقی کر کے مزید یہ فرماتے ہیں بلکہ ہم کہتے ہیں کہ جس شخص کو عالم اعلیٰ کی تدبیر اور عالم اسفل کی تدبیر میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے آثار کا جتنا زیادہ علم ہوگا۔اسے اللہ تعالیٰ کے ناموں کا بھی اتنا ہی زیادہ علم ہوگا۔اور اسے زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی صفات جو قابل مدح ہوں گی ان کا علم حاصل ہوگا۔اگر کوئی شخص صرف انسان کے بدن کی تشریح کا ہی مطالعہ کرے تو اسے پتہ چل جائے گا کہ بدنِ انسان میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی دس ہزار قسمیں پائی جاتی ہیں۔تو اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ کے دس ہزار ناموں پر اس شخص کو واقفی حاصل ہوگی اسی مقدار میں اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت بھی زیادہ پائی جائے گی۔

تنبیہ : بعض الفاظ قرآن پاک میں وارد ہیں بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ شائد یہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں لیکن وہ بغیر تاویل کے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں ہوسکتے۔﴿ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ ۔ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ☆هُوَ خَادِعُهُمْ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف بغیر کسی تاویل کے استہزاء اور مکر اور مخادعت کی نسبت کرنا ناجائز ہے تاویل کے ساتھ جائز ہے راقم کی کتاب تسکین الجنان کا مطالعہ کیا جائے تو وہ تاویلیں سمجھ آ جائیں گی۔

خلاصہ کلام : اس تمام بحث سے راقم کو یہی پتہ چلا کہ وہی بات زیادہ عقل میں آتی ہے جس کا پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی تو " توقيفيه " ہیں البتہ صفات کے لحاظ سے

مختلف صفتوں کے لحاظ سے مختلف نام نظر آتے ہیں۔یہی موقف درست ہونے پر اورادووظائف میں مختلف صفات کاذکر درست ہوگا۔جیسا کہ پڑھاجاتا ہے۔"یاشا فی الامراض ، یا کافی المهمات ، یا مسبب الاسباب ، یا کاشف المهمات " اس قسم کے تمام الفاظ پر صحیح ہونے کا قول اسی ضابطہ کے مطابق ہوگا۔

رب تعالیٰ کے اسماء گرامی کا اثر:

جس طرح بارش کی تاثیر یہ ہے کہ زمین میں پودہ جات اگتے ہیں کھیت سرسبز وشاداب ہوجاتے ہیں باغ لہلہانے لگ جاتے ہیں لیکن وہی بارش شور زمین ،ریگستان میں یہ تاثیر نہیں کرسکتی۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی میں برکت اور عجیب تاثیر پائی جاتی ہے لیکن زبان کسی متقی، پرہیز گار کی ہو اور جس پر ان کاورد کریں اس میں بھی اثر قبول کرنے کی صلاحیت پائی گئی ہوتو اثر ہوگا اور اثر نہ ہونے کی صورت میں یا تو ورد کرنے والے کی زبان میں اثر نہیں ہوگا اور یا جس پر وہ ورد پڑھاجارہا ہے وہ اس قابل نہیں کہ اس پر اثر ہو۔

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے سنا ہے کہ شیخ ابوالنجیب بغدادی سہروردی اپنے مرید کو چالیس مرتبہ یا دومرتبہ اسم باری تعالیٰ کاورد کرنے کا حکم فرماتے،یعنی مرید کے حال کو دیکھ کر ورد کرنے کی تعداد کو معین فرماتے۔

اس کے ورد کرنے کے بعد آپ خود اس پر اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء گرامی پڑھتے پھر اس کے چہرہ کی طرف دیکھتے اگر آپ سمجھتے کہ اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تو آپ اسے فرماتے "اخرج الی السوق واشتغل بمهمات الدنیا فانک ما خلقت لهذاالطریق " بازار کی طرف چلا جا، دنیاوی کاموں میں مشغول ہوجا،اس لئے کہ تجھے طریقت کی راہ پر چلنے کے لئے پیدا ہی نہیں کیا گیا۔

" فان رآه متاثرا عند سماع اسم خاص مزید التاثر امره بالمواظبة علی ذلک الذکر " (مکمل بحث از کبیر جزء اول ص ۱۵۲ تا ص ۱۵۶)

اگر آپ دیکھتے کہ اس پر اثر ہورہا ہےتو آپ اسے جس اسم گرامی کا حکم فرماتے اس پر ہمیشہ عمل کرنے کی تاکید فرماتے۔

ائمہ کرام کے لئے ایک مفید مسئلہ:

مساجد کی امامت کراتے ہوئے ایک یہ تجربہ بھی ہوا ہے کہ جہلا بعض اوقات علماء کو مسائل سمجھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ جب کہ ان کے سمجھائے ہوئے مسائل اکثر طور پر غلط ہی ہوتے ہیں، صحیح وہی ہوتے ہیں جو علماء کرام بتاتے ہیں۔ کبھی کبھی وقف پر بھی کوئی نہ کوئی شخص معترض نظر آئے گا۔ کہ یہاں وقف نہیں ہونا چاہئے یہاں ہونا چاہئے ایسے لوگوں کو جواب دینے کے لئے وقف کا یہ ضابطہ ضرور یاد کیا جائے:

" واعلم ان الوقف لا بد ان يقع على احد هذه الاوجه الثلاثة وهو ان يكون قصا او كافيا او كاملا فالوقف على كل كلام لا يفهم بنفسه ناقص ، والوقف على كل كلام مفهوم المعانى الا ان ما بعده يكون متعلقا بما قبله يكون كافيا ، والوقف على كل كلام تام ويكون ما بعده منقطعا يكون وقفا تاما "

جان لو بیشک وقف کے لئے ضروری ہے کہ وہ تین قسموں میں سے ایک قسم ہوگا وہ تین قسمیں یہ ہیں (۱) ناقص (۲) کافی ...... (۳) کامل...... ایسی جگہ پر وقف کرنا جو بذاتہ سمجھ نہ آسکے یہ وقف ناقص ہے یعنی ایسی جگہ پر وقف نہ کیا جائے کیونکہ وہ ناقص ہے ، اگر ایسی جگہ وقف کرے جس کا مفہوم تو سمجھ آ رہا ہے لیکن ماقبل سے اس کا تعلق بھی ہے۔ تو اسے وقف کافی کہا جائے گا۔ یعنی اگر وقف نہ کرے تو بہتر ہے اگر وقف کرے تو جائز ہوگا صحیح درست ہوگا۔

اگر ایسی جگہ وقف کرے جہاں مطلب مکمل ہو رہا ہو اور ماقبل سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو تو وہاں وقف کرنا تام ہے۔

تسمیہ میں "بسم " پر وقف کرنا ناقص اور قبیح ہے ."بسم اللہ" پر وقف کرنا یا "بسم اللہ الرحمن " پر وقف کرنا وقف کافی ہے جو صحیح اور درست ہے، اور "بسم اللہ الرحمن الرحیم " پر وقف کرنا وقف تام ہے یعنی کامل طور پر صحیح ہے۔ (کبیر بمع تقدیم وتاخیر جز اول ص ۱۰۳)

تسمیہ کی بحث میں آخری بات:

تسمیہ کی مختصر بحث کا اختتام اس بابرکت بات سے کر رہا ہوں کہ تسمیہ انبیاء کرام کا وظیفہ رہا۔ کیونکہ نوح علیہ السلام نے کشتی پر سوار ہوتے ہوئے پڑھا ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَمُرْسَاهَا ﴾ اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کو جو خط لکھا اس کی ابتداء میں لکھا: ﴿ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ اور نبی کریم ﷺ نے ہر ذیشان ہر اچھے کام کی ابتداء میں ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ پڑھنے کا حکم دیا اور خود بھی "بسم اللہ" شریف سے ابتداء فرماتے تھے۔

اللہ تعالیٰ اس بحث کو پڑھنے، لکھنے والے کو عمل کی توفیق عطا فرمائے اور خصوصاً لکھنے والے کے گناہوں کا کفارہ بنائے۔

آمین بحرمة سید المرسلین۔

☆☆☆☆☆

﴿ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴾

سب خوبیاں اللہ کو جو مالک سارے جہان والوں کا

تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو مالک تمام جہان والوں کا

ال : الف لام جنس ہو تو معنی ہوگا ''جنسی حمد اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے'' اور اگر الف لام استغراقی ہو تو معنی یہ ہوگا ''تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں:

" اذالحمد فی الحقیقة کله له اذ ما من خیر الا وھو مولیه بواسطه اوغیر واسطه کما قال اللہ تعالیٰ ، وما بکم من نعمة فمن اللہ "

جب کہ حقیقت میں تمام حمدیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہیں۔ اس لئے کہ ہر بھلائی کا عطا کرنے والا وہی ہے۔ خواہ بالواسطہ عطا کرے یا بغیر واسطہ کے۔ کیونکہ کوئی انسان بھی جب کسی پر احسان کرے گا انعام عطا کرے گا تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہوگا اسی لئے رب تعالیٰ نے خود فرمایا (ترجمہ) : جو بھی تمہیں نعمت حاصل ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔

اسی سے یہ بھی فائدہ حاصل ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ حی ، قادر ، مرید ، عالم (ہمیشہ کیلئے زندہ ، قدرت رکھنے والا ، ارادہ رکھنے والا ، اور علم رکھنے والا) ہے۔ کیونکہ حمد کا مستحق وہی ہوسکتا ہے جس میں یہ تمام صفات پائی جائیں۔ (از بیضاوی)

حمد : "الحمد ھو الثناء باللسان علی قصد التعظیم نعمة کان اوغیرھا"

حمد اس تعریف کو کہا جاتا ہے جو زبان سے کی جائے اور تعظیم کے ارادہ سے ہو، خواہ نعمت کو مدنظر رکھ کر تعریف کی جائے یا نعمت کو مدنظر نہ رکھے۔

کلام عرب میں حمد کا مشہور اور مختصر معنی یہ "الثناء الکامل" کامل تعریف کرنا۔

مسلمانوں کا اجماع اس پر ہے کہ اللہ تعالیٰ محمود ہے اپنی تمام نعمتوں پر ، اس کی ہر نعمت قابل حمد ہے اور سب نعمتیں اسی سے حاصل ہیں۔ تحمید میں بنسبت حمد کے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ

"والمحمد الذی کثرت خصاله المحمودة" محمد اس ذات گرامی کا اسم مبارک ہے جس میں کثیر "قابل تعریف صفات وعادات پائی گئی ہیں" یعنی جس کی زیادہ سے زیادہ اور بار بار تعریف کی جائے اسے محمد کہا جاتا ہے یہ صرف ایک ذات سید الانبیاء کی ہی ہے۔

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کیا خوب کہا:

"فشق له من اسمه لیجله ، فذو العرش محمود وهذا محمد"

رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو بزرگی عطا کرنے کے لئے آپ کے نام کو اپنے نام سے مشتق کیا ہے۔ صاحب عرش محمود ہے اور یہ محمد ہیں۔ (از قرطبی)

حمد، مدح، شکر کی بحث : عام طور پر تعریف کے طور پر استعمال ہونے والے الفاظ کو یہی تین نام دیئے جاتے ہیں۔ ہر لفظ کا علیحدہ مطلب ہے۔ البتہ مجازی طور پر کبھی ایک لفظ دوسرے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا رہتا ہے۔

حمد اور مدح میں فرق:

(۱) حمد کے لئے ضروری ہے کہ ذوی العقول کے فعل اختیاری پر تعریف ہو الفاظ کوئی بھی ہوں۔
مدح عام ہے ذوی العقول کی ہو یا غیر ذوی العقول کی ہو۔ فعل اختیاری پر ہو یا غیر اختیاری پر ہو۔ جیسے کہا جاتا ہے "مدحت اللؤ لؤ علی صفائها" میں نے موتی کی مدح کی اس کے صاف ہونے پر۔ موتی ذوی العقول سے نہیں اور موتی کی صفائی اور اس کی چمک ودمک اس کے اختیار میں بھی نہیں۔

(۲) حمد کے لئے شرط ہے کہ وہ صادر ہو علم سے (یعنی اس میں یقین پایا جائے) صرف گمان سے صادر نہ ہو اور یہ ہے کہ حمد ایسی صفات محمودہ پر ہوگی جن کو کامل صفات کہا جا سکے ان میں نقص نہ ہو۔ مدح عام ہے خواہ علم یقین ہو یا گمان۔ یعنی جب صرف یہ گمان ہی پایا جائے کہ فلاں کو یہ صفات حاصل ہیں تو مدح ہو سکے گی۔ اور ایسی اچھی صفات جن میں کچھ نقص بھی ہو ان کی وجہ سے بھی مدح کی جا سکے گی۔

(۳) حمد میں بہت عظمت اور بلندی شان پائی جاتی ہے کیونکہ حمد عقلاء اور عظیم شخصیات کی ہو سکے گی "واکثر اطلاقا علی اللہ تعالیٰ" اور اکثر طور پر حمد کا اطلاق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہوتا ہے۔ مدح کا تعلق صرف عقلاء یا عظیم شخصیات سے نہیں بلکہ عام ہے، غیر ذوی العقول اور معمولی چیزوں کی اچھائی پر بھی مدح ہو سکتی ہے۔

(۴) حمد غیر کے محاسن کی خبر دینے کا نام ہے جب کہ اس غیر سے محبت ہو اور اس کی بزرگی بھی مدنظر ہو مدح عام ہے صرف غیر کے محاسن کی خبر دینا ہے اس میں محبت و اجلال کا بھی ساتھ پایا جانا ضروری نہیں یہی وجہ ہے کہ علم نحو میں "الحمد للہ" کو جملہ خبریہ لفظا اور انشائیہ معنی کہا جاتا ہے۔ یا اس طرح کہا جائے "الحمد اخبار یتضمن انشاء" حمد خبر ہے لیکن انشاء کو متضمن ہے لیکن مدح خبر محض ہے اس میں انشاء نہیں۔

(۵) حمد کا حکم دیا گیا ہے کہیں حمد سے منع نہیں کیا گیا احادیث مبارکہ میں ہے "من لم یحمد الناس لم یحمد اللہ" جو بندوں کی حمد نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کی حمد کرنے والا بھی نہیں۔ لیکن مدح سے منع بھی کیا گیا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے "احثوا فی وجوہ المداحین التراب" مدح کرنے والوں کے منہ میں مٹی ڈالو۔ (از روح المعانی)

فائدہ: جب یہ معلوم ہو گیا کہ مدح ذوی العقول اور غیر ذوی العقول، جماد اور غیر جماد یعنی ذی روح اور غیر ذی روح اور فاعل مختار ہو یا غیر مختار ہو۔ سب کی ہو سکتی ہے تو اگر اللہ تعالیٰ کی تعریف میں "امدح اللہ" کہا جائے تو یہ تعریف کامل نہیں ہو گی کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کا فاعل مختار ہونا سمجھ نہیں آئے گا۔ اور اس سے فلاسفہ کا رد بھی نہیں ہو گا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کو فاعل مختار نہیں مانتے بلکہ موجب بالذات مانتے ہیں۔ (از کبیر)

سبحان اللہ رب تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب کی ابتداء "الحمد للہ" سے کر کے عقل کے دعویداروں کو بتادیا کہ تم صرف اپنے آپ کو پڑھا لکھا کہتے ہو اپنے فلسفہ پر ناز کرنے والو کسی علم والے کے پاس بیٹھو کسی مولوی سے "حمد" کی تعریف پڑھ لو تو تمہیں سمجھ آئے گا کہ میں فاعل مختار ہوں۔

مدح سے ممانعت والی حدیث کی وضاحت:

جس حدیث کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: " اذا رأیتم المداحین فحثوا فی وجوههم التراب " جب تم کسی (کے سامنے اس) کی مدح کرتے ہوئے کسی کو دیکھو تو مدح کرنے والوں کے منہ میں مٹی ڈالو۔

اس حدیث کے متعلق ایک تو یہ سمجھا جائے کہ منہ میں مٹی ڈالنے کا کیا مطلب ہے؟"هذا الحدیث قد حمله علی ظاهره المقداد الذی هو راویه " اس حدیث پاک کا حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے اور ان کے ساتھ کچھ اور ساتھیوں نے ظاہری معنی مراد لیا ہے کہ مدح کرنے والوں کے منہ میں فی الواقع مٹی ڈالی جائے۔

" وقال آخرون معناه خیبوهم فلا تعطوهم شیأ لمدحهم " لیکن دوسرے حضرات نے اس کا مجازی معنی مراد لیا ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مدح کرنے والوں کو رسوا کرو ان کو مدح کرنے پر کوئی مال نہ دو۔ بلکہ ان کا رد کیا جائے ان کو عام مجلس میں منع کیا جائے۔ لیکن افسوس آج کل مدح کرنے والے چاپلوسی کرنے والے، چمچہ گیری کرنے والے، مبالغہ آمیزی کرنے والے، مقبول نظر ہوتے ہیں، وہی آنکھوں کا تارا ہوتے ہیں، ان کو ہی نوازا جاتا ہے، حقائق بیان کرنے والے دل سے کسی کی قدر کرنے والے محروم ہی رہتے ہیں۔ اس معاملہ میں سلطان، وزراء، وڈیرے، چوہدری، سردار، نون، ٹوانے، چھٹے، لغاری، مزاری، وٹو، کھٹو تو کیا علماء کرام اور پیران عظام بھی مبتلا نظر آتے ہیں۔

حدیث پاک کی طرف یہ نظر کرنی بھی ضروری ہے "وقد جاء ت احادیث کثیرة فی الصحیحین بالمدح فی الوجه " تحقیق بخاری، مسلم میں کثیر احادیث میں ایک دوسرے کے سامنے (منہ پر) تعریف کرنے کا ذکر بھی موجود ہے تو اس حدیث مبارک میں یا کچھ اور احادیث میں سامنے مدح کرنے سے منع کرنے کا کیا مطلب ہے؟

اس کا جواب دیتے ہوئے علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اہل علم نے ان احادیث میں تطبیق اس طرح دی ہے:

" ان النهی محمول علی المجازفة فی المدح والزیادة فی الاوصاف او علی من یخاف علیه فتنة ونحوه اذا سمع المدح "

جن احادیث میں کسی کے سامنے مدح کرنے سے منع کیا ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ ایسی مدح نہ کی جائے جس کا تعلق تخمینہ، انکل سے ہو۔ اس کے اوصاف کا پتہ نہیں اپنے تخمینہ سے اس کے کمالات کا ذکر کرتا چلا جائے اسی طرح اگر اوصاف زیادہ بیان کرے جو اس میں نہ ہوں تو اس مدح سے بھی منع کیا گیا ہے۔ اور اگر یہ خیال ہو کہ اس کی مدح کی تو یہ متکبر ہو جائے گا۔ خودستائی میں مبتلا ہو جائے گا تو اس فتنہ سے بچنے کے لئے مدح کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

" واما من لا یخاف علیه ذلک لکمال تقواه ورسوخ عقله ومعرفته فلا نهی فی مدحه فی وجهه اذا لم یکن فیه مجازفة بل ان کان یحصل بذلک مصلحة کنشطه للخیر او الازدیاد منه اوالدوام علیه اوالا قتداء به کان مستحبا "(واللہ اعلم)۔

اگر کسی پر اس قسم کا خوف نہیں یعنی جو برائیاں اوپر ذکر کی ہیں۔ ان کا خوف نہیں کیونکہ اس کے تقوی کمال عقل اور معرفت پر کامل بھروسہ ہو تو اس کی تعریف اس کے سامنے منع نہیں۔ لیکن اس میں بھی شرط یہ ہے کہ تعریف حقائق پر مبنی ہو فقط تخمینہ پر مبنی نہ ہو۔

اسی طرح اگر یہ معلوم ہو کہ اس کی مدح کی گئی تو یہ نیکی کے کام میں زیادہ چستی دکھائے گا۔ اور پہلے سے زیادہ نیکی کے کاموں میں حصہ لے گا۔ یا یہ نیکی کے کاموں پر قائم ودائم رہے گا۔ یا اس کی مدح سے دوسرے لوگ بھی اس کی اقتداء کرتے ہوئے نیکی کے کام کریں گے تو ان صورتوں میں مدح کرنی جائز ہے۔ اس میں کوئی ممانعت نہیں۔

لیکن یہ خیال رہے کہ مدح جہاں بھی جائز ہوگی وہ حقائق پر مبنی ہو۔ اگر حقائق سے ہٹ کر کذب بیانی سے مدرسہ، مسجد کے لئے چندہ بٹورنے کے لئے فساق کو مقام ولایت، غوثیت تک پہنچا دیا جائے تو وہ مدح کرنے والے مذمت کے مستحق ہوں گے کاش کہ علماء کرام اس مسئلہ کو مدنظر رکھیں۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

حمد اور شکر میں فرق:

(۱) شکر فی مقابلة النعمة قولا وعملا واعتقادا " شکر اس تعریف کا نام ہے جو نعمت کو مدنظر رکھتے ہوئے کی جائے۔ لیکن عام ہے خواہ زبان سے تعریف کی جائے یا ارکان (اعضاء) سے عمل کیا جائے یا خدمت کی جائے۔ یا اسی طرح دل سے محبت واعتقاد رکھا جائے۔ یہ سب شکر ہیں۔
(از بیضاوی وروح المعانی)

(۲) حمد اور شکر میں فرق یہ ہے " ان الحمد یَعُمُّ ما اذا وصل ذلک الانعام الیک او الی غیرک " بیشک حمد عام ہے کہ وہ انعام تمہیں حاصل ہو یا کسی اور کو حاصل ہو تو تم تعریف کرو۔ "واما الشکر فھو مختص بالانعام الواصل الیک " لیکن شکر صرف اس تعریف کو کہیں گے جو تمہیں انعام حاصل ہو تو تم تعریف کرو۔ (کبیر)

تنبیہ: یہ ان حضرات کے نزدیک ہے جو حمد اور شکر دونوں میں ہی نعمت کا لحاظ کرتے ہیں۔ فرق صرف زبان سے تعریف کو حمد اور زبان ارکان اور دل سے تعریف کرنے کو شکر کہنے سے کرتے ہیں۔

اس معنی کے لحاظ سے بھی "الحمد للہ " کہنا "الشکر للہ " کہنے سے بہتر ہے کیونکہ "الحمد للہ " اللہ تعالیٰ کی ثناء ہے ہر انعام پر جو اس سے صادر ہوا خواہ حمد کرنے والے کے غیر کو ہی کیوں نہ حاصل ہو۔

لیکن شکر اسی انعام پر ہوگا جو اس شکر کرنے والے کو حاصل ہوگا۔ یقیناً پہلی صورت میں تعریف میں عموم ہے وہی بہتر ہے اور وہی حمد ہے اب تقدیر عبادت کی یہ ہوگی گویا کہ بندہ "الحمدللہ " کہہ کر رب تعالیٰ کے حضور یہ کہہ رہا ہے۔

" سواء واعطیتنی او لم تعطنی فانعامک واصل الی کل العالمین وانت مستحق للحمد العظیم "

اے اللہ تو نے مجھے انعام عطا کیا ہے یا نہیں لیکن تو عظیم حمد کا مستحق ہے اس لئے کہ تیرا انعام تمام جہان والوں کو پہنچنے والا ہے۔

(۳) حمد اور شکر میں اور فرق یہ ہے "الحمد علی مادفع اللہ من البلاء والشکر علی ما

اعطیٰ من النعماء " اللہ تعالیٰ کی مصیبتوں کو دور کرنے پر تعریف کرنے کو حمد کہا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمتوں کے حاصل ہونے پر تعریف کرنے کو شکر کہا جائے گا۔

اعتراض: جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی ہوئی نعمتیں زیادہ ہیں بنسبت مصائب کو دور کرنے کی نعمتوں کے تو کیا وجہ ہے کہ اکثر کو ذکر نہیں کیا اور کم کو ذکر کر دیا ہے؟

جواب نمبر ۱: الحمد للہ کہنے والا گویا کہ یہ کہہ رہا ہوتا ہے اے مولائے کائنات جب تیری کم مقدار نعمتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں تیری حمد کر رہا ہوں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تیری کثیر نعمتوں پر تیرا شکر گزار نہ ہوں۔ بلکہ یہ بھی خیال رہے کہ جب حمد کا مشہور معنی لیا جائے کہ نعمت کے مقابل ہو یا نہ ہو اور شکر کے لئے نعمت کا مقابل ہونا مراد لیا جائے تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اے باری تعالیٰ نعمتوں کو مدنظر رکھنے کے بغیر ہی جب میں تیری حمد کر رہا ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ تیری نعمتوں پر تیرا شکر گزار نہ بنوں۔

جواب نمبر ۲: انسانی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انعامات کو اتنا زیادہ اہم نہیں سمجھتا جتنا کہ نفع کو حاصل کرنا اہم سمجھتا ہے اسی وجہ سے حمد کو ذکر کیا گیا ہے جس کا تعلق دفع بلاء سے ہے۔ کیونکہ مصیبت کے دور ہونے سے ہی نفع حاصل کیا جا سکے گا۔

عربی زبان کا کمال دیکھیں:

دو جملے ہیں " الحمد للہ " (سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں) اور "احمد اللہ" (میں اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتا ہوں)۔ ان میں سے پہلا جملہ اسمیہ ہے اور مبتداء پر الف لام استغراقی ہے۔ اور خبر پر لام کے کئی معانی ہیں جن کا ذکر انشاء اللہ قریب ہی آ رہا ہے ان میں سے ایک معنی ہے "اختصاص"۔

دوسرا جملہ فعلیہ، مضارعیہ ہے۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ جملہ اسمیہ دوام استمرار پر دلالت کرتا ہے اور مضارعیہ تجدد پر۔

اس تمہید کے بعد ان میں فرق دیکھیں کہ "الحمد للہ" میں کیا کمال ہے؟ جو "احمد اللہ" میں نہیں۔

(۱) اگر "احمد الله " کہا جائے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ شائد حمد کرنے والا از خود حمد کرنے پر قادر ہے۔اس کی حمد کی وجہ سے رب تعالیٰ محمود ہے۔لیکن "الحمد لله " کہنے والا گویا کہ یوں عرض کر رہا ہوتا ہے کہ اے رب کائنات میرا حمد کرنا بھی تیری توفیق سے اور تیری عطا سے ہے اگر تو مجھ پر انعام نہ فرماتا اور مجھے توفیق نہ عطا فرماتا تو میں تیری حمد کیسے کرسکتا "فهو تعالیٰ محمود من الازل الی الابد بحمده القديم و كلامه القديم " اور گویا کہ یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ تو ہمیشہ کے لئے جب حمد کا مستحق ہے تو میں جانتا ہوں کہ تو میری حمد سے محمود نہیں بنے گا بلکہ اے اللہ تو ازل سے ابد تک اپنے کلام قدیم اور حمد قدیم سے ہی محمود ہے تو حمد کرنے والوں سے پہلے ہی محمود ہے اور تو شکر کرنے والوں سے پہلے ہی محمود کوئی حمد کرے یا نہ کرے کوئی شکر کرے نہ کرے تیری شان محمودیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

(۲) " الحمد لله " کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مستحق حمد ہے اور سب کائنات کی حمد اس کی ملکیت ہے جب اللہ تعالیٰ کے انعامات کثیر ہیں اور مختلف قسم کے انعامات ہیں تو وہ حمد کا مستحق لذاتہ ہے۔"فقولنا الحمد لله معناه ان الحمد لله حق يستحق لذاته " جب ہم کہیں گے "الحمدلله " تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔جو ذاتی طور پر حمد کا مستحق ہے۔

لیکن اگر "احمد الله " کہا جائے تو اس سے اس ذات پاک کا مستحق حمد لذاتہ ہونا نہیں سمجھ آئے گا۔

" ومعلوم ان اللفظ الدال على كونه مستحقا للحمد اولى من اللفظ الدال على ان شخصا واحدا احمده "

اس سے واضح ہو گیا کہ بیشک وہ الفاظ مبارکہ ہی بہتر ہیں جن سے رب تعالیٰ کا مستحق حمد ہونا سمجھ آ رہا ہے لیکن وہ الفاظ جن سے صرف ایک شخص کا حمد کرنا سمجھ آئے وہ اس کے مقابل کہاں ہو سکتے ہیں۔

(۳) اگر انسان "احمد الله " کہے تو اس سے صرف اتنا سمجھ آ سکتا ہے کہ فلاں شخص اللہ تعالیٰ کی حمد کر رہا ہے۔لیکن اس سے یہ نہیں سمجھ آ سکتا کہ حمد اس ذات کے لائق ہے۔لیکن جب "الحمد لله " کہے گا تو اس سے یہ پتہ چلے گا کہ وہ گویا کہ یہ کہہ رہا ہے "من انا حتى احمده ؟ لكنه محمود بجميع حمد الحامدين " میں کون ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی حمد کامل طور پر کر سکوں رب تعالیٰ کی ذات تو

وہ ذات ہے جس کی حمد کرنے والی ساری کائنات ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ جب تم سے کوئی یہ سوال کرے کہ فلاں شخص کے تم پر انعامات ہیں؟ یہ شخص جواب دے ہاں تو یہ تعریف ناقص ہے اگر یہ جواب دے کہ ہاں اس کے انعامات تو بہت سے لوگوں پر ہیں تو یہ تعریف کامل ہے۔

(۴) "الحمد للہ" دل کی صفت ہے گویا کہ اعتقاد یہ پایا جاتا ہے کہ جس ذات کی حمد کی جارہی ہے وہ بڑی فضیلت کا مالک ہے۔ وہ انعامات عطا کرنے والا ہے وہ مستحق تعظیم ہے، وہ بہت بڑا بزرگ ہے، وہ مستحق حمد ہے۔ پڑھنے والا خواہ حضور قلب سے پڑھے یا پڑھتے وقت دل غافل ہو ہر لحاظ پر اللہ تعالیٰ کی حمد ہے اس لئے کہ پڑھنے والے کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ ذاتی طور پر مستحق حمد ہے۔

لیکن "احمد اللہ" پڑھنے والا اگر حاضر دل سے پڑھے تو یہ حمد ہے اور اگر غافل دل سے پڑھے تو یہ کذب ہے کیونکہ اس میں اس ذات کبریا کا مستحق حمد ہونا نہیں سمجھ آیا۔ سبحان اللہ! مالک الملک نے اپنے بندوں پر کتنا انعام کیا کتنا احسان ہے اس ذات پاک کا کہ بندے اس کی حمد کسی حال پر بھی کریں ان کو ثواب ہو ان کی طرف سے کذب بیانی نہ بنے۔ (از کبیر)

یہ کمال عربی زبان کو ہی حاصل ہے کہ معمولی فرق سے معانی ومطالب میں عظیم فرق سمجھ آتا ہے یہ وہی حضرات سمجھ سکتے ہیں جو عربی گرائمر پر کامل دسترس رکھتے ہیں۔ کہاں ہمارے جیسے ہیچ مدان یا ہم سے بھی گئے گزرے ہوئے دعویدار بن بیٹھیں۔ کہ میں بھی سب کچھ سمجھتا ہوں میں تو یہ کہتا ہوں سلف صالحین کے تفاسیر بھی سمجھ آجائیں تو یہ بھی بہت بڑی غنیمت ہے۔

لام جارہ: للہ میں لفظ اللہ سے پہلے جو لام ہے اسے لام جارہ کہتے ہیں۔ یعنی زیر دینے والا۔ یہاں اس کے کئی معانی بن سکتے ہیں۔

(۱) اختصاص، لائق، اس معنی کے لحاظ پر ترجمہ یہ ہوگا تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں اللہ تعالیٰ کے لائق ہیں۔

(۲) ملک جیسے کہا جاتا "الدار لزید" گھر زید کی ملکیت ہے اس معنی کے لحاظ پر ترجمہ یہ ہوگا۔ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں ہیں۔ یعنی تمام تعریفوں کا وہی مالک ہے۔

(۳) قدرۃ، استیلاء اس معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں کہ اسے حمد پر ولایت وغلبہ حاصل ہے۔اس لئے کہ اللہ تعالیٰ واجب لذاتہ ہے۔اور اس کے ماسوا ممکن لذاتہ ہیں۔واجب لذاتہ کو ممکن لذاتہ پر ولایت حاصل ہے۔گویا کہ اسی سے یہ بات بھی سمجھ آ گئی کہ اسے تمام مخلوق پر ولایت حاصل ہے۔اور اسے تمام مخلوق پر بلندی حاصل ہے۔

(از کبیر جزاول ص ۲۲۰)

فائدہ: الحمد للہ کے آٹھ حروف ہیں اور جنت کے آٹھ دروازے ہیں۔جس شخص نے سچے دل سے،صفائی قلب سے الحمد للہ پڑھا اسے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ معبود حقیقی ہے اس کے اوامر ونواہی کو تسلیم کرنا ہے،تو اس پر جنت کے آٹھ دروازے کھول دیئے جائیں گے۔جس دروازے سے چاہے گا داخل ہوسکے گا۔ (ازکبیر)

اعتراض: تم نے بیان یہ کیا ہے کہ حمد کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انعام کرنے والا جس پر انعام کرتا ہے اس کی حمد کا مستحق ہوتا ہے،استاذ طالب علم کی حمد کا مستحق ہوتا ہے، عادل بادشاہ،رعیت کی حمد کا مستحق ہوتا ہے، نبی کریم ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا "من لم یحمد الناس لم یحمد اللہ" جو شخص اللہ تعالیٰ کی حمد نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کی حمد بھی نہیں کرتا۔اب حمد کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہونے کا کیا مطلب ہوگا؟

جواب: حقیقت میں انعام عطا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے اس لئے کہ کوئی انسان انعام عطا کرے گا تو اسے طاقت اللہ تعالیٰ نے دی۔اس کے دل میں اللہ تعالیٰ نے ڈالا ہے وہ نعمت اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے۔اگر اللہ تعالیٰ نعمت کو پیدا نہ کرتا انعام عطا کرنے والے کے دل میں نہ ڈالتا اسے دینے کی طاقت نہ دیتا۔لینے والے کو نفع حاصل کرنے کی طاقت نہ دیتا تو اس نعمت سے نفع حاصل کرنا ممکن نہ تھا "فثبت ان المنعم فی الحقیقۃ ھو اللہ تعالیٰ" پس ثابت ہوا کہ منعم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے اور وہی حمد کا مستحق ہے۔

فائدہ: جب یہ ثابت ہوا کہ غیر اللہ کے انعام عطا کرنے سے اور غیر اللہ کی حمد کرنے سے رب تعالیٰ کے منعم حقیقی ہونے اور مستحق حمد ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔تو اسی سے واضح ہوا کہ رب تعالیٰ

مستعان (جس سے مدد طلب کی جائے) حقیقی ہے، اور مخلوق مجازی طور پر مدد کرنے والی ہے۔ اور مجازاً ہی مخلوق سے امداد طلب کی جاتی ہے مکمل بحث ان شاء اللہ ﴿وایاک نستعین﴾ میں آئے گی۔

(ار کبیر)

اللہ تعالیٰ کے مستحق حمد ہونے پر عقلی دلائل:

(۱) اللہ تعالیٰ منعم حقیقی ہے۔ انسان کو منعم رب تعالیٰ نے بنایا اس کے دل میں انعام دینے کی خواہش ومحبت رب تعالیٰ نے ڈالی ہے۔ اس لئے عقل کا تقاضا ہے کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ مستحق حمد صرف رب تعالیٰ ہی ہے۔

(۲) جو شخص بھی کسی غیر پر انعام کرتا ہے وہ اس کا بدلہ طلب کرتا ہے۔ خواہ ثواب ہی طلب کرے یا یہ چاہے کہ وہ میری تعریف کرے یا اس کا تقاضا ہو کہ میرا حق مجھے مل جائے۔ یا اس کی تمنا ہو کہ بخل کی عادت سے نفس کو چھٹکارا مل جائے۔ جو انعام پر بدلہ طلب کرے وہ حقیقی منعم نہیں اور نہ ہی حقیقی طور پر حمد کا مستحق ہے۔

" اما اللہ سبحانہ وتعالیٰ فانہ کامل لذاتہ والکامل لذاتہ لایطلب الکمال "

"لیکن اللہ تعالیٰ کامل لذاتہ ہے جو ذات کامل لذاتہ ہے وہ کسی سے کمال طلب نہیں کرتا"۔

اللہ تعالیٰ کی عطا خالص جود ہے اور خالص احسان ہے "فلا جرم کان مستحقا للحمد، فثبت انہ لا یستحق الحمد الا اللہ تعالیٰ" اسی سے عقل نے یہ یقین کر لیا کہ اللہ تعالیٰ مستحق حمد ہے اور اس کے بغیر حقیقی طور پر کوئی مستحق حمد نہیں۔

(۳) ہر نعمت موجودات ممکنۃ الوجود سے ہے۔ ہر وہ چیز جس کا پایا جانا ممکن ہو اس کا موجد حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہے خواہ بلاواسطہ ہو یا بالواسطہ۔ تو اسی سے واضح ہو گیا کہ جب ہر نعمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ تو عقل یہ تسلیم کرتی ہے کہ مستحق حمد صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ (وجب القطع بان احدا لایستحق الحمد الا اللہ تعالیٰ)۔

(۴) نعمت اس وقت تک کامل نہیں ہوتی جب تک اس میں تین چیزیں نہ پائی جائیں:

☆ نعمت میں کمال اس وقت ہو گا جب اس میں منفعت پائی جائے۔ کسی چیز سے نفع وہی حاصل

کرے گا جسے حیات اور ادراک (سمجھ) حاصل ہو۔اور حیات وادراک اللہ تعالیٰ کی ایجاد کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتے۔

☆ کسی چیز میں نفع پایا بھی جائے پھر بھی وہ نعمت اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتی جب تک وہ ضرر غم سے خالی نہ ہو" واخلاء المنافع عن شوائب الضرر لا یحصل الا من اللہ تعالیٰ "نقصان دہ چیزوں سے منافع کا خالی ہونا سوائے اللہ تعالیٰ کے حاصل نہیں۔

☆ نعمت اس وقت تک کامل نہیں ہوتی جب تک اس کے ختم ہونے کا خوف نہ ہو یہ چیز بھی صرف اللہ تعالیٰ سے ہی حاصل ہوگی "اذا ثبت هذا فالنعمة الكاملة لا تحصل الامن الله تعالیٰ فوجب ان لا یستحق الحمد الکامل الا اللہ تعالیٰ" جب یہ ثابت ہوگیا تو اسی سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ نعمت کاملہ صرف اللہ تعالیٰ سے ہی حاصل ہے تو ضروری ہے کہ کامل حمد کا مستحق بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ (از کبیر)

انسان حمد اور شکر سے عاجز ہے:

انسان خود رب تعالیٰ کی حمد کامل طور پر کر سکے یا رب تعالیٰ کا شکر ایسا ادا کر سکے جیسا ادا کرنے کا حق ہے یہ انسان کی طاقت نہیں انسان اس سے عاجز ہے۔اس پر چندہ وجوہ دلالت کرتی ہیں۔

(۱) حمد اور شکر انسان اسی وقت کرسکتا ہے۔جب اس کے دل میں اللہ تعالیٰ یہ ڈال دے کہ حمد اور شکر کرنا چاہئے اور اس کی رکاوٹیں اور حائل ہونے والی اشیاء کو بھی دور کیا جائے۔یہ کام صرف اللہ تعالیٰ ہی کرسکتا ہے جب حمد وشکر کی توفیق اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے تو یہ بھی اس کی نعمت ہے ہر نعمت پر شکر واجب ہے پھر حمد وشکر کرے گا تو وہ بھی رب تعالیٰ کی توفیق سے حاصل ہوگا۔اس طرح انسان کما حقہ حمد وشکر کرنے سے عاجز ہے۔

(۲) عام انسان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا علم حاصل کر سکے یہ ممکن ہی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو نہیں شمار کرسکو گے۔ جب انسان کا علم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے تو حمد وشکر ہر نعمت پر کیسے بجا لاسکتا ہے۔

(۳) اصل حمد صرف زبان سے "الحمد للہ" کہہ دینا کافی نہیں بلکہ جس شخص پر انعامات کئے گئے ہیں اس سے یہ بھی معلوم ہو کہ انعام کرنے والا کتنی عظیم صفات کا مالک ہے:

" وکل ماخطر ببال الانسان من صفات الکمال والجلال فکمال اللہ وجلالہ اعلی واعظم من ذلک المتخیل والمتصور "

انسان کے دل ودماغ میں اللہ تعالیٰ کی صفات کمال وجلال جو بھی آئیں گی دراصل اللہ تعالیٰ کی صفات جلال وکمال ان سے بہت عظیم بہت بلند ہوں گی جب انسان رب تعالیٰ کی صفات کے علم سے قاصر ہے تو یقیناً اس کی حمد کو حقیقی طور پر بجالانے سے بھی عاجز ہے۔ (از کبیر)

بندہ رب تعالیٰ کی نعمتوں کا حق ادا کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا:

کوئی انسان یہ تصور بھی نہیں کرسکتا کہ وہ رب تعالیٰ کی نعمتوں کا حق ادا کرسکے اس لئے کہ اس کی نعمتیں ان گنت، لامحدود ہیں جب وہی علم میں نہیں تو ان کی حمد کرنا، ان کا شکر ادا کرسکنا، اور ان کا حق ادا کرسکنا انسان کے تصور وہم وگمان سے بھی بالاتر ہے۔ اور وجہ یہ ہے کہ بندہ اپنی ذات اور صفات اور اپنے جمیع احوال میں رب تعالیٰ کا محتاج ہے۔ "واللہ تعالیٰ غنی عن شکر الشاکرین وحمد الحامدین" اور اللہ تعالیٰ شکر کرنے والوں کے شکر اور حمد کرنے والوں کی حمد سے بے پرواہ ہے۔ لہذا عاجز محتاج یہ کیسے تصور کرسکتا ہے کہ وہ بے پرواہ ذات کی کماحقہ حمد کرسکتا ہے یا اس کا حق ادا کرسکتا ہے۔ (از کبیر)

رب تعالیٰ کا بندے پر احسانِ عظیم:

یہی وجہ ہے کہ بندہ کماحقہ حمد کرنے سے عاجز ہے۔ تو رب تعالیٰ نے بندے کو یہ نہیں کہا "احمدوا اللہ" تم اللہ تعالیٰ کی حمد کرو۔ کیونکہ اگر یہ کہا جاتا تو بندے کو وسعت سے زائد تکلیف دی جاتی جب "الحمد للہ" کہا تو اس سے یہ واضح ہو گیا کہ حمد اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور اس کی ملکیت ہے برابر ہے بندہ اس کو ادا کرنے پر قدرت رکھے یا نہ رکھے۔

☆ حضرت داؤد علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا کہ اے باری تعالیٰ میں تیرا شکر کیسے

ادا کروں۔ جب کہ جو شکر بھی ادا کرتا ہوں وہ تیری توفیق سے، تیری عطاء سے کرتا ہوں۔ تیرے اس انعام کا شکر ادا کروں تو پھر وہ تیرے انعام سے اس طرح میں شکر ادا کرنے سے عاجز ہوں۔

"فقال یا داؤد لما علمت عجزک عن شکری فقد شکرتنی بحسب قدرتک وطاقتک"

رب تعالیٰ نے فرمایا اے داؤد تمہارا یہ جان لینا کہ تم میرا شکر کرنے سے عاجز ہو بس یہی میرا شکر ہے کہ تم نے اپنی طاقت وقدرت کے مطابق میرا شکر ادا کر دیا۔

☆ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"اذا انعم الله علی عبده نعمة فیقول العبد الحمد لله فیقول الله تعالیٰ انظروا الی عبدی اعطیته ما لاقدر له فاعطانی مالاقیمة له"

"جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو نعمت عطا فرماتا ہے تو بندہ "الحمد لله" کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے کو دیکھو میں نے اسے وہ چیز دی جس کی کوئی قدر نہیں اس نے مجھے وہ چیز دی جس کی قیمت ادا نہیں ہو سکتی"۔

یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ جب بھوکا ہوتا ہے رب تعالیٰ اسے طعام عطا فرماتا ہے اور جب پیاسا ہوتا ہے اسے سیراب کرتا ہے اور جب ننگا ہوتا ہے اسے کپڑا عنایت فرماتا ہے۔ اس نعمت کے اظہار شکر پر جب بندہ "الحمد لله" کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ جتنے حمد کرنے والے حمد کر چکے ہیں ان تمام حمدوں کا مستحق اللہ تعالیٰ ہے۔ اور جتنے حمد کرنے والے حمد کریں گے اگرچہ ابھی انہوں نے حمد نہیں کی لیکن ان سے حمد متوقع ہے وہ تمام حمدیں بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔

"الحمد لله" میں ملائکہ عرش اور کرسی اور آسمانوں میں رہنے والے تمام فرشتوں کی حمد بھی آ گئی اور آدم علیہ السلام سے لے کر آخر الزمان نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تک تمام انبیاء کرام کی حمد کو بھی شامل ہے۔ اور تمام اولیاء کرام اور تمام علماء کرام کی حمد بھی اس میں مذکور ہے۔ اور تمام مخلوق کی حمد کو بھی شامل ہے اور ان محامد کو بھی شامل جو اس قول کے وقت ہوں گی:

"دعواهم فیها سبحانک اللهم وتحیتهم فیها سلام وآخر دعواهم ان الحمد لله رب العلمین"

ان کی دعا اس میں یہ ہوگی کہ اے اللہ تجھے پاکی ہے اور ان کے ملتے وقت خوشی کا پہلا بول سلام ہے اور ان کی دعا کا خاتمہ یہ ہے کہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو سب جہانوں کا مالک ہے اسی طرح "الحمد لله" ان محامد کو بھی شامل جن کی کوئی حد نہیں اور نہ ہی ان کی کوئی انتہا ہے۔

گویا کہ حدیث پاک کا یہ مطلب ہوا کہ رب تعالیٰ کہتا ہے " انظروا الی عبدی قد اعطیته نعمة واحدة لا قدر لها فاعطانی من الشکر ما لاحد له و لا نهایة له " میرے بندے کو دیکھو میں نے اسے ایک نعمت دی جس کی کوئی قدر نہیں لیکن میرے بندے نے میرے حضور شکر و حمد کا وہ تحفہ پیش کیا۔ جس کی کوئی حد نہیں اور نہ ہی اس کی کوئی انتہا ہے۔ (از کبیر)

یہ بھی خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ احسان عظیم ہے کہ بندے کی حمد کو رفعت و بلندی بعطا فرمائی۔ ورنہ رب تعالیٰ کی نعمتیں بھی ان گنت اور غیر محدود ہیں۔

اعتراض: "سبحان الله وبحمده "میں تسبیح کا ذکر پہلے ہے قرآن پاک کی ابتداء "الحمد" سے کیوں کی گئی۔

جواب: "الحمد لله " کے ضمن میں تسبیح کا ذکر بھی موجود ہے کیونکہ تسبیح کا مطلب ہے کہ وہ اپنی ذات وصفات میں نقائص اور آفات سے پاک ہے یہ معنی بھی حمد میں موجود ہے اور اس سے زائد معنی بھی پایا گیا ہے کہ وہ اپنی مخلوق پر احسان فرمانے والا انعام عطا کرنے والا اور رحم کرنیوالا ہے۔ اس لئے حمد کا ذکر کرنا تسبیح کے ذکر سے بہتر ہے۔

نظام دنیا کی ابتدا وانتہاء حمد سے:

" اول کلمة ذکرها ابونا آدم هو قوله الحمد لله وآخر کلمة یذکرها اهل الجنة هو قولنا الحمد لله "

سب سے پہلے ہمارے باپ آدم علیہ السلام نے کہا "الحمد لله " اور آخر میں جنت والے بھی کلمہ ذکر کریں گے۔ وہ انشاء اللہ ہمارا قول الحمد للہ ہوگا۔

یعنی جب آدم علیہ السلام کی روح ناف تک پہنچی تو آپ کو چھینک آئی آپ نے کہا ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ اور جنت والوں کی حمد کو رب تعالیٰ نے ان الفاظ مبارکہ سے ذکر فرمایا ﴿ وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ان کی دعا کا خاتمہ یہ ہے کہ سب تعریفیں اللہ رب العلمین کیلئے ہیں:

" ففاتحة العالم مبنية على الحمد و خاتمته مبنية على الحمد "

''جہان کی ابتدا کی دار و مدار بھی حمد اور انتہار بھی حمد پر ہے''۔

اس لئے اے انسان تو بھی کوشش کر کہ تیرے اعمال کی ابتدا حمد سے ہو اور انتہا بھی حمد پر ہو۔اس لئے کہ انسان عالم صغیر (چھوٹا جہان) ہے۔چاہیے یہ کہ اس کے احوال عالم کبیر (بڑا جہان) کے احوال کے موافق ہوں۔

حمد کے ارکان: حمد کے پانچ رکن ہیں حامد، محمود، محمود علیہ، محمود بہ، صیغہ حمد۔جس طرح کوئی شخص کہے "استاذی شفیق لانه یحسن الی " میرا استاذ شفیق ہے کیونکہ وہ مجھ پر احسان کرتا ہے۔کلام پیش کرنے والا حامد، استاذ محمود، شفقت محمود بہ احسان محمود علیہ۔اور اس کا ''استاذی شفیق'' کہنا صیغہ حمد ہے۔

حمد کے مواقع: بعض اوقات حمد سنت ہے۔جیسا کہ چھینک کے بعد "الحمد لله " کہنا لیکن تین مرتبہ تک اس کے بعد زکام کی صورت میں بار بار "الحمد لله " کہنا مسنون نہیں۔اگر چہ استحباب سے خالی بھی نہیں۔

اسی طرح نکاح کے خطبہ میں اور دعا کی ابتدا میں اور ہر اچھے کام کی ابتدا میں اور کھانے پینے کے بعد وغیر ذلک الحمد للہ کہنا مستحب ہے۔

ناپاک، گندگی کے مقامات میں الحمد للہ پڑھنا مکروہ ہے۔گناہ پر خوش ہو کر اور حرام مال کھانے کے بعد الحمدللہ پڑھنا حرام ہے۔

نصيحة عظميه: "الحمد لله " پڑھنا اگر چہ باعث ثواب ہے اور یہ کلمہ شرافت وجلالت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے لیکن اچھے محل میں ادا کرے تو مقصد حاصل ہوگا۔ورنہ مقصد حاصل نہیں ہوگا۔

حضرت سری سقطی رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں تیس سال سے استغفار کر رہا ہوں کیونکہ میں نے ایک مرتبہ "الحمدلله " پڑھنے کی غلطی کی تھی۔کسی نے آپ سے تعجب کے طور پر پوچھا یہ کیسے؟ آپ نے فرمایا بغداد کے بازار میں میری دکان تھی اس بازار میں آگ لگ گئی، اس میں زیادہ دکانیں اور گھر جل گئے لیکن میری دکان جلنے سے محفوظ رہی۔جب مجھے بتایا گیا کہ تمہاری دکان نہیں

جلی۔تو میں نے پڑھا "الحمد للہ" لیکن مجھے اس کے بعد جلدی ہی خیال آ گیا کہ مجھے اپنی دکان کے نہ جلنے کی خوشی ہوئی حالانکہ دین اور مروت کا تقاضا یہ تھا کہ مجھے دوسرے لوگوں کی دکانیں اور گھروں کے جلنے پر غمناک ہونا چاہئے تھا ان کی طرح پریشان ہونا چاہئے تھا۔بس میں یہی اپنی غلطی سمجھ کر تیس سال ہو گئے ہیں۔اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے اس جرم کو معاف فرمادے۔ (از کبیر)

سبحان اللہ بزرگان دین کا کیسا عظیم تقوی ہے کہ جسے ہم کوئی جرم نہیں سمجھتے وہ بظاہر معمولی بات کو اپنے لئے عظیم جرم سمجھ کر استغفار کرتے رہتے ہیں۔اللہ تعالیٰ بزرگانِ دین کے نقش قدم پر چلائے نیک اعمال کی توفیق عطا فرمائے۔کسی کی پریشانی پر خوش ہونا احمقوں کا کام ہے۔

الحمد للہ پڑھنے کے فضائل:

" روی ابن حاتم عن ابن عباس انه قال الحمد لله كلمة الشكر واذا قال العبد الحمد لله قال الله شكرني عبدی"

" ابن حاتم نے حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنھم) سے روایت کی کہ بیشک انہوں نے کہا الحمد للہ کلمہ شکر ہے۔ جس شخص نے الحمد للہ کہا تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے میرے بندے نے میرا شکر ادا کیا"۔

یعنی الحمد للہ پڑھنے والا رب تعالیٰ کے ہاں کتنا مقبول ہے کہ رب قدوس اس کا تذکرہ فرشتوں کے سامنے کر رہا ہے۔

☆ " روی ابن جرير عن الحكم بن عمير وكانت له صحبة قال قال النبی ﷺ اذا قلت الحمد لله رب العلمين فقد شكرت الله فزادک"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب تم نے کہا کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ"

تو تم نے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا وہ نعمت اور زیادہ کرے گا۔یعنی اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا فرمائے گا " لئن شکرتم لازيد نكم " اگر تم نے میرا شکر ادا کیا تو میں تم پر نعمتیں اور زیادہ کروں گا۔

☆ " اخرج عبد الرزاق فی المصنف والديلمی فی مسندالفردوس والبيهقی فی الادب والحكيم الترمذی فی نوادار الاصول والخطابی فی الغريب ." عن عبد الله بن عمر

وبن العاص عن رسول الله صلی الله علیه وسلم انه قال الحمد رأس الشکر ما شکر الله عبد لایحمده "

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا الحمد اصل شکر ہے جس نے اللہ کا شکر نہ کیا وہ اللہ کی حمد بھی نہیں کرتا۔

تنبیہ : پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ حمد اور شکر میں فرق بھی بیان کیا جاتا ہے لیکن مجازا کبھی ایک دوسرے پر بھی بولے جاتے ہیں۔

☆ "واخرج الترمذی وحسنه والنسائی وابن ماجه وابن حبان والبیهقی عن جابر قال قال رسول الله ﷺ افضل الذکر لا اله الا الله وافضل الدعاء الحمد لله "

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: افضل ذکر" لا اله الا الله " ہے اور افضل دعا "الحمد لله " ہے یعنی دعا کا مستحب طریقہ یہ ہے کہ دعا کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرے اور نبی کریم ﷺ پر درود پاک بھیجے۔اور دعا کے آخر میں پھر درود پاک پڑھے۔جس دعا کے اول وآخر درود شریف نہ پڑھا جائے وہ دعا معلق رہتی ہے۔

☆ " واخرج البیهقی فی شعب الایمان عن جابر قال قال رسول الله ﷺ ما من عبد ینعم علیه بنعمة الا کان الحمد افضل منها "

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی بندہ نہیں کہ اسے نعمت عطا کی جائے مگر حمد اس سے افضل ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے عظیم نعمت یہ ہے کہ کسی کو ربّ تعالیٰ حمد کرنے کی توفیق عطا فرمادے۔

☆ " واخرج مسلم والنسائی واحمد عن ابی مالک الاشعری قال قال رسول الله ﷺ الطهور شطر الایمان والحمد لله تملأ المیزان "

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پاکیزگی نصف ایمان ہے اور الحمد للہ (قیامت کے دن) میزان کو بھر دے گی۔یعنی حمد سے نیکیوں میں برکت ہوگی میزان کے وقت آسانی ہوگی حمد کی برکت سے نیکیوں والا پلڑا بھاری ہوگا۔

☆ " واخرج البیهقی عن انس قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم فی ما من احب الی الله من الحمد"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کو حمد سے زیادہ کوئی چیز پسند نہیں۔یقینی بات ہے اللہ تعالیٰ کی

محبوب چیز ہی اعلیٰ ہے اور بندے کو بھی چاہئے کہ وہ بھی اسی چیز کو محبوب سمجھے جو رب تعالیٰ کی محبوب ہے۔

☆ "واخرج مسلم عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ لیرضی عن العبد ان یاکل الاکلۃ فیحمدہ علیھا او یشرب الشربۃ فیحمدہ علیھا"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ بندے سے پسند فرماتا ہے کہ وہ کھانا کھائے تو اس کے بعد الحمد للہ پڑھے اور کوئی پینے کی چیز پئے تو اس پر حمد کرے۔غرضیکہ ہر اچھے کام میں حمد باعث برکت ہے اور حمد نہ کرنا ہے بے برکتی کی علامت ہے۔"واخرج البیھقی عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ کل امر ذی بال لا یبدأ فیہ بحمد اللہ فھو اقطع" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر اچھے کام کی ابتداء اللہ تعالیٰ کی حمد سے نہ کی جائے تو وہ بے برکت ہوتا ہے۔ (ماخوذ از تفسیر ابن کثیر)

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ: "الرب فی الاصل مصدر بمعنی التربیۃ وھی تبلیغ الشئی الی کمالہ شیأ فشیأ" رب اصل وضع میں مصدر ہے جس کا معنی تربیۃ۔یعنی ایک چیز کو آہستہ آہستہ کمال تک پہنچانا

کمال تک پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ چیز جس کے ذریعے اپنی صفات میں کامل ہو جائے۔اسی طرح قوت سے فعل کی طرف نکلنا۔لیکن خیال رہے علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے "بحسب استعدادہ الازلی" کی قید کا اضافہ کیا ہے۔یعنی رب اسے کہا جاتا ہے۔جو چیز کو اس کی ازلی استعداد کے مطابق تدریجاً۔یعنی آہستہ آہستہ کمال تک پہنچائے۔یہی معنی کامل نظر آتا ہے۔

کیونکہ انسان مختلف صفات و کمال صرف ازلی استعداد کی کمی اور زیادتی کی وجہ سے ہی رکھتے ہیں "رب" کے اور معانی یہ ہیں۔﴿خالق، سید، مالک، منعم، مصلح، معبود، صاحب﴾ لفظ "رب" اللہ تعالیٰ پر اضافت کے بغیر بھی استعمال ہوتا اور اضافت کے ساتھ بھی۔لیکن اللہ تعالیٰ کے غیر پر صرف اضافت سے استعمال ہوتا ہے جس طرح کہا جائے "رب الدار" "رب الدین" وغیرہ۔جب معنی مالک کیا جائے تو تقریباً یہ تمام معانی کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے:

"جو مالک سارے جہان والوں کا" صرف پالنے والا معنی کرنا اتنا کامل نہیں۔

(بیضاوی، حاشیۃ الشھاب، روح المعانی، مفردات راغب)

" العلمین " جمع ہے عالم کی جس کا معنی ہوتا ہے جس کے ذریعے کسی چیز کا علم حاصل ہو۔اس وزن پر آنے والا ہر لفظ اسی طرح کا معنی دے گا۔فاعل جس کے ذریعے فعل پایا جائے۔خاتم۔جس کے ذریعے کسی کو ختم کیا جائے۔اللہ تعالیٰ کے ماسوا تمام کائنات عالم ہے کہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا علم حاصل ہوتا ہے۔ (از بیضاوی)

العالمین کو جمع لانے کی وجہ:

جب تمام کائنات عالم میں داخل ہے تو جمع لانے کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف انواع،اور اقسام کے لحاظ سے جمع ذکر کیا گیا ہے۔جس طرح عالم علویات، عالم سفلیات، عالم مجردات، عالم مادیات، عالم روحانیات، عالم جسمانیات وغیرہ۔" **والعوالم کثیرة لا تحصیها الارقام** " اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں اتنے عالم ہیں کہ ان کو کوئی لکھنا چاہے تو لکھ نہیں سکتا:

" **وروی فی بعض الاخبار ان اللہ تعالیٰ خلق مائة الف قندیل وعلقها بالعرش والسموات والارض وما فیهنّ حتی الجنة والنار فی قندیل واحد ولا یعلم ما فی باقی القنادیل الا اللہ تعالیٰ** "

"بعض اخبار میں روایت آتی ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ قندیل پیدا فرمائے اور ان کو عرش سے معلق فرمایا تمام آسمان اور تمام زمینیں اور ان زمین وآسمان میں رہنے والی مخلوق یہاں تک جنت ودوزخ تمام کے علوم ایک قندیل میں ہیں باقی قنادیل میں کتنے جہانوں کو بند کیا گیا اور ان میں کتنے علوم ہیں یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے"۔ (روح المعانی)

راقم کو اچھی طرح یاد ہے کہ استاذ المحققین والمدققین استاذی المکرم حضرت علامہ مولانا ابوالحسنات محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی نے بیضاوی شریف پڑھاتے ہوئے حاشیہ عبدالحکیم رحمہ اللہ سے یہی عبارت بیان فرمائی تھی۔جو روح المعانی کے حوالہ سے ابھی بیان کی اس وقت میرے پاس زیر مطالعہ حاشیہ عبدالحکیم نہیں۔

"**وقال کعب الاحبار لایحصی عدد العلمین** " کعب اخبار نے فرمایا کہ کل کتنے عالم ہیں؟ ان کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا"**وما یعلم جنود ربک الا هو** "رب کے

لشکروں کو سوائے اس کے اور کوئی نہیں جانتا جہان میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اللہ تعالیٰ کے احاطہ قدرت میں نہ ہو اور اس کے زیر تربیت نہ ہو وہی ہر چیز کا مربی ہے " لو فرض انقطاع آثار التربية عنه آناً واحدا لما استقرله القرار ولا اطمأ نت به الدار " اگر اللہ تعالیٰ کی تربیت جہان میں سے ایک لمحہ کے لئے بھی ہٹ جائے تو جہان کا قرار ختم ہوجائے اور اطمینان ختم ہوجائے جہان میں تباہی وبربادی آجائے۔

اے غافل انسان رب کی ربوبیت کو سمجھ:

جب یہ واضح ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا رب ہے۔اس کے احسان اور اس کی ربوبیت میں اس کو کوئی شریک نہیں اس کے احسانات ان گنت ہیں۔ہم اس کے بحر جود میں تیرنے سے قاصر ہیں۔اس کے شکر کو ادا کرنے سے عاجز ہیں۔کیا خوب کہا کسی عارف باللہ نے:

" انه تعالىٰ يملك عبادا غيرک وانت ليس لک ... سواه ثم انک تتساهل فی خدمته والقيام فی وظائف طاعته " (از روح المعانی)

" بیشک اللہ تعالیٰ تیرے بغیر اور بندوں کا بھی مالک ہے لیکن اس کے بغیر تیرا اور کوئی رب نہیں۔پھر تو اس کی خدمت سے سستی کررہا ہے۔اس کی طاعت کو ادا نہیں کررہا"۔

عالمین کو جمع مذکر سالم لانے کی وجہ:

واؤ،نون اور یا،نون سے جمع ذوی العقول کی ہوتی ہے اور عالمین میں تو تمام کائنات داخل ہے جس میں غیر ذوی العقول بھی ہیں تو جمع مذکر سالم لانے کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ عقلاء کو ان کی شرافت وقدر ومنزلت کا لحاظ کرتے ہوئے غالب سمجھ کر اسطرح جمع لائی گئی اور یہی وجہ ہے کہ مذکر کو مؤنث پر بھی غالب کیا گیا ہے۔بعض حضرات نے کہا اصل میں عالم (بفتح) کا اطلاق ہی ذوی العقول پر ہے باقی ان کے تابع ہو کر اس میں داخل ہیں۔

ایک اور عجیب حکمت:

جمع مذکر سالم میں دو احتمال ہیں جمع قلت کا جو دس افراد تک بولی جاتی ہے اور جمع کثرت کا جو

دس سے اوپر تک بھی چلی جاتی ہے۔ کیونکہ جمع سالم الف لام کے بغیر جمع قلت ہے اور الف لام کے ساتھ جمع کثرت ہے۔ اس میں اس بات کی طرف انسان کو متنبہ (خبردار) کیا گیا ہے "ان العوالم وان کثرت قلیلة بل اقل من القلیل فی جنب عظمة اللہ تعالیٰ وکبریائه" بیشک جہان اگرچہ بہت زیادہ ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی کے مقابلہ میں بہت ہی قلیل ہیں۔

سبحان اللہ قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت کو انسان کیا بیان کرے ایک ایک لفظ کتنے کتنے مسائل کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

علم والوں کو پتہ ہے کہ صرف عالم کی جمع عالمین آنے سے ہی یہ ثابت ہو رہا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور یہ واضح ہو رہا ہے کہ مرد کو عورت پر افضلیت برتری حاصل ہے اور یہ پتہ چل گیا کہ جہان بہت زیادہ ہیں۔ اور یہ سمجھ آیا کہ ساری کائنات رب کے مقابل قلیل ہے رب عظمت کا مالک ہے۔

کل جہان کتنے ہیں؟

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابوالعالیہ سے رب العلمین کی تفسیر میں روایت ذکر کی ہے:

" الانس عالم والجن عالم وما سوی ذلک ثمانیة عشر الف عالَم من الملئکة وللارض اربع زوایا فی کل زاویة ثلاثة آلاف عالم وخمسمائة عالم خلقھم لعبادته " (الدر المنثور)

''انسان کا ایک جہان ہے جنوں کا ایک جہان ہے اس کے ماسوا فرشتوں کے اٹھارہ ہزار جہان ہیں اور زمین کے چار کونے ہیں ہر کونے میں تین ہزار جہان ہیں اور پانچ سو جہان اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لئے پیدا فرمائے ہیں''۔

☆ ابوالشیخ اور ابونعیم نے حلیہ میں وھب سے روایت بیان کی "ان اللہ عزوجل ثمانیة عشر الف عالم الدنیا منھا عالم واحد" (الدر المنثور) بیشک اللہ تعالیٰ نے اٹھارہ ہزار جہان بنائے دنیا کا جہان ان میں سے ایک ہے۔

حقیقت یہ ہے: "وقال کعب الاحبار لایعلم عدد العوالم الا اللہ عزوجل" (بغوی، ابن کثیر)

کعب احبار فرماتے ہیں کہ کل کتنے جہان ہیں؟ ان کی تعداد سوائے رب تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا۔

مختصر الفاظ میں تفسیر: رب العلمین:

" رب کل ذی روح رب علی وجه الارض ومن اهل السماء ویقال سید الجن والانس ویقال خالق الخلق ورازقهم ومحولهم من حال الی حال "

(تفسیر ابن عباس)

" تمام جہانوں کا رب ہے یعنی روئے زمین پر چلنے والے تمام ذی روح، آسمانوں والی تمام مخلوق کا رب ہے جنوں اور انسانوں کا مالک ہے، تمام مخلوق کا خالق ہے، تمام مخلوق کا رازق ہے، تمام مخلوق کو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف پھیرنے والا ہے "۔

رب تعالیٰ کی تربیت کی عظمت:

(۱) کبھی ایک انسان دوسرے کی تربیت کرتا ہے لیکن وہ اس میں ثواب کی یا تعریف کی امید رکھتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی تربیت میں اس کی اپنی کوئی غرض نہیں ہوتی۔ "انه تعالیٰ یربی عبیده لا لغرض نفسه بل لغرضهم" بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی تربیت کرتا ہے ان کی غرض کے لئے، نہ کہ اپنی غرض کے لئے۔

(۲) بندہ جب مال کے ذریعے کسی کی تربیت کرتا ہے۔ جتنی مقدار میں وہ کسی کو مال دیتا ہے اتنی مقدار میں اس کا مال کم ہوجاتا ہے۔ " وهو تعالیٰ عن النقصان والضرر " لیکن اللہ تعالیٰ نقصان اور ضرر سے بلند وبالا ہے۔ اس کے مال اور خزانوں میں کمی واقع نہیں ہوسکتی۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے "وان من شئیءٍ الا عند نا خزائنه وما ننزله الا بقدر معلوم" کوئی ایسی چیز نہیں مگر اس کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم اسے نہیں نازل کرتے مگر معلوم اندازے سے

(۳) بندے سے جب کوئی بار بار سوال کرے تو وہ اس پر غصہ کرتا اسے کچھ نہیں دیتا خالی لوٹا دیتا

ہے لیکن اللہ تعالیٰ سے جتنا زیادہ اور بار بار سوال کیا جائے وہ خوش ہوتا ہے اور اس پر اپنی عطا کی بارش کرتا ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا" ان اللہ تعالیٰ یحب الملحین فی الدعاء " بے شک اللہ تعالیٰ بار بار سوال کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔

(۴) بندے سے جب تک کوئی احسان کرنے کا سوال نہ کرے وہ عطا نہیں کرتا۔لیکن اللہ تعالیٰ بغیر مانگنے کے دیتا ہے۔مانگنے پر اور ہی زیادہ عطا کرتا ہے اے انسان کیا تو دیکھتا نہیں کہ وہ ذات جس نے تیری پرورش اس وقت کی جب تو ماں کے پیٹ میں تھا۔اور جب تو بے سمجھ تھا اس وقت بھی اس نے تیری پرورش کی ، تیرا کیا خیال ہے کہ وہ تجھے اب محروم کردے گا جب تجھے اس نے ہدایت دی۔عقل وسمجھ دی اور تو اس سے سوال بھی کر رہا ہے؟ یقینی بات ہے کہ وہ تجھے اس حال میں محروم نہیں کرے گا۔

(۵) بندے کا احسان اس کے محتاج وفقیر ہونے پر ختم ہو جاتا ہے۔اس کے غیب ہونے پر ختم ہو جاتا ہے اور اس کی موت پر ختم ہو جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا احسان دائمی ہے ختم ہونے والا نہیں اس لئے کہ وہ فقر واحتیاج سے پاک ہے اور اس کے غیب ہونے کا تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کہیں دور چلا جائے اس پر موت کا وقوع نہیں۔

(۶) بندوں کا احسان محدود ہوتا ہے۔وہ متعلقین پر احسان کرتے ہیں ایک قوم پر احسان کیا دوسری پر نہ کیا لیکن اللہ تعالیٰ کا احسان وسیع ہے ساری مخلوق پر وہ احسان فرماتا ہے ساری مخلوق کی وہ تربیت کرتا ہے رب تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ میری رحمت ہر چیز کو وسیع ہے۔

واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں وہ عظمت پائی جاتی ہے جو مخلوق کی تربیت میں نہیں۔وہ تمام مخلوق کا محسن ہے وہ تمام مخلوق کا رب ہے اسی لئے رب تعالیٰ نے اپنی شان میں کہا ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾

فائدہ عظیمہ: جب کوئی کسی کی مدح کرتا ہے تو اس میں چار وجہ سے کوئی ایک وجہ پائی جاتی ہے:

(۱) کبھی کسی کے کمالات ذاتیہ اور صفات ذاتیہ کو دیکھ کر مدح کی جاتی ہے اگرچہ اس کے

احسانات اس شخص پر نہ ہوں۔

(۲) کبھی اس لئے کسی کی تعریف کی جاتی ہے کہ اس کے احسانات پائے جاتے ہیں۔

(۳) کبھی تعریف کرنے والا تمنا کرتا ہے کہ اس پر وہ احسان کر دے یعنی مستقبل میں احسانات کا امیدوار ہوتا ہے۔

(۴) کبھی کسی کے رعب، دبدبہ اور اس کے قہر و غضب سے بچنے کے لئے اس کی تعریف کی جاتی ہے۔

جب تعظیم اور مدح کے یہ اسباب ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے تو گویا کہ رب تعالیٰ یوں فرما رہا ہے۔

"ان کنتم ممن یعظمونٗ الکمال الذاتی فاحمدونی فانی الہ العلمین " اگر تم وہ لوگ ہو جو کسی کے کمالات ذاتیہ کو دیکھ کر اس کی عظمت بیان کرتے ہو تو میری ہی حمد بیان کرو۔ بیشک میں " الہ العلمین " ہوں "الحمدللہ" سے یہی مراد ہے۔

"وان کنتم ممن یعظمون الاحسان فانا رب العلمین " اگر تم ان لوگوں سے ہو جو کسی کے احسانات کو دیکھ کر اس کی عظمت بیان کرتے ہیں تو میری حمد کرو کیونکہ میں "رب العلمین" ہوں۔

" وان کنتم تعظمون للطمع فی المستقبل فانا الرحمن الرحیم "

" اگر تم مستقبل میں احسانات کے طمع پر عظمت بیان کرتے ہو تو میری حمد کرو میں رحمٰن ورحیم ہوں"۔

" وان کنتم تعظمون للخوف فانا مالک یوم الدین "

" اگر تم خوف کی وجہ سے عظمت بیان کرتے ہو تو میری حمد کرو کیونکہ میں مالک یوم الدین ہوں"۔

☆☆☆☆☆☆

﴿ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾

''بہت مہربان ، رحمت والا''

''نہایت مہربان، رحم کرنے والا''

بسم اللہ شریف کی بحث میں کافی حد تک الرحمٰن الرحیم کے متعلق بیان کیا جاچکا ہے۔ مختصر ذکر یہاں بھی کیا جارہا ہے پہلے جو ذکر کیا اس کا خلاصہ اتنا ذہن میں رہے کہ الرحمٰن میں عام رحمت ہے وسیع تر رحمت ہے بنسبت رحیم کے اور "الرحمن" اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے لیکن "الرحیم" کا اطلاق انبیاء کرام اور دوسرے رحم کرنے والوں پر بھی صحیح ہے۔

☆ "قال ابن مبارک الرحمن اذا سئل اعطی و الرحیم اذا لم یسئل یغضب "
ابن مبارک کہتے ہیں رب تعالیٰ رحمٰن اس لئے ہے کہ جب اس سے سوال کیا جائے وہ عطا کرتا ہے۔ اور رحیم اس لئے ہے کہ اگر اس سے سوال نہ کیا جائے تو وہ ناراض ہوتا ہے۔

☆ ابن مبارک کا یہ قول اس حدیث کے مطابق ہے جو ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی آپ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
" من لم یسئل اللہ یغضب " جو شخص اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوتا ہے۔ (مشکوۃ کتاب الدعوات، ابن کثیر)

اسی حدیث کی شرح میں علامہ علی قاری رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں .
" لان ترک السوال تکبر و استغناء وھذا لایجوز للعبد
والمراد بالغضب ارادة ایصال العقوبة " (مرقاة)

اس لئے کہ رب تعالیٰ سے سوال نہ کرنا تکبر ہے اور رب تعالیٰ سے اپنے آپ کو بے پرواہ کرنا ہے یہ بندے کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے آپ کو مولائے کائنات سے بے پرواہ سمجھے، رب تعالیٰ کے ناراض ہونے کا یہ مطلب ہے کہ دعا نہ کرنے والے نہ مانگنے والے کو وہ عذاب دے گا۔

☆ ابن مبارک کا قول اس حدیث کے مطابق بھی ہے جو ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ

رضی اللہ عنہ سے روایت کی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" لیس شئی اکرم علی اللہ من الدعاء "

''اللہ تعالیٰ کو دعا سے زیادہ کوئی چیز پسند نہیں''۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ قاری رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں:

" من الدعاء ای من حسن السوال بلسان القال او ببیان الحال لان فیه اظهار العجز والافتقار والتذلل والانکسار والاعتراف بقوة الله وقدرته وغناه واغنیانه وکبریانه " (مرقاۃ کتاب الدعوات)

'' دعا اللہ کے ہاں مکرم کیوں ہے؟ اس لئے کہ دعا میں اچھی طرح سوال ہوتا ہے زبان سے یا دل سے اور دعا کرنے والا انسان اپنی احتیاجی اور انکساری اور عجز وکمتری کا اظہار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی قوت وقدرت، غنی ہونے، غنی کرنے اور اس کی کبریائی کا اعتراف کرتا ہے''۔

☆ ابن مبارک کا قول اس حدیث کے بھی مطابق ہے جو ترمذی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: " سلوا الله من فضله فان الله یحب ان یسئل وافضل العبادة انتظار الفرج" (مشکوۃ کتاب الدعوات) اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کا ذکر کرو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے کہ اس سے سوال کیا جائے۔ افضل عبادت کشادگی کا انتظار ہے۔

''(فان الله) ای لا تصافه بانه کریم منعم وهاب معط غنی مغن باسط '' (مرقاۃ)

اللہ تعالیٰ کو کیوں پسند ہے کہ اس سے سوال کیا جائے؟ اس لئے کہ وہ کریم ہے انعام عطاء کرنے والا ہے غنی ہے غنی کرنے والا ہے کشادہ رزق کا مالک ہے:

''سبحان اللہ، الرحمن الرحیم''

کی یہ تفسیر اگر سمجھ آجائے تو سارے مسئلے حل ہو جائیں اور سارے جھگڑے ختم ہو جائیں۔ یعنی جنازہ کے بعد دعا فرض نماز کے بعد دعا تمام نماز کے فارغ ہونے کے بعد اجتماعی دعا، جمعرات کو ختم قرآن دعا، سوئم پر دعاء، چہلم پر دعاء سب جائز ہیں۔ اس لئے کہ رب تعالیٰ سے بار بار دعا کریں تو وہ خوش ہوتا ہے۔ اس سے نہ مانگیں تو وہ ناراض ہو جاتا ہے۔ اب خود فیصلہ کریں کہ رب تعالیٰ کو راضی

رکھتا ہے یا ناراض۔خاص کر کے جب انسان کو یہ معلوم ہو جائے یقین حاصل ہو" کہ اللہ تعالیٰ کریم ہے، اللہ تعالیٰ انعام عطا کرنے والا ہے، اللہ تعالیٰ غنی ہے، اللہ تعالیٰ غنی کرنے والا ہے، کشادہ رزق کا مالک ہے "۔تو اسے اللہ تعالیٰ سے مانگنے میں کوئی شرم نہیں آئے گی۔بلکہ وہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ سے زیادہ مانگے گا کیونکہ وہ ایسی صفات کا مالک ہے کہ ان صفات میں کوئی اس کا شریک نہیں۔جب دینے والے کی رحمت میں کوئی کمی نہیں تو لینے والے کو اپنی حماقت سے اپنے دامن کو تنگ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

رب تعالیٰ کے اندازِ رحمت کو وہ خود ہی جانتا ہے:

خالق کائنات، مالک دنیا و آخرت، رب قدوس علیم وحکیم ہے اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں انسان انجام سے بے خبر ہونے کی وجہ سے اس کی حکمت کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے رب تعالیٰ کیسے رحمت فرماتا ہے؟ ذرا اس کی جھلک دیکھئے۔

☆ حضرت ابراھیم ادھم رحمہ اللہ ایک بار کسی دعوت پر مدعو ہوئے، دستر خوان بچھایا گیا کھانا اس پر سجایا گیا مہمان آ کر بیٹھے ہی تھے کہ ایک کوا آیا اور ایک روٹی اٹھا کر چلتا بنا۔حضرت ابراہیم ادھم ایک بزرگ، ولی اللہ تھے انہوں نے کوے کے روٹی اٹھا کر لے جانے کی حکمت کو سمجھنے کی کوشش کی۔آپ اس کے پیچھے پیچھے چلے کہ دیکھیں یہ کہاں جاتا ہے اور روٹی سے کیا کام لیتا ہے۔آپ نے دیکھا اس کوے نے روٹی کو ایک وادی میں پھینک دیا دیکھا کہ وہاں ایک شخص کو باندھ کر قید کیا ہوا ہے۔روٹی اس کے منہ کے پاس گری جس نے روٹی کو کھانا شروع کیا۔تو ابراہیم ادھم رحمہ اللہ نے سمجھا کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوسکتا اس کی رحمت کے انداز وہی جانے بندہ جانے تو کیا جانے؟

☆ حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں ایک دن گھر میں بیٹھا ہوا تھا میرے دل میں اضطراب پیدا ہوا، میں دل بہلانے کے لئے دریائے نیل کی طرف چلا گیا۔میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا بچھو بھاگتا ہوا جارہا ہے، دریا کے کنارے ایک مینڈک کی پیٹھ پر سوار ہوگیا، وہ مینڈک دریا میں چلا گیا یہ کہتے ہیں کہ میں بھی ایک کشتی پر سوار ہوگیا۔وہ مینڈک دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچا تو بچھو اس

کی پیٹھ سے اتر کر پھر تیز چلنے لگا میں بھی پیچھے پیچھے چل کر ماجرا دیکھ رہا تھا۔ دیکھا کہ آگے ایک بہت بڑا اژدھا ہے اس سے کچھ فاصلے پر ایک آدمی درخت کے نیچے سویا ہوا ہے۔ بچھو نے اژدھا کو کاٹا اور اژدھا نے بچھو کو کاٹا، یہ دونوں مر گئے لیکن وہ شخص جو درخت کے نیچے سویا ہوا تھا اللہ تعالیٰ نے اسے محفوظ رکھا حضرت ذوالنون اس واقعہ کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ رب تعالیٰ کی رحمت کے انداز انوکھے ہی ہیں۔

☆ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ کوے کا بچہ جب انڈے کے خول سے باہر آتا ہے تو اس کے پر نہیں ہوتے وہ سرخ گوشت کا ٹکڑا نظر آتا ہے۔ اسے اس حال میں دیکھ کر اس کی ماں بھاگ جاتی ہے چونکہ وہ خوف زدہ ہو جاتی ہے کہ یہ کیا چیز ہے۔ اس حال میں جب اس بچے کی پرورش کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ تو اس کی پرورش رب تعالیٰ کس انداز پر کرتا ہے؟ رب تعالیٰ اس کی پرورش کا انتظام یوں فرماتا ہے کہ اس کے اردگرد مچھر جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ مردہ جانور کا گوشت کا ٹکڑا ہے۔ جب مچھر اس کے پاس آتے ہیں تو وہ انکو اپنا لقمہ بنا لیتا ہے

یہی اس کی غذا ہوتی ہے جب اس کے پر نمودار ہو جاتے ہیں تو اس کی ماں بھی اس کی طرف لوٹ کر آ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی حضرات کی دعاؤں میں ایک دعا کے اندر یہ الفاظ بھی آئے ہیں "یارازق النعاب فی عشه؟" اے رزق دینے والے کوے کے بچے کو اس کے گھونسلے میں۔

(نعاب بتشد یدالعین وضم النون کوے کا بچہ، عش بضم العین وتشدید الشین گھونسلہ)

" فظهر بهذه الامثلة ان فضل الله عام واحسانه شامل ورحمته واسعة "

''ان مثالوں سے ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا فضل عام ہے اور اس کا احسان ہر کسی پر ہے اور اس کی رحمت وسیع ہے''۔ (از کبیر)

رب تعالیٰ کی طرف سے مصائب کو رحمت سمجھے:

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ہم اپنے روزمرہ کے معمولات کو دیکھیں تو بات بخوبی سمجھ آ جائے گی۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے بچوں کو سکول نہ بھیجے دینی مدرسہ میں نہ بھیجے کسی قسم کے کھیل کود سے نہ روکے جس قسم کے لڑکے ان کے ساتھ کھیلیں وہ ان کو یہ نہ کہے کہ فلاں لڑکا اچھا ہے

اس کے ساتھ کھیلو فلاں برا ہے اس کے ساتھ نہ کھیلو۔ان کے کسی قول وفعل پر ان کی سرزنش نہ کرے۔ان کو ادب نہ سکھائے ان کی صحیح تربیت نہ کرے بظاہر یہ شفقت ورحمت ہے لیکن درحقیقت ان پر زیادتی ہے۔اور اگر ضرورت پر سرزنش کرے،ان کو تعلیم دلائے،انکو ادب سکھائے،بظاہر یہ ان پر زیادتی اور سختی ہے۔گرمیوں،سردیوں میں مکتب میں جانا،بھاری بستہ اٹھانا،ڈانٹ ڈپٹ یہ چیز درحقیقت اس کی زندگی میں مستقبل میں نفع مند ہونے کی وجہ سے اس کے لئے رحمت ہے۔

بلاتشبیہ اب اصل مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کریں اس دنیا میں بظاہر محنت،مصیبت،مشقت اور درد کئی چیزوں میں معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے اور وہ چیزیں حکمت کے تقاضا کے مطابق ہوتی ہیں۔یہ ظاہری تکالیف انسان کے لئے باعث ثواب اور مدارج کی بلندی کا سبب بنتی ہے۔اس پر رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کو دیکھیں۔

☆ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "من یرد اللہ بہ خیرا یصب منہ" (بخاری،مشکوۃ باب عیادۃ المریض)

اللہ تعالیٰ جس پر مہربانی کا ارادہ فرماتا ہے۔اسے رب تعالیٰ کی طرف سے تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے بیان فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

" ما یصیب المسلم من نصب ولا وصب ولا ھم ولا حزن ولا اذی ولا غم حتی الشوکۃ یشاکھا الا کفر اللہ بھا من خطایاہ "

(بخاری،مسلم،مشکوۃ باب عیادۃ المریض)

کسی مسلمان کو جو تھکن،بیماری،بے چینی،حزن،اذیت اور غم پہنچے اس سے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو مٹاتا ہے۔یہاں تک کہ اگر اسے کانٹا بھی چبھے وہ بھی اس کے گناہوں کا کفارہ بنتا ہے۔

واضح ہوا کہ تکالیف جب گناہوں کا کفارہ بنتی ہیں تو یقینا وہ باعث رحمت ہیں، یوں سمجھیں کہ ثواب،رحمت کے مقابل تکالیف بہت معمولی ہیں ان تکالیف کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔اسی وجہ سے کہا جاتا ہے "ان ترک الخیر الکثیر لاجل الشر القلیل شر کثیر"معمولی تکلیف کی وجہ سے

بہت بڑے ثواب کو چھوڑ دینا بہت بری بات ہے۔ (از کبیر)

مقصد تکالیف: تکالیف سے مقصود حقیقت میں جسمانی کدورتوں سے روحوں کو پاک کرنا ہوتا ہے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ﴾ اگر تم بھلائی کرو گے تو وہ تمہارے اپنے بھلے کے لئے ہوگی۔ آگ کے پیدا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ خوف دلا کر برے لوگوں کو نیک لوگوں کے اعمال کی طرف لایا جائے اور رب تعالیٰ سے دور بھاگنے والوں کو اس کے حضور لایا جائے جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا "ففروا الی اللہ" اللہ تعالیٰ کی طرف بھاگ کر آؤ۔ (از کبیر)

الرحمٰن کو الرحیم سے پہلے ذکر کرنے میں حکمت:

بظاہر عقل کا تقاضا یہ ہے کہ جب "الرحمن" میں رحمت عامہ کا ذکر ہے اور "الرحیم" میں رحمت خاصہ کا۔ تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ ادنیٰ (کم رحمت والے) کو اعلیٰ (زیادہ رحمت والے) سے پہلے ذکر کیا جاتا کیونکہ ضابطہ یہ ہے کہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف انتقال ہوتا ہے۔ لیکن یہاں عجیب حکمت پائی گئی ہے کہ بڑے منصب والوں سے معمولی حقیر چیز کا مطالبہ نہیں کیا جاتا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کوئی شخص کسی بڑے آدمی کے پاس گیا کہ میں آپ کے پاس کسی معمولی کام کے لئے آیا ہوں تو اس نے کہا "اطلب للمهم اليسر رجلا يسيرا" معمولی کام کے لئے معمولی آدمی ہی تلاش کرو۔ گویا کہ بندہ اپنی توہین سمجھتا ہے کہ میں بڑا ہوں۔ مجھ سے چھوٹی چیز کا مطالبہ کیوں کیا جارہا ہے۔ لیکن رب تعالیٰ نے پہلے اپنی رحمت عامہ کا ذکر فرمایا کہ مجھ سے ہر شخص مانگے ہر کچھ مانگے ہر چھوٹی چیز، بڑی چیز مجھ سے مانگو دنیا کی بھلائی مجھ سے طلب کرو، آخرت کی بھلائی کا سوال مجھ سے ہی کرو۔ کیونکہ میں "رحمن" ہوں لیکن انسان نظام دنیا کی خبر رکھتا ہے۔ اس لئے ہوسکتا تھا کہ چھوٹی چیز مانگنے سے شرم محسوس کرتا کہ وہ تو عظیم ذات ہے اس سے چھوٹی چیز کا مطالبہ کیسے کروں حالانکہ رحمٰن میں یہ ذکر ہو چکا تھا کہ ہر چھوٹی اور بڑی چیز کا مطالبہ مجھ سے کرو۔ لیکن لوگوں کی غلط فہمی کو دور کر دیا کہ مجھے عظیم سمجھ کر یہ نہ خیال کر بیٹھنا کہ مجھ سے چھوٹی چیزوں کا سوال کرنے سے میں ناراض ہوتا ہوں بلکہ یوں خیال کر:

" كما علمتني رحمانا تطلب مني الامور العظيمة ،فانا ايضا رحيم

فاطلب مني شراک نعلک وملح قدرک"

جیسے تو مجھے رحمٰن سمجھ کر مجھ سے بڑے بڑے کاموں کا مطالبہ کرتا ہے اسی طرح یہ بھی سمجھ کہ میں رحیم ہوں مجھ سے اپنے جوتے کا تسمہ بھی مانگ اور مجھے سے اپنی ہنڈیا کے لئے نمک بھی مانگ۔

جس طرح رب تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا " یا مُوسٰی سلنی عن ملح قدرک وعلف شاتک " اے موسیٰ مجھ سے اپنی ہنڈیا کے لئے نمک کا سوال کرو اور مجھ سے اپنی بکری کے لئے چارہ بھی طلب کرو۔ (از کبیر)

نصیحت عظیمہ: روایت میں آتا ہے کہ ایک جوان موت کے قریب تھا۔اس کی زبان پر کلمہ " لا الہ الا اللہ " جاری نہیں ہو رہا تھا کچھ حضرات نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس صحابی کے معاملہ کی خبر دی۔آپ تشریف لائے اس صحابی کے سامنے کلمہ شریف پڑھا " وھو یتحرک ویضطرب ولایعمل لسانہ " وہ حرکت کرتے ہیں مضطرب ہوتے ہیں ۔ان کی زبان کام نہیں کرتی۔

نبی کریم ﷺ نے پوچھا کیا یہ شخص نماز ادا کرتا تھا؟ کیا یہ شخص روزہ رکھتا تھا؟ کیا یہ شخص زکوٰۃ دیا کرتا تھا؟ وہاں موجود حضرات نے جواب دیا ہاں یارسول اللہ یہ تمام کام تو وہ کیا کرتا تھا۔پھر آپ نے فرمایا کیا یہ والدین کا نافرمان تو نہیں تھا؟ آپ کو بتایا گیا ہاں یارسول اللہ (یہ اپنی ماں کا نافرمان تھا) آپ نے فرمایا اس کی ماں کو بلاؤ وہ آ گئی بوڑھی عورت تھی اس کی ایک آنکھ ضائع تھی۔نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا، کیا تو اسے معاف نہیں کرتی اس نے عرض کیا "لااعفو لانہ لطمنی ففقأ عینی " میں اسے معاف نہیں کرتی اس لئے کہ اس نے ایک مرتبہ مجھے تھپڑ مار کر میری آنکھ کو ضائع کر دیا تھا۔

حضور ﷺ نے فرمایا۔لکڑیاں اور آگ لے آؤ۔

اس عورت نے پوچھا، یارسول اللہ آپ آگ اور لکڑیوں کو کیا کریں گے۔آپ نے فرمایا:

" احرقہ بالنار بین یدیک جزاء لما عمل بک "جو اس نے تمہارے ساتھ سلوک کیا ہے اس کے بدلہ میں میں اسے آگ میں جلانا چاہتا ہوں۔

ماں نے کہا "عفوت عفوت" میں نے اسے معاف کردیا، میں نے معاف کردیا۔ کیا میں نے آگ کے لئے اسے نو ماہ پیٹ میں اٹھایا تھا؟ کیا میں نے اسے آگ کے لئے دو سال دودھ پلایا تھا۔

"فاین رحمة الام ؟ فعند ذلک انطلق لسانه و ذکر اشهد ان لا اله الا الله " کہاں ماں کی رحمت؟ اسی وقت اس کی زبان پر جاری ہوا "اشهد ان لا اله الا الله "

علامہ رازی رحمہ اللہ اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں، ماں صرف رحیمہ ہے رحمانہ نہیں، اور اسے رحمت بھی معمولی حاصل ہے، اس نے قلیل رحمت کے باوجود اپنے بیٹے کو جلانے کی اجازت نہیں دی۔ رب تعالیٰ کی وہ ذات ہے جو اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ رحیم بھی ہے رحمٰن بھی ہے وہ کیسے پسند کرے گا کہ اپنے اس بندے کو آگ میں ہمیشہ جلائے جس نے ایمان قبول کیا اور کلمہ شہادت پر ہمیشہ قائم و دائم رہا۔ (از کبیر)

خیال رہے اس صحابی کا نام تحفہ نصائح میں علقمہ ذکر کیا گیا یہ واقعہ کہیں اور نظر سے نہیں گزرا۔ تاہم اپنی قلت علمی اور قلت مطالعہ کا اعتراف ہے کہاں علامہ رازی رحمہ اللہ اور کہاں میرے جیسا ہیچ مدان۔

فائدہ جلیلہ: نبی کریم ﷺ کا احد میں جب دانت کا کچھ شہید ہوگیا اور آپ کا چہرہ مبارک زخمی ہوگیا۔ تو صحابہ کرام نے آپ کو کفار کے ہلاک و برباد ہونے کی دعا کے متعلق کہا آپ نے یہ دعا فرمائی "اللهم اهد قومی فانهم لا یعلمون " اے اللہ تعالیٰ میری قوم کو ہدایت دے بیشک یہ نہیں جانتے۔

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آپ قیامت کے دن فرمائیں گے "امتی ، امتی" اے اللہ میری امت کو بخش دے۔ "فهذا کرم عظیم منه فی الدنیا و الآخرة " آپ کا یہ کرم عظیم ہے دنیا اور آخرت میں آپ کے اس احسان عظیم کی وجہ اصل میں یہ ہے کہ آپ تمام جہانوں کے لئے رحمت ہیں۔

رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾

" ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر سب جہانوں کے لئے رحمت بنا کر"۔

" فاذا کان اثر الرحمة الواحدة بلغ هذا المبلغ فکیف کرم من هو رحمن رحیم " نبی کریم ﷺ صرف رحیم ہیں رحمٰن نہیں ہیں جب ایک رحمت کا یہ عظیم مقام ہے تو اس ذات کی رحمت کا کیا مقام ہوگا۔ جو رحمٰن بھی ہے، اور رحیم بھی ہے۔

توجہ فرمائیں : نبی کریم ﷺ کی رحمت کا اندازہ کریں کہ آپ نے ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کیا:

"اللهم اجعل حساب امتی علی یدی" اے اللہ میری امت کا حساب میرے ہاتھ میں کر دے۔لیکن دوسرے رخ کو بھی دیکھئے کہ آپ نے ایک شخص کا جنازہ پڑھانے سے اس لئے انکار فرما دیا تھا کہ وہ دو درھم کا مقروض تھا۔صرف اس لئے کہ لوگ قرض لے کر ادا کرنے کی کوشش بھی کریں۔ورنہ صحابہ کرام کو نماز جنازہ ادا کرنے کا حکم دیا تھا اسی طرح ایک مرتبہ اپنی ازواج مطہرات سے ایک ماہ تک بائیکاٹ فرما دیا تھا کیونکہ انہوں نے زیادہ خرچ کا مطالبہ کیا تھا۔جسے نبی کریم ﷺ نے ناپسند فرمایا تھا۔کیونکہ نبی کی بیویوں کو صبر وشکر سے کام لینا چاہئے۔

اس کی وجہ یہ ہی تھی کہ آپ ﴿ وَمَا اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴾ کے مصداق ہونے کے باوجود ایک رحمت کے مالک تھے یعنی رحیم تھے، رحمان نہیں تھے اس لئے شریعت میں رخنہ اندازی آپ کے لئے قابل برداشت نہیں ہوتی تھی اگرچہ آپ اپنی ذاتی تکالیف کو برداشت کر کے کبھی انتقام نہیں لیتے تھے۔

لیکن رب تعالیٰ رحمٰن بھی ہے رحیم بھی اس کی رحمت کی کوئی حد نہیں۔مومن بندے جب رب کے بندے ہیں اگرچہ ان میں کچھ گنہگار بھی ہیں لیکن ان کے گناہوں کی کچھ حد بھی ہے۔جب ان کے محدود گناہ رب تعالیٰ کی رحمت کے غیر محدود سمندر میں گریں گے تو وہ فنا ہو جائیں گے۔اگر معمولی سرزنش ہوئی بھی تو انشاء اللہ سونے کی طرح نکھر کر آب وتاب سے جنت میں پہنچ جائیں گے کیونکہ وہ رحمٰن ورحیم کی رحمت سے فائدہ حاصل کر چکے ہوں گے۔ (ماخوذ از کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾

(۱)''روزِ جزا کا مالک'' (۲) ''جزا کے دن کا مالک''

مالک : اس لفظ میں چار لغات ہیں ایک تو یہی ''مالک'' دوسری ملک (میم کی زبر لام کی زیر سے) تیسری ملک (میم کی زیر اور لام کے سکون سے) اور چوتھی ملیک (قرطبی) زیادہ مشہور اس میں پہلی دو صورتیں ہیں عاصم، کسائی اور یعقوب نے مالک پڑھا ہے انہوں نے اپنی قراءت پر دلیل اس آیت کو بنایا ﴿ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْأً ﴾ کچھ دوسرے قراء نے ''ملک'' پڑھا ہے۔ انہوں نے بطور دلیل یہ آیت پیش کی ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ﴾ (از بیضاوی) اگرچہ دونوں لفظ اپنے معنی میں مشترک ہیں "متصرف فی الامور" یعنی جسے تصرف کرنے کا حق حاصل ہوتا ہم دونوں حضرات نے اپنی اپنی قراءت کی فوقیت پر دلائل قائم کیے ہیں۔

''مالک'' پڑھنے کی افضلیت پر دلائل:

(۱) مالک میں چار حرف ہیں۔ اور ملک میں تین۔ جس میں حرف زائد ہوں اس کے پڑھنے میں ثواب زیادہ ہوتا ہے۔

(۲) قیامت میں بادشاہ تو کئی ہوں گے لیکن وہ ذات جس کو جزاء کے دن کامل حق حاصل ہوگا وہ مالک ہی ہوگا یہ حق صرف رب تعالیٰ کو ہی حاصل ہوگا۔

(۳) مالک وہ ہوتا ہے جسے عام تصرف حاصل ہو۔ بادشاہ محافظ اور مدبر تو ہوتا ہے لیکن قومی خزانہ کا مالک نہیں ہوتا اس لحاظ پر بھی مالک پڑھنے میں افضلیت پائی جاتی ہے بنسبت ملک (بادشاہ) کے۔

(۴) ملک (بادشاہ) کی بادشاہت کا تعلق رعیت سے ہوتا ہے۔ لیکن مالک کا تعلق غلاموں سے ہوتا ہے بادشاہ کا رعیت پر اتنا قہر اور دبدبہ نہیں ہوتا۔ جتنا کہ مالک کا اپنے غلاموں پر قہر اور تسلط ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی مالک والی قراءت افضل ہے بنسبت ملک والی قراءت سے۔

(۵) رعیت کبھی اپنے اختیارات کو استعمال کر کے اپنے آپ کو بادشاہ سے آزاد بھی کرالیتی

ہے۔لیکن غلام کوایسی طاقت کبھی حاصل نہیں ہوتی کہ وہ اپنے اختیارات سے اپنے آپ کو مالک سے آزاد کرالے۔

واضح ہوا کہ مالک کو بنسبت ملک کے زیادہ قہر حاصل ہے۔ذات باری تعالیٰ کو بھی جب سب سے زیادہ قہر و دبدبہ حاصل ہے تو اس کے لئے لفظ مالک ہی زیادہ مناسب ہے۔

(۶) ملک (بادشاہ) کے لئے ضروری ہے کہ وہ رعیت کے حال کی رعایت کرے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "کلکم راع و کلکم مسؤل عن رعیته" "تم میں سے ہر شخص رعیت رکھنے والا ہے اور تم میں سے ہر شخص سے رعیت کے متعلق سوال ہوگا۔لیکن رعیت پر واجب نہیں کہ وہ بادشاہ کی خدمت کرے۔

" ولا یجب علی الرعیة خدمة الملک "

لیکن مملوک (غلام) پر لازم ہے کہ وہ مالک کی خدمت کرے۔وہ مولیٰ کی اجازت کے بغیر اپنے معاملات میں مستقل کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔وہ قاضی نہیں بن سکتا۔وہ امام نہیں بن سکتا۔(یعنی غالباً غلام جاہل ہوتا ہے اس لئے اس کی امامت مکروہ ہوتی ہے اگر عالم ہو تو اس کی امامت بغیر کراھیت کے جائز ہے)اس کی گواہی قبول نہیں۔مولیٰ سفر کی نیت کرے تو وہ خود ہی مسافر بن جاتا ہے اور مولیٰ اقامت کی نیت کرے تو وہ مقیم ہو جاتا ہے۔

ابھی تک جو دلائل قائم کئے ہیں ان سے واضح ہو گیا کہ مالک کو افضلیت حاصل ہے ملک پر لہٰذا "مالک" پڑھنا افضل ہوگا۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لئے وہی لفظ استعمال کیا جائے جس میں اس کا کامل رعب، دبدبہ اس کے بندوں کا اس کے حکم کے تابع ہونا چون و چرا نہ کرسکنا اس کے بندوں کا اس کا عبادت گزار ہونا سمجھ آئے وہ لفظ مالک ہی ہے۔

"ملک" کی قراءت کی افضلیت پر دلائل:

(۱) ہر شہر میں ہر شخص کسی نہ کسی چیز کا مالک ہوتا ہے۔لیکن ملک (بادشاہ) ہر ایک نہیں ہوتا۔بلکہ کوئی بڑا شخص اور اعلیٰ شخص ہوتا ہے۔اس سے پتہ چلا کہ ملک اعلیٰ ہے مالک سے لہٰذا رب تعالیٰ کے

لئے بھی لفظ ملک ہی استعمال کیا جانا بہتر ہے۔

(۲) تمام قراء کا اتفاق ہے کہ ﴿ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ ﴾ میں لفظ ملک ہی متعین ہے اگر ملک اعلیٰ نہ ہوتا مالک سے تو یہاں کیوں متعین ہوتا اور تمام قراء کا اتفاق نہ ہوتا۔

(۳) ملک مختصر لفظ ہے اور مالک اسکے بڑا لفظ ہے زندگی کا پتہ نہیں کہ کبھی سانس آنا ختم ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اتنی زندگی ہو کہ تین لفظ ادا کر سکے اور چار نہ ادا کر سکے۔ تو ملک مکمل ادا کر سکے گا لیکن مالک ادا کرتے ہوئے لام تک پہنچے گا یعنی مال تک ادا کرنے سے زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ تو بہتر یہ ہے کہ ملک کو فضلیت دی جائے مالک پر۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کا شاندار محاکمہ:

" ثم نقول انه يتفرع على كونه ملكا احكام وعلى كونه مالكااحكام اخر "

اللہ تعالیٰ ملک بھی ہے اس لحاظ پر اس کی طرف اور احکام منسوب ہوتے ہیں۔ اور مالک بھی ہے اس لحاظ پر اس کی طرف اوراحکام منسوب ہوتے ہیں۔ یعنی جب دونوں قراء توں پر عظیم المرتبۃ قراء ہیں۔ تو دونوں قراء تیں درست ہیں دونوں کو ملا کر جو ذیشان نتیجہ نکلے گا۔ اس میں کمال، ذوق، چاشنی عجیب انداز ہوں گے۔

جن احکام کا تعلق ہے ملک ہونے سے:

(۱) سیاست کی چار قسمیں ہیں:

سیاست ملاک، سیاست ملوک، سیاست ملائکہ، سیاست ملک الملوک۔ سیاست ملوک (بادشاہوں کی سیاست) میں زیادہ قوت وطاقت پائی جاتی ہے بنسبت سیاست ملاک (مالکوں کی سیاست) کے۔ کیونکہ اگر سارے مالک جمع ہو جائیں تو ایک بادشاہ سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔

ایک اور وجہ سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ملک کو مالک پر برتری حاصل ہے۔ کیونکہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مالک اپنے مملوک (غلام) کو حد نہیں لگا سکتا۔ لیکن اس پر اجماع امت ہے کہ بادشاہ کو لوگوں پر حد لگانے کی ملکیت حاصل ہے۔

☆ سیاست ملائکہ (فرشتوں کی سیاست) کو سیاست ملوک پر فضلیت اور فوقیت حاصل ہے کیونکہ سارے جہان کے بادشاہ ایک طرف ہوجائیں تو وہ ایک فرشتے سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ملک الملوک (بادشاہوں کے بادشاہ مراد اللہ تعالیٰ) کی سیاست فرشتوں کی سیاست سے اعلیٰ اور کامل، افضل واکمل ہے رب تعالیٰ کے ارشادات سے یہ بہت واضح ہے۔﴿ یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰئِکَۃُ صَفًّا لَّا یَتَکَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَہُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴾ جس دن جبریل کھڑا ہوگا اور فرشتے صف بنا کر کوئی نہیں بول سکے گا سوائے اس کے کہ جسے رحمٰن نے اجازت دی اور اس نے ٹھیک بات کہی۔

یعنی قیامت کے دن رب تعالیٰ کی اجازت کے بغیر تمام فرشتے بات کرنے کی طاقت نہیں رکھیں گے یہاں تک کہ جبرائیل بھی اگر رب تعالیٰ نے اجازت دے دی تب ہی وہ کوئی بات کرسکیں گے اور اسی وقت وہ درست بات کرسکیں گے۔ ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ﴾ وہ کون ہے جو اس کے ہاں سفارش کرے اس کے حکم کے بغیر۔

یعنی رب تعالیٰ کے ہاں سفارش کرنے کے لئے جلیل القدر حضرات یعنی انبیاء کرام اور فرشتے اس کی اجازت اور اس کے حکم کے منتظر ہوں گے۔ مالک الملک نے فرشتوں کے متعلق ہی یہ فرمایا ﴿ وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی وَھُمْ مِّنْ خَشْیَتِہٖ مُشْفِقُوْنَ ﴾ اور شفاعت نہیں کرتے مگر اس کے لئے جسے وہ پسند فرمائے اور وہ اس کے خوف سے ڈر رہے ہیں۔ بادشاہوں اور ان کی رعایا کو اللہ تعالیٰ کے جزا کے دن ملک (بادشاہ) ہونے کے متعلق گویا کہ ان الفاظ سے بتایا گیا:

" یاایھا الملوک لاتفتروا بما لکم من المال والملک فانکم اسراء فی قبضۃ مالک یوم الدین ویاایھا الرعیۃ اذا کنتم تخافون سیاسۃ الملک افما تخافون سیاسۃ ملک الملوک الذی ھو مالک یوم الدین "

" اے بادشاہو! اپنے مال اور بادشاہت پر ناز نہ کرنا کہیں مال و دولت اور بادشاہت کے گھمنڈ کی وجہ سے رب تعالیٰ سے غافل نہ ہوجانا۔ تم تمام اس کے قبضہ قدرت میں ہو اور ہر وقت یہ بات ذہن میں رکھنا کہ وہ مالک یوم الدین ہے۔ اے بادشاہوں کی رعیت لوگو جب تم بادشاہ کی سیاست سے ڈرتے ہو تو تم اس ذات کی سیاست سے کیوں نہیں ڈرتے جو ملک الملوک (بادشاہوں کا بادشاہ ہے) ہے اور وہ جو مالک یوم الدین ہے"۔

(۲) اور حکم جس کا تعلق ملک سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسا بادشاہ ہے کہ کوئی بادشاہ اس سے مشابہت کا

تصور نہیں کرسکتا۔اس لئے کہ دنیا کے بادشاہ جب کسی کو کوئی مال دیں تو ان کے خزانوں میں کمی آ جاتی ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ وہ بادشاہ ہے کہ اس کے ملک میں عطا اور احسان سے کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ۔ بلکہ وہ جتنا زیادہ عطا کرتا ہے اس کی بادشاہت میں اتنی ہی زیادتی ہوتی ہے۔اس مسئلہ کو ایک مثال سے سمجھئے اللہ تعالیٰ کسی شخص کو جب ایک بچہ عطا کرے تو اس کے احکام کا تعلق اس ایک بچہ سے ہوگا۔اور اگر دس عطا کرے تو اس کے احکام کا تعلق دس سے ہوگا۔دس ہی اس کے اوامر ونواہی کے مکلّف ہوں گے۔اس سے واضح ہوا کہ جتنی اس کی عطا زیادہ ہوتی چلی جاتی ہے اس کی بادشاہت میں اتنی ہی وسعت زیادہ ہوتی چلی جاتی ہے۔

(۳) ایک اور حکم جس کا تعلق اس کے ملک ہونے سے ہے۔وہ یہ ہے کہ بادشاہ کی بادشاہت کا تعلق رحمت سے ہے۔بادشاہ میں جتنی رحمت زیادہ ہوگی اتنا ہی زیادہ اس کی بادشاہیت میں کمال ہوگا۔جب اللہ تعالیٰ کو رحمت کاملہ ،رحمت عظیمہ حاصل ہے تو وہ سب بادشاہوں کا بادشاہ ہے اس کی بادشاہت میں وہ کمال ہے جو کسی اور کو حاصل نہیں رب تعالیٰ کی رحمت کاملہ پر کئی دلیلیں ہیں۔ان میں سے ایک تو ماقبل بیان کی ہوئی تفسیر کو دیکھیں کہ وہ رب ہے وہ رحمٰن ہے اور وہ رحیم ہے کتنی زیادہ اس میں رحمت ہے؟اس کو مختصر انداز میں پہلے ذکر کیا جاچکا ہے۔

☆ اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ﴾ وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ ہر غیب اور ظاہر کو جاننے والا وہی ہے بڑا مہربان رحم کرنے والا۔ پھر اس کے بعد فرمایا ﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِکُ﴾ وہی اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ بادشاہ ۔ پھر اس کے بعد ذکر فرمایا ﴿اَلْقُدُّوْسُ﴾ وہ نہایت پاک یعنی وہ ظلم اور جور سے پاک ہے۔پھر اس کے بعد ذکر فرمایا ''السَّلَامُ '' وہ سلامتی دینے والا یعنی اس کے بندے اس کے ظلم کا تصور کرنے سے بھی سلامتی میں ہیں۔یعنی اس کا ظلم کرنا تو درکنار یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ظلم کرتا ہے پھر فرمایا ﴿ اَلْمُؤْمِنُ ﴾ وہ امان بخشنے والا۔یعنی اللہ کے بندے اس کے ظلم سے امن میں ہیں۔کیونکہ وہ ظلم نہیں کرتا یہ ذہن میں لانا بھی ممکن نہیں کہ وہ ظلم کرتا ہے۔اس بحث سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہی کامل ملک (بادشاہ) ہے کیونکہ کامل رحمت اسے ہی حاصل ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ کی رحمت کاملہ پراور دلیل یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا﴿ اَلْمُلْکُ یَوْمَئِذِن الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ﴾ اس دن سچی بادشاہی رحمٰن کی ہے۔ جب رب تعالیٰ نے اپنی بادشاہت کا ذکر فرمایا تو اس سے وہم ہوسکتا تھا کہ شائد اسے دنیا کے عام بادشاہوں کی طرح صرف قہر ہی حاصل ہوگا۔ تو اس وہم کو زائل کرنے کیلئے اس کے بعد اپنے رحمٰن ہونے کا ذکر کیا تا کہ خوف جاتا رہے اور معلوم ہوجائے کہ اسے رحمت کاملہ حاصل ہے۔

☆ رب تعالیٰ کی رحمت کاملہ پراور دلیل یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِکِ النَّاسِ ﴾ تم کہو میں اس کی پناہ میں آیا جو سب لوگوں کا رب سب لوگوں کا بادشاہ۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے اپنے بادشاہ ہونے اور رب ہونے کو ایک جگہ ذکر کر کے بتایا کہ میں رب ہوں رب وہی ہے جو بہت مہربان اور رحم کرنے والا ہے اسی وجہ سے گویا کہ رب تعالیٰ نے اپنی کامل بادشاہت کا بھی ذکر فرمادیا۔ ابھی تک جو دلائل پیش کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو کامل رحمت حاصل ہے اور کمالِ رحمت کی وجہ کمالِ بادشاہت حاصل ہے اس سے یہ نتیجہ واضح ہوا :

" یا ایھا الملوک اسمعوا ھذہ الآیات وارحموا ھؤلاء المساکین ولاتطلبوا مرتبۃ زائدۃ فی الملک علی ملک اللہ تعالیٰ "

اے بادشاہو! ان آیات کو سن لو اور ان مسکینوں پر رحم کرو تم اپنی بادشاہت میں اللہ تعالیٰ کی بادشاہت سے زیادہ مطالبہ نہ کرو یعنی تم رب تعالیٰ سے بڑے بادشاہ نہیں۔ تمہاری بادشاہت اس کی بادشاہت سے بڑی نہیں تو پھر تم رحم کیوں نہیں کرتے۔

(۴) اور حکم جس کا تعلق ملک سے ہے۔ رعیت پر بادشاہ کی فرمانبرداری لازم ہے۔ اگر رعیت کے لوگ اس کی اطاعت نہ کریں تو قتل وغارت کا بازار گرم ہوجائے۔ اضطراب اور پریشانی حاصل ہو۔ جہان میں تخریب کاری نمودار ہوجائے نظام عالم برباد ہوکر رہ جائے۔ مخلوق فنا ہوجائے۔ جب تم آئے دن مشاہدہ کررہے ہو کہ مجازی بادشاہ کی مخالفت بربادی اور مخلوق کے تباہ ہونے کا سبب ہے تو دیکھو کہ بادشاہ حقیقی بادشاہوں کے بادشاہ کی مخالفت کے اثرات مصلحت کے زوال اور فسادات کے حصول میں کتنے واقع ہوں گے۔ رب تعالیٰ نے کفر کو جہان کی بربادی کا سبب قرار دیا۔﴿ تَکَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ ھَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴾ قریب

ہے کہ آسمان اس سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر جائیں ڈھ کر اس پر کہ انہوں نے رحمٰن کے لئے اولاد بتائی۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی اولاد ثابت کرنا کفر ہے اور کفر کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کی بربادی کا سبب بیان کیا گیا ہے اور اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو مصلحت کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَأْمُرْ اَهْلَکَ بِالصَّلٰوۃِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَانَسْأَلُکَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُکَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْتَقْوٰی ﴾ اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دے اور خود اس پر ثابت رہ کچھ ہم تجھ سے روزی نہیں مانگتے ہم تجھے روزی دیں گے۔ اور انجام کا بھلا پرہیزگاری کے لئے۔

یعنی اے انسان تیرا نماز قائم کرنا اور گھر والوں کو بھی نماز کا حکم دینا تیرے لئے رزق کا ذریعہ ہے اور اس کا انجام اچھا ہوگا واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ فرمانبرداری بھلائی کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہے۔ نتیجہ یہ حاصل ہوا کہ گویا کہ بادشاہوں کو یوں کہا گیا ہے۔" یاایھا الملوک کونوا مطیعین لملک الملوک حتی تنظم مصالح العالم " اے بادشاہو تم بادشاہوں کے بادشاہ کے مطیع ہوجاؤ تاکہ نظام عالم درست رہے۔

(۵) ایک اور حکم جس کا تعلق ملک سے ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت ملک یوم الدین بیان کر کے گویا کہ اپنے کامل عدل کو بیان فرما دیا اور اپنے ظلم نہ کرنے کو ان الفاظ مبارکہ سے بیان فرمایا ﴿وَمَارَبُّکَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيْدِ﴾ اور آپ کا رب بندوں پر ظلم نہیں فرماتا اور اپنے عدل کی کیفیت کو یوں بیان کیا ﴿ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا﴾ ہم انصاف کے میزان رکھیں گے۔ قیامت کے دن کسی نفس پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

جب یہ بات واضح ہے کہ مجازی بادشاہ عادل ہو تو اسے بادشاہ حق کہا جاتا ہے۔ اور اگر عدل نہ کرے تو وہ باطل بادشاہ جھوٹا، فراڈی کہلاتا ہے۔ زبان سے کہتا بھی رہے کہ عدالتیں کام کر رہی ہیں انصاف ہوگا۔ انصاف ہو رہا ہے۔ اس کذاب، غاصب، لیٹرے، قانون کی دھجیاں بکھیرنے والے کی بات کو کون مانے گا۔ جب اس نے ڈنڈے کے زور پر ججوں کو اپنا ہم نوا بنالیا ہو عدل کا نام ونشان نہ ہو۔

اگر بادشاہ حق پر قائم ہو۔عادل ہوتو اس کے عدل کی برکت کی وجہ سے جہان میں خیروبرکت ،راحت وآرام،سکون وچین ہوتا ہے اور اگر بادشاہ ظالم ہوتو جہان سے خیروبرکت اٹھ جاتی ہے۔جب ہر طرف لوگ ظلم کی چکی میں پس رہے ہوں۔لوگوں سے ٹیکس لے کر خود گلشرے اڑائے جارہے ہوں۔لوگوں کو بے روزگار کیا جارہا ہو مساجد کوڈھایا جارہا ہو۔دینی مدارس کے خلاف منصوبے بنائے جارہے ہوں۔اور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد "اتقوا دعوة المظلوم"...... (مظلوم کی بددعا سے بچ کررہو)...... کی طرف دھیان نہ کیا جارہا ہوتو یہ لوگ انشاء اللہ اپنے برے انجام کو پہنچیں گے۔ہاں ان شاء اللہ جلدی کیونکہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے۔﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ اور ہرگز اللہ تعالیٰ کو غافل نہ سمجھو جو ظالم عمل کررہے ہیں۔

بادشاہ کے ظلم کے فقط ارادہ سے ہی نحوست آجاتی ہے:

بیان کیا جاتا ہے کہ نوشیرواں ایک دن شکار کیلئے نکلا۔اپنے گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے آگے نکل گیا۔اس کالشکر پیچھے رہ گیا اور اس پر پیاس کا غلبہ ہوا تو یہ ایک باغ میں گیا وہاں انار کے درختوں کو دیکھا جو بچہ وہاں باغ میں تھا اسے کہا مجھے ایک انار دے دو۔اس نے ایک انار دے دیا۔نوشیرواں نے اسے توڑا دانے نکال کران کارس نچوڑا۔رس کافی مقدار میں نکلا۔اس نے پیا،اسے وہ انار عجیب سالگا ،کیونکہ اس نے پہلے اتنا رس بھرا انار کبھی نہیں دیکھا تھا۔دل میں ارادہ کیا کہ یہ باغ مالک سے لے لیا جائے۔باغ میں موجود بچے سے اس نے پھر ایک اور انار مانگا۔اس نے ایک اور انار دے دیا۔اسے جب نچوڑا اس میں سے بہت تھوڑا رس نکلا۔وہ کڑوا جسے پینا دشوار ہوگیا۔نوشیروان نے بچے سے پوچھا یہ کیسا انار ہے؟ بچے نے جواب دیا شائد ہوسکتا ہے کہ ہمارے ملک کے بادشاہ نے ظلم کا ارادہ کرلیا ہے۔تو اس کے ظلم کی نحوست سے یہ انار اس طرح ہوگیا یعنی رس کم ہوگیا ذائقہ کڑوا اور ضرررساں ہوگیا۔نوشیرواں نے دل ہی دل میں اپنے اس ظلم سے توبہ کرلی جو وہ اس باغ کو زبردستی مالک سے لینا چاہتا تھا۔اس نے بچے کو پھر کہا مجھے ایک اور انار دے دو اس نے ایک اور انار دے دیا جب اسے نچوڑا گیا۔تو پہلے انار سے بھی اس میں زیادہ رس اور ذائقہ اس سے بھی زیادہ اچھا اور میٹھا پایا گیا۔نوشیرواں نے اس بچے سے پوچھا یہ انار اس حال میں کیسے تبدیل ہوگیا؟ بچے نے جواب

دیا" **لعل ملک البلد تاب عن ظلمه** " ہوسکتا ہے کہ ہمارے ملک کے بادشاہ نے اپنے ظلم کے ارادہ سے توبہ کر لی ہو۔جب نوشیرواں نے بچے کا کلام سنااور اسے اپنے دل کے حال کے مطابق پایا۔یعنی جس طرح اس کا ارادہ بدلتا رہا اسی طرح انار کا حال بدلتا رہا۔تو اس نے ظلم سے مکمل طور پر توبہ کر لی۔

" فلاجرم بقی اسمه مخلدا فی الدنیا بالعدل " (از کبیر)

" یہی وجہ ہے کہ یقیناً اس کا نام رہتی دنیا تک عدل وانصاف کے طور پر زندہ رہے گا"۔

اس واقعہ سے حاصل ہونے والے فوائد:

نوشیرواں نے بچے کو یہ نہیں بتایا تھا کہ میں اس ملک کا بادشاہ ہوں ۔نوشیرواں نے اپنے دل میں ارادہ کیا تھا۔اس پر بچے کو مطلع نہیں کیا تھا۔بادشاہ نے ظلم کا ارادہ کر کے بھی دیکھ لیا تھا۔اوراس سے سچے دل سے توبہ کر کے بھی دیکھ لیا تھا کہ بچہ سچ کہہ رہا ہے۔بچہ کسی نیک گھرانے کا تربیت یافتہ تھا،نیک تھا،صاحب علم تھا بلکہ کسی کو نصیحت کرنے میں اس کی اس وقت کوئی نظیر نہ تھا۔بادشاہ عقل مند تھا،سمجھ گیا، توبہ کر لی ہمارے زمانہ کے بادشاہوں کی طرح نہیں تھا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے ان کو جھنجوڑا بھی جائے لیکن ان کو ہوش نہ آئے۔ظلم کا بازار اس وقت تک گرم رکھتے ہیں جب تک ان کو ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹ کر باہر نہ نکالا جائے۔ظلم کی نحوست کا کیا حال ہوگا ۔جب صرف ظلم کے ارادہ کی نحوست سے باغ کے پھلوں پر یہ اثر ہوگیا تھا۔

یقیناً ظلم کرنے سے نظام عالم برباد ہوکر رہ جاتا ہے۔تخریب کاری کے اڈے قائم ہوجاتے ہیں۔قتل وغارت کا بازار گرم ہوجاتا ہے۔

اور بچے کے کہے ہوئے سنہری جملے یاد رکھنے کے قابل ہیں پہلا جملہ یہ ہے" **لعل ملک البلد عزم علی الظلم فلاجل شؤم ظلمه صار الرمان هكذا** " شائد ملک کے بادشاہ نے ظلم کا ارادہ کرلیا ہے اس کی نحوست کی وجہ سے انار اس طرح ہوگیا۔اوراس کا دوسرا جملہ یہ تھا" **لعل ملک البلد تاب عن ظلمه** " شائد ملک کے بادشاہ نے اپنے ظلم سے توبہ کر لی ہو۔

مالک کی طرف منسوب ہونے والے احکام:

یعنی ایک قراءت میں مالک یوم الدین ہے اس لحاظ پر علیحدہ احکام حاصل ہوتے ہیں۔اور جس قراءت میں ''ملک'' پڑھا گیا اس لحاظ پر علیحدہ احکام ہیں۔جن کو ذکر کیا جاچکا ہے:

(۱) مالک سے زیادہ امید کی جاسکتی ہے جو ملک (بادشاہ) سے نہیں۔اس لئے کہ بادشاہ سے زیادہ سے زیادہ عدل وانصاف کا مطالبہ کر کے جان بچائی جاسکتی ہے۔یعنی کسی انسان کی نجات کے لئے عدل وانصاف کی درخواست کی جاسکتی ہے۔لیکن مالک کا غلام اس سے طعام طلب کرتا ہے۔لباس طلب کرتا ہے رحمت اسی سے چاہتا مالک ہی اس کی پرورش کرتا ہے ہر قسم کی اس کی تربیت کرتا ہے یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے گویا کہ یہ کہتا ہے اے میرے بندو ''انا مالککم فعلی طعامکم وثیابکم وثوابکم وجنتکم'' میں تمہارا مالک ہوں میں ہی تمہیں طعام عطا کرنے والا ہوں۔کپڑے تمہیں میں ہی دیتا ہوں۔تمہاری عبادات نیکیوں پر ثواب عطا کرنا میرے قبضہ قدرت میں ہی ہے۔جنت عطا کرنے والا میں ہی ہوں۔

(۲) ملک اگرچہ مالک سے بے پرواہ ہوتا ہے لیکن پھر بادشاہ کو رعایا سے طمع ہوتی ہے کہ یہ میرے موافق رہیں۔رعایا پر مظالم ڈھانے والے رعایا کو اپنا مخالف بنانے والے تھوڑے ہی عرصہ میں چلتا بنتے ہیں۔لیکن مالک وہ ہے کہ غلام اس میں طمع رکھتا ہے مالک کو غلام کے راضی ہونے کی تمنا نہیں ہوتی۔اور نہ ہی مالک غلام سے کسی چیز کے حاصل کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔قیامت کے دن رب تعالیٰ کو ہماری عبادات،طاعات،خیرات کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ ہمیں یہ ضرورت ہوگی کہ رب تعالیٰ سے ہم درگزر کرنے،مغفرت کرنے اور اپنے فضل سے جنت عطا کرنے کی خواہش رکھیں گے۔یہی وجہ ہے کسائی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ پڑھتا ہوں کیونکہ یہ قراءت اللہ تعالیٰ کے کثیر فضل اور اس کی وسیع رحمت پر دلالت کرتی ہے۔

(۳) بادشاہ اپنے لشکر کے لئے قوی بدن،صحیح مزاج،بہادر لوگوں کا انتخاب کرتا ہے۔ضعیف مریض،جسمانی کمزور لوگوں کو دھتکار دیتا ہے۔ان کو اپنے لشکر میں بھرتی کر کے تنخواہ دینے کا اس سے

تصور ممکن نہیں۔لیکن مالک اپنے مریض غلام کا علاج کراتا ہے۔اگرضعیف ہو تو اس کی امداد کرتا ہے۔اگر مصیبت میں ہو تو اسے خلاصی دلاتا ہے۔اس لئے ''مالک'' پڑھنے میں گناہگاروں اور مسکینوں کے لئے تسلی ہے کہ وہ مالک ہے کسی کو اپنے در سے دور نہیں کرتا۔

(۴) ملک (بادشاہ) کو ہیبت اور دبدبہ حاصل ہوتا ہے۔لیکن مالک مہربان اور رحم کرنے والا ہوتا ہے۔ہم رحمت اور مہربانی کے زیادہ محتاج ہیں۔ہیبت اور رعب اور دبدبہ کی ہمیں اتنی احتیاج نہیں۔اس سے بھی واضح ہوا کہ ''مالک'' پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔

نتیجہ واضح ہوا کہ وہ ملک بھی ہے، مالک بھی ہے۔ملک ہونا اور حیثیات سے ہے اور مالک ہونا اور حیثیات سے ہے۔دونوں قراءتوں پر جلیل القدر قراء ہیں۔ہر قراءت کے مطابق مولائے کائنات کی شان ہی شان نظر آتی ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

مالک تو ہمیشہ مالک ہے یوم الدین کی تخصیص کیوں؟

اللہ تعالیٰ جب ہمیشہ کے لئے مالک ہے تو پھر ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ (جزا کے دن کا مالک) کہنے کا کیا مطلب ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں کئی اور بھی دعویدار ہیں کہ ہم بھی مالک ہیں۔ہم بھی بادشاہ ہیں۔جیسے فرعون اور نمرود نے صرف مالکیت اور بادشاہت کے دعوی پر اکتفا نہیں کیا تھا۔بلکہ خدا ہونے کا بھی دعوی کر بیٹھے۔لیکن قیامت کے دن تمام خدائی کے دعویداروں کے دعوے ختم ہو جائیں گے۔کوئی بادشاہی کا دعویدار نہیں ملے گا کوئی مالکیت کا دعوی کرتا ہوا نظر نہیں آئے گا۔سب رب تعالیٰ کے حضور سر جھکائے ہوں گے۔اس کی بادشاہت میں کسی کا تنازع نہیں ہوگا۔اسی لئے رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ﴾ یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ پوچھے گا آج کس کی بادشاہی ہے؟ تمام مخلوق جواب دے گی ﴿لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ صرف اللہ واحد وقہار کی۔ (از قرطبی)

فائدہ جلیلہ: نبی کریم ﷺ کا ارشاد بھی ایک، رب تعالیٰ کے ارشاد ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ سے مطابقت رکھتا ہے۔

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" انا سید ولد ادم یوم القیمة ولا فخر وبیدی لواء الحمد ولا فخر وما من نبی یومئذ ادم فمن سواہ الا تحت لوائی " (مشکوة باب فضائل سید المرسلین)

میں تمام انسانوں کا قیامت کے دن سردار ہوں گا اس پر کوئی فخر نہیں۔ میرے ہاتھ میں لواء الحمد ہوگا اس پر کوئی فخر نہیں اس دن تمام نبی، آدم علیہ السلام اور ان کے سواء میرے جھنڈے کے نیچے ہی ہوں گے۔

تشریح حدیث : علامہ ہروی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" السید هو الذی یفوق قومه فی الخیر " سیّد اسے کہتے ہیں جو قوم پر ہر قسم کی بھلائی میں فوقیت رکھتا ہو۔ اور دیگر جمہور اھل علم فرماتے ہیں:

" السید هو الذی یفزع الیه فی النوائب والشدائد فیقوم بامورهم ویتحمل عنهم مکارههم ویدفعها عَنْهُمْ "

سید اسے کہتے ہیں جس کی طرف قوم اپنے مصائب و آلام میں پناہ پکڑے وہ ان کی حاجات کو پورا کرے خود مشقتیں برداشت کر کے ان کی تکالیف کو دور کرے۔

سبحان اللہ کسی کو اگر صرف سید کا معنیٰ پتہ چل جائے اور یہ پتہ ہو کہ حضور ﷺ سید الکائنات ہیں۔ تو اسے یہ بات خود سمجھ آجائے کہ حضور ﷺ رب تعالیٰ کی عطا کردہ طاقت سے حاجت روا ہیں۔

اعتراض: نبی کریم ﷺ نے قیامت کے دن کا ذکر فرمایا کہ مجھے قیامت کے دن سرداری حاصل ہوگی حالانکہ آپ کو دنیا میں بھی تمام پر سرداری حاصل ہے پھر قیامت کے دن کے ذکر کا کیا مطلب؟

جواب: " ان فی یوم القیمة یظهر سوددہ لکل احد ولا یبقی منازع ولا معاند "

بیشک قیامت کے دن آپ کی برتری تمام پر ظاہر ہوجائے گی کوئی جھگڑا کرنے والا جھگڑا نہیں کرے گا۔ اور کوئی شخص عناد نہیں کرے گا۔ (نووی، مرقاة)

کیونکہ دنیا میں کفار مشرکین نے آپ کی فضیلت کو تسلیم نہیں کیا۔ دنیا میں اگرچہ بہت لوگ آپ کے وسیلہ جلیلہ کے بغیر براہ راست خدا تک رسائی حاصل کرنے کے دعویدار ہیں۔ لیکن قیامت کے دن

تمام کو ہی حبیب پاک علیہ التحیۃ والثناء کا وسیلہ تلاش کرنا پڑیگا۔ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق ہے کہ قیامت کو رب تعالیٰ پوچھے گا۔ "لمن الملک الیوم" آج کس کی بادشاہی ہے تو مخلوق جواب دے گی "للہ الواحد القھار" اللہ واحد وقہار کی، اور ایک قول یہ بھی ہے۔ کہ مخلوق سر جھکائے جواب دینے کی طاقت نہیں رکھے گی رب تعالیٰ خود ہی اس کا جواب بھی دے گا۔ (از نووی)

تنبیہ: کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ اس حدیث سے نبی کریم ﷺ کی افضلیت اولاد آدم پر تو ثابت ہو رہی ہے لیکن خود آدم علیہ السلام پر آپ کی افضلیت ثابت نہیں ہو رہی۔ ذہن میں واقع ہونے والے اس وہم کے دو جواب دئے گئے ہیں۔

پہلا جواب: "فانھم یستعملون ولد آدم بمعنی نوع الانسان" (نبراس) عربی زبان والے حضرات "ولد آدم" کو بمعنی نوع انسان لیتے ہیں۔ یعنی عام محاورہ کے مطابق صرف اولاد آدم معنی نہیں۔ بلکہ تمام انسان مراد ہیں۔ جن میں آدم علیہ السلام بھی ہیں اس طرح اب معنی یہ ہوگا کہ "تمام انسانوں پر مجھے فضلیت حاصل ہے۔"

دوسرا جواب: "ان للحدیث تتمۃ موضحۃ للمطلوب وھو قولہ علیہ السلام وما من بنی یومئذ آدم فمن سواہ الا تحت لوائی" (نبراس)

یعنی دوسرا جواب یہ ہے کہ مطلب کو واضح کرنے کے لئے حدیث پاک کے آخری الفاظ سے تکمیل ہو رہی ہے کہ آدم علیہ السلام اور آپ کے سواء تمام ہی میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔ یعنی تمام انسان بمع انبیاء کرام میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔ اس سے واضح ہو رہا ہے۔ کہ جب آدم علیہ السلام کو بھی قیامت کے دن میرے پیارے نبی کریم ﷺ کی احتیاجی ہوگی تو یقیناً آپ کو آدم علیہ السلام پر بھی افضلیت حاصل ہوگی۔

ولا فخر کا مطلب: "ولا فخر ای ولا اقولہ تفاخرا بل اعتدادا بفضلہ وتحدثا بنعمتہ وتبلیغا لما امرت بہ"

یعنی میں یہ فخر کے طور پر نہیں بیان کر رہا بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور نعمت کو بیان کرنے کے لئے ذکر کر رہا ہوں اور جس چیز کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ میں وہ امت کو پہنچانے کے لئے ذکر کر رہا

ہوں۔"وامتثالا لامر اللہ تعالیٰ واما بنعمة رَبّکَ فحدث "آپ نے اپنے مراتب اللہ تعالیٰ کے حکم کی تابعداری کرتے ہوئے بیان فرمائے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا﴿وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّث﴾ اپنے رب کی نعمتوں کو خوب بیان کرو۔یعنی آپ نے اپنی سرداری کو لوگوں کے سامنے فخر کے طور پر نہیں بیان کیا بلکہ آپ کے بیان کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ آپ پر لازم تھا کہ اپنا مقام ومرتبہ امت کے سامنے بیان کریں تا کہ امت کو آپ کا مقام معلوم ہوجائے۔دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ رب تعالیٰ کا آپ پر انعام تھا کہ آپ کو تمام انسانوں پر فضیلت دی۔اور رب تعالیٰ نے خود اپنی نعمتوں کے بیان کرنے چرچا کرنے کا حکم بھی دیا۔

"مالک یوم الدین" میں حکمت:

واجبات کی دو قسمیں ہیں۔ حقوق اللہ، حقوق العباد......

حقوق اللہ میں معافی کا امکان پایا جاتا ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام جہانوں سے بے پرواہ ہے۔اگر وہ چاہے تو اپنے حقوق معاف فرما دے۔لیکن حقوق العباد کو معاف نہیں فرمائے گا بلکہ ان کا بدلہ دلائے گا۔قیامت کے دن ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دے دی جائیں گی اگر اس کا حق پورا ہو گیا تو بہتر نہیں تو مظلوم کے گناہ ظالم کے پلڑے میں ڈال دیئے جائیں گے۔دنیا میں ظالم سے انتقام مظلوم کو بادشاہ حکام کبھی تو عجز کی وجہ سے نہیں دلا سکتے۔کبھی جہالت کی وجہ سے اور کبھی وہ ظلم پر راضی ہوتے ہیں۔یعنی وہ چمچوں سے مخلصین پر ظلم کرا کے اپنی فرعونیت کو ثابت کرتے ہیں۔لیکن افسوس کہ وہ فرعون کے انجام کو نہیں دیکھتے ایک دن آتا ہے دیکھتے ،دیکھتے فرعون ذلیل ہوجاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان تینوں چیزوں سے پاک ہے اس لئے قیامت کے دن مظلومین کے لئے ظالموں سے ضرور انتقام لے گا۔اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ وہ ذات﴿مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ ہے ہر اچھائی اور برائی کی جزا عطا کرے گا۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور حقوق العباد:

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ کے تقوی کی ایک جھلک دیکھیں اور اس تقوی کے اثرات

دیکھیں۔ اور یہ سمجھیں کہ آپ نے حقوق العباد کا کیسے خیال کیا۔

امام صاحب نے ایک مجوسی سے کچھ قرضہ لینا تھا۔ ایک مرتبہ آپ اس کے گھر گئے تا کہ اس سے اپنے قرضہ کا مطالبہ کریں۔ جب آپ اس کے گھر کے دروازے پر پہنچے۔ تو آپ کے نعلین میں سے ایک نعل کو نجاست لگ گئی۔ آپ نے جب نعلین کو جھاڑا۔ تو وہ نجاست مجوسی کی دیوار پر لگ گئی۔ آپ اس معاملہ کو دیکھ کر بہت حیران ہیں کہ کروں تو کیا کروں اگر نجاست کو مجوسی کی دیوار پر رہنے دوں تو دیوار گندی نظر آئے گی۔ اور اگر نجاست کو دیوار سے کھرچتا ہوں تو دیوار کی مٹی بھی گرے گی۔ آپ نے مجوسی کا دروازہ کھٹکایا ایک غلامہ باہر آئی۔ آپ نے اسے کہا کہ اپنے مالک کو جا کر بتاؤ دروازے پر ابو حنیفہ کھڑا ہے وہ مجوسی باہر آیا اس نے سمجھا کہ آپ اپنا قرض لینے کے لئے آئے ہیں۔ اس نے عذر پیش کرنا شروع کیا حیلے، بہانے بنانے لگا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ اب تو ایک اور معاملہ درپیش ہے۔ آپ نے اس سے دیوار کا معاملہ بتایا اور فرمایا "**وانہ کیف السبیل الی تطہیرہ**" اس دیوار کو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ یعنی مقصد یہ تھا کہ اگر یہ اجازت دے دے تو دیوار سے کھرچ کر نجاست کو ہٹایا جائے۔ لیکن مجوسی نے امام صاحب کی بات کو سن کر کہا "**فانا ابدأ بتطہیر نفسی فاسلم فی الحال**" میں پہلے اپنے نفس کو پاک کر لوں یہ کہتے ہوئے اسی وقت اسلام قبول کر لیا۔

اس واقعہ کے بیان سے نکتہ یہ بیان کرنا ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے جب مجوسی پر ظلم سے اجتناب کیا۔ (حالانکہ بظاہر یہ معمولی بات تھی) تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے ظلم سے بچنے کی برکت سے مجوسی کو ایمان کی دولت عطا فرما دی۔ تو جو شخص ظلم سے بچے گا اس کا قیامت کے دن رب تعالیٰ کے ہاں کتنا عظیم مرتبہ ہوگا۔ یعنی قیامت کے دن اس کے ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ کے جلوے ظاہر ہوں گے یہ سب آنکھوں دیکھا حال ہوگا۔

کسی کی نیکی بھی ضائع نہیں ہوگی:

قیامت کے دن ایک شخص کو اللہ تعالیٰ کے دربار میں لایا جائے گا۔ وہ اپنے اعمال کی طرف نظر کرے

گا۔تو اسے کوئی نیکی نظر نہیں آئے گی۔اسی حال میں اسے ایک آواز آئے گی اے فلاں شخص تو اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں داخل ہوجا۔وہ شخص تعجب سے عرض کرے گا۔اے اللہ میری کون سے نیکی ہے؟ جواب آئے گا ایک مرتبہ تو سویا ہویا تھا تو نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا تھا"اللہ" تو پھر سو گیا تھا، تجھے بھول گیا لیکن مین سوتا نہیں مجھے اونگھ نہیں آتی مجھے کوئی چیز بھولتی نہیں مجھے تیری نیکی یاد ہے۔

لیکن یہ خیال رہے یہ فضل کی بات ہے یہ رب تعالیٰ کی مشیت ہے کہ معمولی نیکی سے مومن کو بخش دے لیکن اے انسان رب تعالیٰ کے عدل اور قہر سے بھی غافل نہ رہ اگر ایک ایک گناہ کی جزا دی گئی تو مشکل ہوگی۔اس حال کو بھی نہ بھول صرف فضل کو دیکھتے دیکھتے کہیں نیکیوں سے دور رہ کر اپنی عاقبت کے انجام خیر کو گنوا نہ بیٹھنا۔

فائدہ: رب تعالیٰ نے اپنے پانچ نام ذکر فرمائے۔"اللہ ، رب ، الرحمن ، الرحیم ، مالک"اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ گویا کہ یوں ارشاد فرمارہا ہے:

" خلقتک اولا فانا اله ثم بربیتک بوجوه النعم فانا رب ثم عصیت فسترت علیک فانا رحمن ثم تبت فغفرت لک فانا رحیم ثم لا بد من ایصال الجزاء الیک فانا مالک یوم الدین "

"میں نے تمہیں پہلے پیدا کیا کیونکہ میں اللہ ہوں پھر میں نے مختلف نعمتوں سے تمہاری تربیت کی اس لئے کہ میں رب ہوں پھر تو نے نافرمانی کی میں نے تیری پردہ پوشی کی میں رحمٰن ہوں پھر تو نے توبہ کی میں نے تیری مغفرت کی اس لئے کہ میں رحیم ہوں پھر ضروری ہے کہ میں تجھے جزا عطا کروں اس لئے کہ میں مالک یوم الدین ہوں"۔

تنبیہ: تمام اعمال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے بندے کو اللہ تعالیٰ نے اعمال کا اختیار دے رکھا ہے۔بندہ اپنے اختیار سے اچھے یا برے عمل کرتا ہے۔رب تعالیٰ نے نیکیوں پر اچھی جزا اور برائیوں پر بری جزا کا بھی اعلان فرمارکھا ہے۔برے کام کا کسب برا ہے برے اعمال کی تخلیق بری نہیں۔اللہ تعالیٰ جزا کے دن کا مالک ہے کوئی اس سے بھاگ نہیں سکے گا۔

☆☆☆☆☆

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ

(۱) ''ہم تجھی کو پوجیں اور تجھی سے مدد چاہیں''

(۲) ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں''

غیب سے خطاب کی طرف التفات:

اس سے پہلے تمام اسم ظاہر ذکر کئے گئے ہیں جو غیب کا درجہ رکھتے ہیں۔ جس کے متعلق بات ہو اسے ''غیب'' کہا جاتا ہے" **الحمد لله ، رب العلمین ، الرحمن ، الرحیم ، مالک یوم الدین** '' تمام درجہ غیب میں ہیں۔ یہاں خطاب شروع ہو گیا "**ایاک نعبد و ایاک نستعین**'' ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی امداد طلب کرتے ہیں۔اس میں کئی وجوہ ہیں:

(۱) عربی حضرات کی عادت ہے کہ وہ غیب سے خطاب ،خطاب سے غیب وغیرہ ذکر کرتے ہیں۔ تا کہ سامع توجہ کرے غور وفکر کرے ،چست ہو کر رہے اسی طرح بلا توجہ نہ گزر جائے۔

(۲) متکلم کے خصوصی اظہار فن کا مظاہرہ بھی ہوتا ہے کہ وہ علم معانی کی التفات کی تمام قسموں سے باخبر ہے۔

(۳) غیب سے شہود کی طرف انتقال پایا جاتا ہے گویا کہ جو پہلے فقط معلوم تھا وہ اب سامنے ہے اور جو غیب تھا وہ حاضر ہو گیا۔

(۴) گویا کہ جو پہلے برھان سے ذہن میں لایا جار ہا تھا اب وہ سامنے ہے یعنی برہان (دلیل) سے عیان کی طرف ترقی پائی گئی۔

(۵) سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا ذکر جب الحمد للہ سے کرتا ہے۔اور تمام آفاق اور نفوس میں تفکر کرتا ہے اسے ایک ہی ذات مولائے کائنات کی رب العلمین نظر آتی ہے وہ جب بار بار توجہ کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے وہ رحمٰن ہے اور رحیم ہے۔پھر جب یہ خیال کرتا

ہے کہ مومنین پر سب سے زیادہ اس کی رحمت قیامت میں پائی جائے گی۔تو وہ سمجھتا ہے کہ وہ

مالک یوم الدین ہے۔

ان صفات میں غور وفکر سے اسکی صفت ،اس کی عظمت شان ،اور اس کی غالب سلطنت کو جب پہچان لیتا ہے ،اور اس تک پہنچنے کے لئے وہ معرفت کے سمندر میں غوطہ زن ہوتا ہے۔تو اہل مشاہدہ سے ہوجاتا ہے اب وہ اپنے آپ کو اس درجہ میں سمجھتا ہے کہ گویا کہ میں رب تعالیٰ کو ظاہر ظاہر دیکھ رہا ہوں۔" **اللھم اجعلنا من الواصلین الی العین دون السامعین للاثر**"(بیضاوی مع حاشیۃ الشھاب مدارک)

یا اس طرح کہا جائے: مقام ولایت کی منازل کو طے کرنے والا ، راہ سلوک پر چلنے والا ، جب اپنے نفس کا تزکیہ کرتا ہے اور اپنے دل کے آئینہ کو روشن وصاف کرلیتا ہے۔تو اس پر ولایت کی عنایت کے انوار روشن ہوجاتے ہیں جب وہ اپنے پاکیزہ نفس کو دنیا سے ہٹا کر صرف رب تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر اس کی کامل نعمتوں کے آثار دیکھتا ہے اور بے حد مہربانیوں کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے"**الحمد للہ**"۔جب وہ الحمد للہ کا ذکر کرتا ہے تو اس سے رب العلمین کے معنی سے عزت کے پردوں سے حجاب ہٹ جاتے ہیں ۔اس کیفیت کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کے بغیر ہر چیز کو مقام فنا میں سمجھتا ہے اور ہر ایک کو تربیت کا محتاج سمجھتا ہے اب غیروں کی طرف سکون حاصل کرنے کی ظلمت سے نجات طلب کرتا ہے جب انسان اس حال میں پہنچتا ہے کہ اس کی توجہ کا مرکز صرف اللہ تعالیٰ ہوتا ہے تو رب قدوس کی طرف سے بھی اس پر رحمٰن ورحیم کی مہربانیوں کی بادنسیم کے جھونکے اسے حاصل ہوتے ہیں پھر وہ انسان گویا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے "**لمن الملک الیوم** "کی آواز سنتا ہے تو اپنے آپ کو اس ذات کبریاء کے سپرد کرتے ہوئے یوں کہتا ہے "**مالک یوم الدین** "۔

پھر وہ راہ سلوک پر چلنے والا ،ولایت کی منازل طے کرنے والا اپنے آپ کو اس مقام پر سمجھتا ہے کہ گویا کہ رب تعالیٰ کا مشاہدہ کر رہا ہے ۔اور براہ راست خطاب کرتے ہوئے گویا کہ یوں کہہ رہا ہوتا ہے "**اسلمت نفسی الیک واقبلت بکلیتی علیک** " اے مولائے کائنات میں نے اپنے آپ کو تیرے سپرد کردیا۔اور کلی طور پر اپنے آپ کو تیری طرف متوجہ کرتا ہوں ۔اب وہ مقام وصول میں ہوتا ہے اور یہ کہتا ہے "**فحققت نسبۃ العبودیۃ** " میں اپنی عبودیت کی نسبت کو ثابت

کرتا ہوں۔اب وہ رب کے حضور عرض کرتا ہے "ایاک نعبد" یہاں سالک کے مقام کی انتہا ہوجاتی ہے:

" الا یری الی سید الخلق وحبیب الحق کیف عبر عن مقامه هذا بقوله ،
سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِه لَیْلاً "

کیا یہ نہیں دیکھا جاتا کہ مخلوق کے سردار رب کے حبیب علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنے اس مقام کو کس طرح بیان فرمایا اس قول سے " پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندہ کو رات کے تھوڑے سے حصہ میں سیر کرائی"

یہ مصطفیٰ کریم ﷺ کی رب تعالیٰ کی طرف رسائی کا ذکر ہے آپ کے معراج کا ذکر ہے لیکن بندوں کی معراج کیا ہے؟ "الصلوۃ معراج المؤمنین" نماز مومنوں کی معراج ہے۔

خلاصہ کلام: انسان جب رب تعالیٰ کی حمد کرتا ہے اور رب العلمین کہتا ہے اور رحمن ورحیم کہتا ہے اور مالک یوم الدین کہتا ہے اور اپنے آپ کو اس قابل سمجھتا ہے کہ میں گویا کہ رب تعالیٰ کا مشاہدہ کر رہا ہوں تو وہ مقام احسان میں ہوتا ہے۔ (از روح المعانی)

احسان کیا ہے؟ ایک طویل حدیث ہے جس میں ذکر ہے کہ جبرائیل انسانی شکل میں آئے۔اور نبی کریم ﷺ سے چند سوال کیے تاکہ صحابہ کرام انکے جوابات سے علم حاصل کرلیں۔اس حدیث پاک میں ایک سوال یہ تھا "قال فاخبرنی عن الاحسان" جبرائیل نے عرض کیا (یا رسول اللہ) مجھے احسان کے متعلق خبر دیں کہ احسان کیا ہے؟ "قال ان تعبد الله کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانه یراک" آپ نے فرمایا یہ کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو پس اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو بیشک وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

الفاظ مذکورہ کی وضاحت:

عبادت کے متعلق انشاء اللہ بعد میں ذکر آرہا ہے۔یہاں بعد والے الفاظ کی وضاحت ذکر کی جا رہی ہے۔نبی کریم ﷺ کے یہ مختصر الفاظ جوامع الکلم سے ہیں جو کثیر معانی پر مشتمل ہیں اس کی مختلف وجوہ ہیں۔

(۱) یعنی تیری عبادت ایسی ہو جیسا کہ تو اسے دیکھ کر عبادت کر رہا ہے یقیناً اس عبادت میں ایک عجیب کیفیت پائی جائے گی۔

(۲) دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ تو اس ذات کی عبادت کر اس حال میں کہ تو اپنے آپ کو اس ذات کے مشابہ سمجھ جو رب تعالیٰ کو دیکھ کر عبادت کر رہا ہے یقیناً جو رب تعالیٰ کی عبادت اس طرح کر رہا ہو اس کے دل میں خوف، حیاء، خضوع وخشوع، ادب، صفائی قلب اور وفاء پائی جائے گی۔ یعنی بندہ جب اپنے رب تعالیٰ کے حضور کھڑا ہو۔ تو اپنی طاقت کے مطابق عمل میں احسان (خلوص) میں سے کچھ چیز بھی نہ چھوڑے۔ اور اس کی توجہ ذات کبریاء کے بغیر کسی اور کی طرف نہ جائے۔ اصل عبادت یہی ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ جس ذات کے لئے عمل کر رہا ہے اسے نہ دیکھ رہا ہو پھر بھی عمل میں خلوص پایا جائے۔ لیکن جب عمل کرنے والا اس ذات کو دیکھ رہا ہو جس کے لئے وہ عمل میں کوشش کر رہا ہے تو یقیناً وہ اپنے عمل میں اور زیادہ حسن وکمال پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔ "**فان لم تکن تراہ فانہ یراک**" اگر تم اس سے ایسا معاملہ نہیں کر رہے جو دیکھنے والا کرتا ہے تو وہ تمہارے ساتھ دیکھنے والے کا مطالعہ کر رہا ہے گویا کہ یوں فرمایا گیا ہے "**فاحسن فی عملک فانہ یراک**" اپنے عمل میں حسن ونکھار پیدا کرو۔ خلوص سے عمل کرو کیونکہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

بعض عارفین نے فرمایا پہلا مقام مکاشفہ کا ہے یعنی جب تو اپنے عبد ہونے میں خلوص پیدا کرے گا رب تعالیٰ کی عبادت خشوع وخضوع سے کرے گا۔ اور غیروں کی طرف دھیان نہیں جائے گا تو تیرے دل میں رب تعالیٰ کے انوار کی تجلیات روشن وعیاں ہو جائیں گی۔ یہی مطلب ہے حدیث پاک میں استعمال شدہ الفاظ مبارکہ "**کانک تراہ**" گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔

دوسرا مقام مراقبہ کا ہے کہ اگر عبادت کرنے والا مقام کشف تک نہیں پہنچا تو یہ خیال کرے کہ میں نے اپنی عبادت میں خلوص خشوع وخضوع سے درجہ مکاشفہ تک پہنچنا ہے ابھی تک وہ مقام انتظار میں ہے گردن جھکا کر مقام تصور میں اس مقام کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جسے عارفین کی اصطلاح میں مراقبہ کہا گیا ہے۔ حدیث پاک کے الفاظ مبارکہ "**فان لم تکن تراہ فانہ یراک**" (اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے) کا یہی مطلب ہے کہ مقام مراقبہ میں کمال پیدا کرتا کہ تجھے مقام مکاشفہ حاصل ہو جائے۔

لب لباب: حاصل کلام یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کر ایسے حال میں کہ تجھے اپنے وجود کا شعور حاصل ہو یعنی زندگی بھر عبادت کر۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ﴾ اپنے رب کی عبادت کر یہاں تک کہ تجھے موت آجائے۔ اس لئے جب تم فنا ہو جاؤ گے حقیقی طور پر یعنی تم پر ظاہری طور پر جب موت آجائیگی۔ " تراه رؤية حقيقة وترتفع العبادات التكليفية " تو تم رب تعالیٰ کو حقیقۃً دیکھ لو گے اور تم سے عبادات تکلیفیہ اٹھالی جائیں گی:

" واذا مت موتا مجاز یاودخلت في حال الفناء وبقيت في مقام البقاء تراه رؤية مشاهدة غيبة تسقط عنك ثقل العبادات البدنية او نفس الاعمال الظاهرية عند غليات الجذبات الباطنية "

" جب تجھے مجازی طور پر موت آئے یعنی تو فنافی اللہ کے مقام میں پہنچ جائے اس وقت تو حقیقۃً مقام بقاء کو حاصل کرے گا اس حال میں تو رب تعالیٰ کا غیبی مشاہدہ کرے گا یعنی اگرچہ وہ تجھ سے بظاہر غیب ہی ہوگا لیکن تیرے تصور میں تجھے نظر آرہا ہو گا جب تو مقام مجذوبیت میں پہنچ جائے گا۔ یعنی تجھے اپنے آپ کا بھی جب پتہ نہ رہے تو تجھ سے بدنی عبادات کا بوجھ اور ظاہری اعمال کی تکلیف کو اٹھالیا جائے گا"۔

کانک تراہ کا مطلب واضح ہوگیا: اب یہاں سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ حضور ﷺ نے " کانک تراہ " (گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے) یہ نہیں فرمایا "انک تراہ " کہ بیشک تو اسے دیکھ رہا ہے۔ اس لئے کہ حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنا دنیا میں واقع نہیں ہوگا کیونکہ مسلم شریف میں نفی رؤیت کا ذکر ہے "واعلموا انكم لن تروا ربكم حتى تموتو " جان لو بیشک تم اپنے رب کو ہرگز نہیں دیکھ سکو گے یہاں تک کہ تم فوت ہو جاؤ۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دنیا میں بصر کو فناء کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس لئے اس میں طاقت نہیں کہ باقی (اللہ تعالیٰ جو باقی رہنے والا ہے) کو دیکھ سکے:

" بخلافه في الآخرة فانه لما خلق للبقاء الابدى قوى وقدر على نظر الباقي سبحانه "

بخلاف آخرت کے کہ وہاں بصر کو بقاء ابدی حاصل ہو گی۔ اس لئے اس میں یہ قوت وقدرت بھی حاصل ہو گی کہ باقی رہنے والی پاک ذات کو بھی دیکھ سکے۔

اعتراض: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محققین حضرات نے تو یہ فرمایا "رؤيته صلى الله عليه وسلم ليلة الاسراء بعين رأسه " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج کی رات سر کی

آنکھوں سے رب تعالیٰ کو دیکھنا ثابت ہے۔ یہ قول حدیث پاک کے کس طرح مطابق ہو گا کہ رب تعالیٰ کو موت سے پہلے دیکھنا ممکن نہیں۔

جواب: " اما علی انه مستثنی و اما لکونه فی الملکوت الاعلی الذی لایصدق علیه الدنیا ونزاع المعتزلة معروف فی هذه المسئلة "

اس کے دو جواب دیئے گئے ہیں ایک تو یہ ہے کہ حدیث پاک کے عموم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیکھنا دوسری احادیث سے مستثنیٰ ہے دوسرا جواب یہ ہے کہ جس حدیث پاک میں رب تعالیٰ کو دیکھنے سے ممانعت ثابت ہو رہی ہے اس کا تعلق دنیا سے ہے کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے رب تعالیٰ کو کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔ نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کو اس دنیا میں تو نہیں دیکھا بلکہ آپ نے تو ملکوت اعلیٰ میں دیکھا لہٰذا اعتراض خود بخود ہی اٹھ گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے رب تعالیٰ کو دیکھنے میں معتزلہ نے انکار کیا ہے۔ ان کا اختلاف مشہور و معروف ہے تاہم ہمیں معتزلہ سے کیا۔ ہم تو محققین اہل سنت و جماعت کی محبت بھری تحقیق کو مانتے ہیں۔

نکتہ عجیب: جبرائیل نبی کریم ﷺ سے سوال کرتے جا رہے تھے اور آپ جواب دے رہے تھے جب بھی آپ جواب دیتے جبرائیل کہتے "صدقت" یا رسول اللہ آپ نے سچ ارشاد فرمایا لیکن احسان کے جواب میں جبرائیل نے "صدقت" نہیں کہا اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے:

" ان الاحسان هو الاخلاص وهو سر من اسرار الله تعالیٰ لایطلع علیه ملک مقرب ولا نبی مرسل "

" بے شک احسان اخلاص ہے وہ اللہ تعالیٰ کے رازوں میں سے ایک راز ہے جس پر کوئی مقرب فرشتہ مطلع نہیں اور کوئی نبی مرسل اس پر مطلع نہیں"۔ (از مرقاۃ ج اول ص ۲۰، ۲۱)

سبحان اللہ ! جسے جبرائیل نہ جانے، کوئی فرشتہ، کوئی نبی نہ جانے اسے میرے حبیب پاک علیہ التحیۃ والثناء جانیں۔

﴿ اِیَّاكَ نَعْبُدُ ﴾ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔

یہ تخصیص والا معنی "ایاک" ضمیر کے فعل سے پہلے آنے کی وجہ سے کیا جاتا ہے کیونکہ عربی کا

ایک ضابطہ ہے "التقدیم ماحقه التاخیر یفید الحصر" جس کا حق مؤخر ذکر کرنا ہو، اسے مقدم ذکر کیا جائے تو تخصیص کا فائدہ حاصل ہوگا۔

عبادت کیا ہے؟ "العبادة اقصی غایة الخضوع و التذلل" بہت زیادہ خضوع اور اپنے آپ کو کم تر بنانے کا نام عبادت ہے۔ اسی وجہ سے جس راستہ پر لوگ زیادہ چلیں اسے "طریق معبد" کہتے ہیں۔ یعنی اس راستہ کو زیادہ روندا جاتا ہے۔ (بیضاوی) "وفی الشرع وھی ما یجمع کمال المحبة و الخضوع و الخوف" شریعت میں عبادت اسے کہا جاتا ہے جو کمالِ محبت اور کمالِ خضوع اور کمالِ خوف کا مجموعہ ہو۔ (ابن کثیر)

قیام اور جھکنا عبادت نہیں:

عبادت میں جب بہت زیادہ تعظیم انتہائی درجہ کی تعظیم کا پایا جانا ضروری ہے تو واضح ہوا کہ "فخرج القیام و الانحناء لنوع تعظیم" قیام اور جھکنا عبادت سے خارج ہیں کیونکہ ان میں اعلیٰ درجہ کی تعظیم یعنی جو تعظیم کا انتہائی درجہ ہے وہ نہیں پائی گئی بلکہ صرف تعظیم کی ایک قسم پائی گئی ہے۔

(تفسیر الصبی)

راغب نے بیان کیا ہے عبادت فعل اختیاری ہے خواہشات بدنیہ کے خلاف چیز کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے تقرب کی نیت سے اور شریعت کی طاعت کے ارادہ سے رب کے حضور جھکنے کو عبادت کہا جاتا ہے۔ بندے کو جتنی رب تعالیٰ کی معرفت زیادہ حاصل ہوتی ہے اتنا ہی اس کا مقام عبودیت میں زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے انبیاء کرام اور اولو العزم ہستیوں کو عبادات میں بھی ایک خصوصی مقام حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ انہیں معرفت زیادہ حاصل ہوتی ہے۔

(مرقاة ج اول ص ۲۰)

<u>عبادت کے تین درجے ہیں:</u> عبادة، عبودیة، عبودة۔ (روح المعانی، مرقاة)

<u>پہلا درجہ عبادت:</u> جب انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے مقصد ثواب کو حاصل کرنا ہو اور عذاب سے بچنا مقصود ہو اسے عبادت کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ درجہ پست ہے۔ کیونکہ اس میں معبود حقیقت

میں ثواب ہو گیا۔ جب مطلوب ثواب ہوا اور اللہ تعالیٰ اس مطلوب کے حصول کا ذریعہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مخلوق کو مقصود بنا لیا گیا۔ (کیونکہ ثواب بھی مخلوق ہے) اور خالق کو ذریعہ اور وسیلہ یہ مقام عبادت کا گھٹیا مقام ہے۔

دوسرا درجہ: اللہ تعالیٰ کی عبادت اس لئے کرتا ہے کہ عبادت اعلیٰ چیز کا نام ہے یا اس لئے کہ مجھے رب تعالیٰ نے مکلف بنایا ہے احکام تکلیفیہ کو قبول کرنے میں شرافت وعزت ہے۔ یا اس لئے کہ میں نے عبادت کی تو میری نسبت عبادت کی طرف ہوگی مجھے عابد کہا جائے گا یہ درجہ پہلے درجہ سے اعلیٰ ہے لیکن اس میں بھی بہت کمال نہیں پایا گیا کیونکہ اس میں بھی مقصود بالذات غیر اللہ ہے۔

تنبیہ: روح المعانی اور مرقاۃ میں اس درجے کا نام عبودیۃ رکھا گیا ہے اور تیسرا درجہ جس کا ذکر ان شاء اللہ قریب ہی آ رہا ہے۔ اس کا نام عبودۃ رکھا ہے۔ لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ علیہ نے پہلے اور دوسرے دونوں کا نام عبادۃ رکھا ہے البتہ دو درجے بنا دیئے ہیں اور تیسرے کا نام انہوں نے عبودیت رکھا ہے۔ میں چونکہ تفسیر کبیر سے لکھ رہا ہوں۔ اس لئے آنے والی بحث اور نام کبیر کے حوالہ سے ہی دیکھیں جائیں۔

تیسرا درجہ: انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے صرف اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ معبود ہے خالق ہے اور میں اس کا عبد (بندہ) ہوں رب تعالیٰ کو جب الہ (معبود) تصور کر کے عبادت کرے گا تو اس کی الوھیۃ سے ہی اس کی ہیبت اس کا رعب اور اس کا غالب ہونا سمجھ آ جائے گا۔ اور جب یہ تصور کرے گا کہ میں اس کا عبد ہوں تو اپنی عبودیۃ کے تصور سے ہی خضوع اور عجز وانکساری اور اپنے آپ کا پست حقیر، گھٹیا ہونا سمجھ آ جائے گا۔ یہ مقام اعلیٰ اور اشرف ہے اس کا نام عبودیۃ ہے:

" والیه الاشارة بقول المصلی فی اول الصلوة اصلی لله فانه لو قال اصلی لثواب الله او للهرب من عقابه فسدت صلوته "

• یہ جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ نماز میں عبادت میں صرف اللہ تعالیٰ کا خیال ہو ثواب حاصل ہونے اور عذاب سے بچنے کی طرف دھیان نہ ہو یہ نماز کی نیت سے ہی سمجھ میں آتا ہے کہ نمازی نیت کرتا ہی تو کہتا ہے۔ "اصلی لله" میں اللہ کے لئے نماز ادا کر رہا ہوں یہ نیت درست ہے اس سے نماز صحیح ادا ہو

گی۔لیکن اگر وہ نیت کرتے ہوئے یوں کہے"اصلی لثواب الله " میں نماز اس لئے ادا کر رہا ہوں تا کہ اللہ تعالیٰ سے ثواب حاصل ہور یااس طرح نیت کرے" اصلی للھرب من عقاب الله " میں اس لئے نماز ادا کر رہاں ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ جاؤں توان دونوں صورتوں میں نیت صحیح نہیں ہوگی۔ بلکہ "فسدت صلوته "اس کی نماز فاسد ہوجائے گی۔

فائدہ: علامہ رازی رحمہ اللہ کے یہ الفاظ "والیه الاشارة بقول المصلی فی اول الصلوة اصلی لله" کو بار بار پڑھو۔غور اور توجہ سے پڑھیں ترجمہ کی طرف کامل توجہ کریں۔نمازی کی نماز کی ابتداء میں "اصلی لله " (میں اللہ کے لئے نماز ادا کر رہا ہوں) کہنے سے اس طرف اشارہ پایا گیا ہے(کہ عبادت صرف اللہ کے لئے ہو)۔تو اس توجہ سے یہ مسئلہ حل ہوگیا کہ نماز میں زبان سے نیت کرنا سلف صالحین سے چلا آرہاہے اگر چہ فرض صرف دل سے نیت کرنا ہے لیکن زبان سے ادا کرنا مستحب ہے تاکہ زبان اور دل کی نیت موافق ہوجائیں۔اس مسئلہ میں اختلاف اور اشتہار بازی صرف پاکستان اور ہندوستان کے جہلاء کی ہے۔ورنہ اہل علم نے استحباب پر عمل کرنے سے کبھی کسی کو نہیں روکا۔

عبادت اور عبودیت کا مقام اشرفیت:

یہ بھی خیال رہے کہ عبادت فی ذاتہ اعلیٰ اور اشرف مقام رکھتی ہے۔یہ تین درجے عبادت کے ایک دوسرے درجے کی طرف نسبت کرنے سے حاصل ہوئے۔اس لحاظ پر کسی کو اعلیٰ کسی کو گھٹیا اور کسی کو درمیانے درجہ کا ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ورنہ عبادت کے کسی درجہ کو بھی اس وقت تک گھٹیا کہنا شدید غلطی ہوگی جب تک ان میں ایک دوسرے کی طرف نسبت کا لحاظ نہ کیا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے مطلقاً ذکر فرمایا" واعلم ان العبادة والعبودية مقام عال شریف" تو جان لے کہ بیشک عبادت اور عبودیت بلند اور اشرف مقام رکھتی ہیں۔اس کے بعد فرمایا کہ ان کی بلندی،رفعت اور اشرفیت پر کئی آیات دلالت کرتی ہیں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ

وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿

اور بیشک ہمیں معلوم ہے کہ ان کی باتوں سے تم دل تنگ ہوتے ہو تو اپنے رب کی تعریف کرتے ہوئے اس کی پاکی بیان کرو اور سجدہ کرنے والوں میں ہو جاؤ۔ اور مرتے دم تک اپنے رب کی عبادت میں رہو۔ ایک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴾ نبی کریم ﷺ کو رب تعالیٰ نے حکم دیا کہ آپ ہمیشہ عبادت کرتے رہنا یہاں تک کہ تمہارا اس دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آ جائے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی وقت میں بھی عبادت میں خلل واقع نہ ہونے دیا جائے "وذلک یدل علی غایة جلالة امر العبادة " اس سے واضح ہو گیا کہ امر عبادت میں اعلیٰ درجہ کی بزرگی شرافت اور رفعت پائی گئی ہے۔

اور استدلال کی دوسری وجہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴾ بیشک ہمیں معلوم ہے کہ ان کی باتوں سے تم دل تنگ ہوتے ہو۔ اس کے بعد چار چیزوں کا حکم دیا تسبیح کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا فَسَبِّحْ ! تَحْمِيْدَ کا حکم ان الفاظ مبارکہ سے دیا "بِحَمْدِ رَبِّكَ "اور سجود کا حکم دیتے ہوئے یہ ذکر فرمایا ﴿وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴾ اور عبادت کا حکم دیا تو یہ ارشاد فرمایا ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴾ رب تعالیٰ نے جس ترتیب سے ذکر فرمایا کہ کافروں کی باتوں سے آپ کے دل کو تنگی ہوتی ہے۔ آپ اپنے رب کی تسبیح بیان کریں اور اپنے رب کی حمد کریں اور رب کے حضور سر بسجود ہو جائیں اور مرتے دم تک اپنے رب کی عبادت کریں۔ اس ترتیب سے ہی پتہ چل گیا کہ عبادت دل کی تنگی کو ختم کرتی ہے اور سینہ کو کشادگی عطا کرتی ہے:

" وما ذاک الا لان العبادة توجب الرجوع من الخلق الی الحق وذلک یوجب زوال ضیق القلب "

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ عبادت کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق سے توجہ ہٹا کر رب تعالیٰ کی طرف رجوع کیا جائے جب یہ حالت حاصل ہو گی تو یقینی بات ہے کہ دل سے پریشانیوں کا زوال ہو گا کیونکہ دل تنگی تب ہی حاصل ہوتی ہے جب مخلوق کی طرف توجہ کی جائے جب ہمہ تن خالق کی طرف توجہ ہو گی تو کوئی پریشانی دل میں نہیں رہے گی۔

عبودیت کی اشرفیت پردلیل:

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ ﴿سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلاً﴾ پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے عبد (بندے) کو رات کے تھوڑے سے حصہ میں سیر کرائی۔ اس آیۃ کریمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ مقام معراج کا ذکر فرمایا اس اعلیٰ مقام میں آپ کا وصف عبد ہونا ذکر فرمایا تو اس سے واضح ہوا کہ عبودیت کو اشرف مقام حاصل ہے۔

نبی کی عبودیت نبی کی رسالت سے اعلیٰ ہے:

" العبودیة اشرف من الرسالة لان بالعبودیة ینصرف من الخلق الی الحق وبالرسالة ینصرف من الحق الی الخلق وایضا بسبب العبودیة ینعزل عن التصرفات وبسبب الرسالة یقبل علی التصرفات واللائق بالعبد الانعزال عن التصرفات "

عبودیت رسالت سے اشرف ہے کیونکہ عبودیت میں مخلوق سے توجہ ہٹا کر رب تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا ہوتا ہے اور رسالت میں رب تعالیٰ کے احکام بندوں تک پہنچانے ہوتے ہیں اس لئے مخلوق کی طرف متوجہ ہونا بھی رب تعالیٰ کے حکم سے ضروری ہوتا ہے۔ جتنی دیر مخلوق کی طرف توجہ ہوگی اتنی دیر یقیناً خالق کی طرف توجہ میں کمی واقع ہوگی"۔

اور وجہ یہ ہے کہ عبودیت میں تصرفات کو ختم کرنا ہوتا ہے صرف خالق کی عبادت میں مشغول ہونا ہے لیکن رسالت میں تصرفات کو قبول کرنا ہوتا ہے۔ یعنی تبلیغ دین میں مشغولیت بھی ضروری ہوتی ہے۔ اس لئے عبودیت کا مقام اشرف ہوتا ہے کہ بندے کے لائق یہی ہے۔ کہ وہ تصرفات سے دور رہے اور خالق کی ذات ہی اس کے مدنظر رہے۔ "وایضا العبد یتکفل المولی باصلاح مهماته والرسول هو المتکفل باصلاح مهمات الامة " عبودیت کے اشرف ہونے کی اور وجہ یہ ہے کہ عبد اپنے مہمات کی اصلاح کے لئے مولی کو اپنا کفیل بناتا ہے۔ اور رسول کو اپنی امت کی مہمات (مشکل کام) میں اپنے آپ کو کفیل بنانا ہوتا ہے۔

تنبیہ: ابھی جو بیان کیا ہے کہ عبودیت، رسالت سے افضل، اعلیٰ، اشرف ہے اس عبودیت سے مراد نبی کی عبودیت ہے، کسی عام انسان کی عبودیت کو رسالت سے افضل ہونے کا قول کر کے اپنے ایمان کا رگڑا نہ نکال دینا۔

عبودیت کی اشرفیت پر اور دلیل:

عیسیٰ علیہ السلام ابھی چند دنوں کے ہی تھے تو آپ نے پہلا کلام یہ فرمایا" انی عبداللہ " میں اللہ کا بندہ ہوں آپ کا رب تعالیٰ کی عبودیت کا ذکر آپ کی والدہ کی پاک دامنی کا سبب بنا۔اور اپنی ذات سے طعن کی دوری کا ذریعہ بنا۔اور ہر قسم کی بھلائی کے حصول کا باعث بنا۔اور تمام آفات کو دور رکھنے کا سبب بنا:

" وایضا لما کان اول کلام عیسی ذکرالعبودیة کانت عاقبة الرفعة کماقال اللہ تعالیٰ ورافعک الی "

اور کمال کی بات یہ ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام نے دنیا میں تشریف لاتے ہی اپنی عبودیت کا ذکر کیا تو رب تعالیٰ نے اس کے انعام میں آپ کو اپنی طرف بلا کر رفعت عطا فرمائی۔یعنی ذکر عبودیت حصول رفعت کا سبب ہے۔اور عجیب بات اس میں یہ پائی گئی کہ جب صرف زبانی دعویٰ عبودیت کا جنت میں رفعت حاصل کرنے کا سبب ہے۔تو یہ کیسے ہوسکتا ہے جو کئی سال عمل کے ذریعے رب تعالیٰ کی عبادت کر رہا ہو تو وہ جنت سے محروم رہے۔

عبودیت کی اشرفیت پر اور دلیل:

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا﴿ اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰـهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ﴾ بیشک میں ہی ہوں اللہ کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری بندگی کرو۔

اللہ تعالیٰ نے توحید کے بعد عبودیت کا ذکر فرمایا کیونکہ توحید اصل ہے اور عبودیت فرع ہے یا یوں کہا جائے کہ توحید ایک درخت کی مثال ہے اور عبودیت پھل کی مثال ہے، جس طرح درخت اور پھل کا ایک دوسرے کے بغیر قیام نہیں اسی طرح توحید بغیر عبودیت کے نامکمل ہے اور عبودیت بغیر توحید کے بے اصل ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول زرین:

حضرت علی رضی اللہ عنہ رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا کرتے تھے:

" کفی بی فخرا ان اکون لک عبدا وکفی بی شرفا ان تکون لی ربا اللھم انی وجدتک الھا کما اردت فاجعلنی عبدا کما اردت "

مجھے اس پر فخر ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں۔ میرے لئے یہی مقام شرافت کافی ہے کہ تو میرا رب ہے۔ اے اللہ میں نے تجھے ایسا ہی معبود پایا جیسا میں چاہتا تھا اے اللہ تو مجھے ایسا بندہ بنادے جیسا تو چاہتا ہے۔

اِیَّاكَ نَعْبُدُ کہا نعبدك نہیں کہا:

دینی مدارس کے طلباء کی توجہ کے لئے علمی نکتہ ذکر کر رہا ہوں۔ اگر چہ اس قسم کے مسائل ان کے ذہن میں ہوتے ہیں لیکن توجہ دلانی مقصود ہے۔ ایاک ضمیر منصوب منفصل ہے اور اگر کہا جاتا "نعبدک" تو "ک"، ضمیر منصوب متصل ہوتی۔ اصل یہی ہے کہ ضمیر متصل لانی چاہئے اگر منفصل ضمیر لائی جائے تو اس میں کوئی نکتہ پایا جاتا ہے۔ یہاں کیا نکتہ پایا گیا ہے اس میں چند وجوہ ہیں:

(۱) ایک وجہ تو پہلے ذکر کی جاچکی ہے کہ "ایاک" کو پہلے ذکر کرنے میں تخصیص پائی گئی ہے۔ یعنی "ایاک نعبد" سے معنی یہ حاصل ہوا "لا معبود الا اللہ" اللہ کے بغیر اور کوئی معبود نہیں۔ یہی معنی کلمہ توحید کا ہے۔ تو گویا کہ یوں کہا جائے کہ اس ترتیب سے کلمہ توحید "لا الہ الا اللہ" حاصل ہو گیا۔

(۲) "ایاک" کو پہلے ذکر کر کے رب تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق بتادیا کہ اے عبادت کرنے والے تو پہلے مجھے یاد کر تا کہ تجھے معلوم ہو جائے کہ معبود صرف میں ہی ہوں جب تجھے یہ معلوم ہو جائے گا کہ معبود برحق صرف اللہ تعالیٰ ہے تو تعظیم میں تو سستی نہیں کرے گا اور دائیں بائیں نہیں توجہ کرے گا۔" عرفه ذاته اولا حتى تحصل العبادة مع الحشمة فلا تمتزج بالغفلة "تو پہلے اللہ تعالیٰ کی ذات کو پہچان تا کہ جب تو عبادت کرے تو تجھے اس ذات کا رعب اور اس کی حشمت بھی حاصل

رہے گی اس طرح تو عبادت میں غفلت کو نہیں آنے دے گا۔

(۳) جب تجھ پر طاعات بھاری ہو جائیں عبادات کو تو مشکل سمجھے یعنی قیام، رکوع اور سجود کو تو اپنے لئے مشکل سمجھے، تو "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" کہہ کر پہلے مجھے یاد کر اور میری معرفت کو اپنے دل میں حاضر کر جب تو میرے جلال اور میری عظمت وعزت کو یاد کرے گا تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ میں تیرا مولیٰ ہوں اور تو میرا عبد (بندہ) ہے جب تجھے یہ معلوم ہو جائے گا تو تجھ پر عبادت آسان ہو جائے گی۔

حقیقت یہی ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ عاشق اپنے معشوق کے سامنے اس کی مرضی کے مطابق مشکل کام کو آسان سمجھتا ہے تو وہ شخص جو عبادت میں اپنے آپ کو اس درجہ میں سمجھتا ہے کہ گویا کہ وہ اپنے رب تعالیٰ کے جمال کا مشاہدہ کر رہا ہے تو یقینی بات ہے کہ وہ عبادت کو آسان سمجھے گا اسے کوئی مشکل نظر نہیں آئے گی۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَاھُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴾ بیشک وہ جو متقی ہیں جب ان کو کوئی شیطانی خیال مس کرتا ہے تو وہ یاد کرتے ہیں (یعنی اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں) اس وقت ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ یعنی نفس کو شیطان اسی وقت مس کرتا ہے جب کہ اس میں سستی پائی جائے اور غفلت پائی جائے۔ اور نفس میں گناہوں کی دلیری پائی جائے۔ لیکن متقی لوگ یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے شیطان کے اثر انداز ہوتے ہی اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں۔ اور اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان کی آنکھیں جلدی ہی کھل جاتی ہیں۔ وہ شیطان کے اثر انداز ہونے کو بہت جلدی محسوس کر لیتے ہیں۔ جب انسان "ایاک نعبد" کہہ کر پہلے اللہ تعالیٰ کو یاد کرے گا تو عبادت کے ادا کرنے میں اپنے آپ کو تیار کرے گا اور شیطانی اثر سے محفوظ رہے گا۔

(۵) اگر انسان "نعبدک" کہتا تو "نعبد" کا مطلب ہوتا ہم عبادت کرتے ہیں ابھی تک "ک" کے ذکر سے پہلے یہ معلوم نہیں تھا کہ کس کی عبادت کرتے ہیں۔ ابلیس کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا ہو سکتا ہے وہ "ک" تیری کہنے سے پہلی ہی یہ وہم ڈالتا کہ یہ عبادت بتوں کے لئے ہے۔ یا سورج کی عبادت ہے، یا چاند کی عبادت لیکن جب "ایاک" پہلے آ گیا تو مقصود پہلے ذکر کر دیا گیا کہ تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اس میں توحید میں ایک خصوصی کمال پیدا ہو گیا۔ اور شرک کا

احتمال ختم ہوگیا۔ابتدائی لفظ سے ہی ابلیس مایوس ہوجاتا ہے۔

(۶) جب اللہ تعالیٰ قدیم ذات ہے۔واجب الوجود ہے تمام مخلوق سے پہلے ہے۔جس کی کوئی ابتدا ہی نہیں تو اس ذات کاذکر بھی سب اذکار سے پہلے ہونا چاہئے اس لئے جب"ایاک" پہلے پایاگیا تو اللہ تعالیٰ کاذکر پہلے آ گیا اس کے بعد"نعبد" ہے جس میں انسان کے عبادت کرنے کاذکر ہے یہی ترتیب ضروری جوذکر کی گئی۔

(۷) بعض محققین نے بیان کیا ہے کہ جس شخص کی نظر نعمت کے وقت نعمت عطا کرنے والے کی طرف ہونعمت کی طرف نہ ہواس کی نظر مصیبت کے وقت بھی مصیبت نازل کرنے والے کی طرف ہوتی ہے مصیبت کی طرف نہیں ہوتی۔ایسی صورت میں وہ تمام احوال میں اللہ تعالیٰ کی معرفت میں مستغرق ہوگا:

نہ نعمت کی خوشی ، نہ مصیبت کا غم رکھتے ہیں نظر خدا پہ ہم

اس شخص کو سعادات میں اعلیٰ مراتب حاصل ہوں گے، عبادات میں عجیب کیف وسرور حاصل ہوگا۔لیکن جس شخص کی نظر نعمت کے وقت نعمت کی طرف ہونعمت عطا کرنے والے کی طرف نہ ہواس کی نظر مصیبت کے وقت بھی مصیبت کی طرف ہوگی مصیبت نازل کرنے والے کی طرف نہیں ہوگی۔ایسے شخص کے اوقات غیر اللہ کی یاد میں بسر ہوں گے۔یہ ہمیشہ بدبختی اور مصیبت میں رہے گا کیونکہ نعمت کے حاصل ہونے پرنعمت کے زوال کاخوف رہے گا یہ بھی ایک عذاب ہی ہے اور مصیبت کے وقت رسوائی اورذلت میں اپنے آپ کوگرفتار سمجھے گا۔اسلئے " ایاک " پہلے ذکر کر کے بندے کو بتایا گیا ہے کہ تیری نظر صرف رب تعالیٰ پر ہونعمت کا حصول یا مصائب کا وقوع سب ہی رب تعالیٰ کی طرف سے سمجھا جائے۔

فائدہ: اسی تحقیق سے یہ بات بھی حاصل ہوگئی کہ موسیٰ علیہ السلام کی امت کو رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ ﴾ اے بنی اسرائیل یاد کرو میری نعمتوں کو۔جب کہ بنی اسرائیل اپنی کوتاہی سے صرف نعمتوں کی طرف نظر کرتے تھے نعمت عطا کرنے والے کی طرف ان کو نظر نہیں ہوتی تو رب تعالیٰ نے بھی صرف نعمتوں کو یاد کرنے کا حکم دیا۔لیکن نبی کریم ﷺ کی امت کو حکم دیا

فَاذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ ﴾ تم یاد کرو مجھے میں تمہیں یاد کروں گا۔اس لئے کہ امت مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کی نظر انعام عطا کرنے والے پر ہوتی ہے نعمتوں پر نہیں۔ یہ حالت خاص لوگوں کی ہے اوران کی حالت کو بیان کر کے عوام کو یہ سمجھایا کہ تم مجھے یاد کر وتمہاری نظر میری طرف ہی ہونی چاہئے صرف نعمتوں کو ہی دیکھنا تمہاری شان کے لائق نہیں تم عظیم نبی کی عظیم امت ہو لہٰذا تم اپنے افعال واقوال میں اپنی عظمت کا ہی لحاظ رکھا کرو۔اب واضح ہوا کہ جب "ایاک" پہلے کہہ کر رب تعالیٰ کوخطاب کرے گا تو گویا کہ وہ رب تعالیٰ کے جلال کے انوار کے مشاہدہ میں مستغرق ہوگا۔

حصول منازل رفعیه: جب انسان اس مقام پر پہنچتا ہے تو وہ رب تعالیٰ کی صفات کا مظہر بن جاتا ہے اس پر حدیث پاک دیکھیں:

" عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ ان الله تعالیٰ قال من عادلی وليا فقد اذنته بالحرب وما تقرب الی عبدی بشئی احب الی مما افترضت عليه ومايزال عبدی يتقرب الی بالنوافل حتی احببته فاذا احببته فكنت سمعه الذی يسمع به وبصره الذی يبصربه ويده التی يبطش بها ورجله التی يمشی بها وان سالنی لاعطينه ولئن استعاذنی لا عيذنه "

(بخاری ، مشکوۃ باب ذکر الله عزوجل والتقرب اليه)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بیشک رب تعالیٰ فرماتا ہے جس شخص نے میرے کسی ایک ولی سے دشمنی کی تو میں اسے لڑائی پر مطلع کرتا ہوں (یعنی اسے اپنے ساتھ جنگ کرنے کا چیلنج کرتا ہوں) میرا بندہ کسی چیز سے بھی اتنا میرے قریب نہیں ہوتا۔جتنا فرائض کی ادائیگی سے ہوتا ہے (فرائض پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ) جب بندہ نوافل کے ذریعے میرے قریب ہوتا ہے تو میں اس سے محبت کرتا ہوں یہاں تک کہ جب میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں۔تو میں اس کی سمع بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور میں اس کی بصر بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے۔اور میں اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں اسے عطا کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ طلب کرے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں۔اس حدیث پاک کی تائید میں ایک اور حدیث دیکھئے تو مسئلہ کو سمجھنا بہت آسان ہو جائے گا:

" عن ابن عمر ان عمر بعث جيشا وامر عليهم رجلا يدعى سارية فبينما عمر يخطب فجعل يصيح يا ساری الجبل فقدم رسول من الجيش فقال يا امير المؤمنين يقيناً فاسندنا ظهورنا الى الجبل فهزمهم الله تعالىٰ "

(رواه البيهقى فى دلائل النبوة ،مشكوة باب الكرامات)

" حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بیشک حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے ایک لشکر کو بھیجا ان پر امیر ساریہ کو بنایا۔خطبہ دیتے ہوئے آپ نے بلند آواز سے کہا" يا ساری الجبل " اے ساریہ پہاڑ کو لازم پکڑو یعنی اسے پیٹھ کے پیچھے کر دو لشکر میں سے ایک قاصد آیا۔اس نے کہا اے امیر المؤمنین ہمارے دشمن نے جب ہمارا سامنا کیا تو قریب تھا کہ وہ ہمیں شکست دے دیتے لیکن ہم نے ایک آواز سنی ۔جس میں کہا گیا اے ساریہ پہاڑ کو لازم پکڑو یعنی پہاڑ کو پیٹھ پیچھے کر دو ہم نے پہاڑ کو پیچھے کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو شکست دے دی"۔

اس حدیث پاک کی شرح میں علامہ قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینہ طیبہ میں مسجد نبوی میں خطبہ دے رہے تھے کثیر لوگ موجود تھے۔اکابر صحابہ کرام اور تابعین کا اجتماع تھا۔جن میں حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما بھی تھے۔اور فرماتے تھے:

" وفيه انواع من الكرامة له رضى الله عنه كشف المعركة وايصال صوته وسماع كل منهم لصيحته وفتحهم ونصرتهم ببركته " (مرقاة)

اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کئی کرامات واضح ہوتی ہیں۔آپ نے مدینہ طیبہ میں میدان جنگ کو دیکھ لیا (حالانکہ تقریباً تین سو میل دور وہ میدان جنگ تھا،غالباً ملک کا نام نہاوند تھا)اور آپ نے اپنی آواز وہاں پہنچائی۔وہاں تمام مسلمانوں نے آواز کو سنا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی برکت سے فتح نصیب ہوئی۔ (مرقاة)

مسئلہ واضح ہوگیا کہ نظر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تھی طاقت اس میں رب تعالیٰ کی جلوہ گر تھی۔آواز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تھی طاقت اس میں رب تعالیٰ کی کام کر رہی تھی۔کان حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ کے، اور مسلمانوں کے لشکر کے تھے۔لیکن ان میں سننے کی قوت رب تعالیٰ سے حاصل ہو رہی تھی۔

اعتراض: الحمد للہ میں للہ الحمد کیوں نہیں کہا تا کہ تخصیص حاصل ہوتی؟

جواب: ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ "للہ" میں لام تخصیص کا ہے۔مقام بھی حمد کا تھا اس لئے حمد کو پہلے ذکر کرنے کے باوجود تخصیص بھی پائی گئی لیکن " اِیَّاکَ نَعْبُدُ "میں سوائے " ایاک " کے مقدم ذکر کرنے کے اور کوئی وجہ تخصیص نہیں تھی۔اور عجیب نکتہ اس میں یہ بھی ہے۔کہ حمد غیر اللہ کی بھی جائز ہے اس لئے اس میں تخصیص کی اتنی زیادہ ضرورت بھی نہیں۔لیکن عبادت غیر اللہ کی جائز نہیں اس لئے اس میں تخصیص کی زیادہ ضرورت تھی۔اس لئے " الحمدللہ " میں لام کو تخصیص کا نہ بھی مانا جائے اور "للہ "کو مقدم نہ کیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔لیکن ایاک نعبد میں "ایاک " کو مقدم نہ کیا جاتا تو تخصیص نہ پائی جاتی اس طرح مقصد عظیم فوت ہو جاتا۔

اعتراض: " نعبد " صیغہ جمع کا ہے۔اب اس میں دو احتمال ہیں کہ جمع کا صیغہ تعظیم کے لئے لایا گیا۔یا جمع کا معنی مراد لینے کے لئے دونوں صورتیں باطل ہیں۔اس لئے کہ جب عبادت کرنے والا ایک شخص ہے تو جمع لانا کس طرح صحیح ہے؟اور اگر تعظیم کا معنی مراد لیا جائے تو یہ بھی باطل ہے اس لئے کہ وہ عبادت ادا کر رہا ہے۔عبادت کرتے ہوئے انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے عجز کا اظہار کرے ، تعظیم اور رفعت تو تکبر پر دلالت کرتی ہیں۔رب تعالیٰ کے حضور اپنی عظمت کا ذکر کیسے صحیح ہے۔

جواب: دونوں لحاظ پر جمع کا صیغہ درست ہے۔خواہ تعظیم کے لئے مراد ہو یا جمع کا معنی ہی مراد لیا جائے ہر ایک معنی مراد لینے میں ایک خصوصی کمال پایا جاتا ہے۔

جمع کا صیغہ بوجہ تعظیم: یہ اصل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیضان ہے بندے کو خصوصی انعام سے نوازا گیا ہے گویا کہ یوں کہا گیا ہے اے انسان جب تو نماز سے باہر ہو اور اکیلے کوئی کام کرے تو یہ کہہ کہ "میں نے یہ کام کیا ہے" یہ نہ کہہ کہ "ہم نے یہ کام کیا ہے" بیشک تیرے ساتھ ہزاروں غلام ہی کیوں نہ ہوں۔لیکن جب تو نماز میں آئے اور میری عبودیت کا اظہار کرے تو اب کہہ "نعبد " ہم عبادت کرتے ہیں۔تا کہ سب لوگوں کو پتہ چل جائے " کل من کان عبدالنا کان ملک الدنیا والآخرۃ " کہ جو رب کا عبد ہے وہ دنیا اور آخرت کا بادشاہ ہے۔وہ اکیلا نہیں اس کے ساتھ اس کی

رعایا بھی ہے۔

اور سب سے عظیم بات یہ ہے کہ "نعبد" میں بظاہر اپنی عظمت اور تکبر نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں اس میں عجز پایا جاتا ہے لیکن "اعبد" میں بظاہر عجز ہے لیکن حقیقت میں اس میں تکبر کی بو پائی جاتی ہے۔اس لئے کہ جب کہے گا"ایاک اعبد" تو اس کا مطلب ہوگا "انی انا العبد" میں ہی تیری عبادت کر رہا ہوں۔اس میں جہاں رب تعالیٰ کی عبادت کی تخصیص ہے وہاں اپنا عبادت گزار ہونے کا بھی دعویٰ پایا گیا۔جب یہ کہا جائے کہ میں عبادت گزار ہوں تو اس میں انداز تکبرانہ ہے۔لیکن جب یہ کہے گا "اِیاکَ نَعْبُدُ" ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں تو اس میں گویا کہ وہ انسان یہ کہہ رہا ہے کہ اے اللہ تیرے بندے تیری عبادت کرتے ہیں اور تیرے بندوں میں سے میں بھی ایک عاجز بندہ ہوں۔

اب واضح ہوگیا کہ عبادت کرتے ہوئے"میں" اور"ہم" کہنے میں کیا فرق ہے۔اور خصوصاً ظاہر و باطن میں ایک عجیب فرق ہے۔یہی وجہ ہے کہ "من تواضع للہ رفعه اللہ و من تکبر وضعه اللہ" جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے لئے عجز اختیار کیا رب تعالیٰ نے اسے رفیع (بلند) مقام عطا کر دیا۔اور جس نے تکبر کیا رب تعالیٰ نے اسے پست کر دیا۔

جمع کا صیغہ بحیثیت جمع: جب جمع کا صیغہ ذکر کیا جائے۔اور مراد بھی جمع ہی لیا جائے۔ تو اس میں بھی خصوصی کمالات پائے جاتے ہیں ۔ان کمالات پر دلالت کرنے والی بھی مختلف وجوہ پائی گئی ہیں۔

(۱) جمع کے صیغہ میں یہ مسئلہ واضح ہوگیا ہے کہ انسان کو چاہئے کہ نماز جماعت سے ادا کرے۔جماعت سے نماز ادا کرنے میں بہت بڑی فضیلت پائی جاتی ہے۔

☆ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا"التکبیرة الاولی فی صلوة الجماعة خیر من الدنیا وما فیھا" جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے میں پہلی تکبیر میں ہی وہ ثواب ہے جو دنیا اور دنیا کی ہر چیز سے بہتر ہے۔

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" صلوة الجماعة تفضل صلوة الفذ بسبع وعشرين درجة " جماعت سے نماز ادا کرنا، اکیلے ادا کرنے سے ستائیس درجہ افضل ہے۔ (بخاری ،مسلم ،مشکوۃ باب الجماعة وفضلها)

پھر ایک عجیب حکمت کو دیکھئے مسئلہ یہ ہے کہ انسان کچا پیاز یا تھوم کھا کر مسجد میں نہ آئے تا کہ دوسرے انسانوں کو اس سے تکلیف نہ ہو گویا کہ یہ واضح ہو گیا کہ جماعت سے نماز ادا کرنے میں بڑا ثواب ہے۔لیکن وہ ثواب مکمل نہیں ہوسکتا جب کہ کوئی انسان دوسرے انسان کو پیاز اور تھوم کی بو سے تکلیف پہنچائے:

" فاذا كان هذا الثواب لا يفي بذلك فكيف يفي بايذاء المسلم و كيف يفي بالنميمة و الغيبة و السعاية"

جب جماعت کا ثواب صرف اس وجہ سے مکمل حاصل نہیں ہوتا کہ یہ انسان دوسرے شخص کو پیاز یا تھوم کی بو سے تکلیف پہنچا رہا ہے تو دوسرے مسلمان کو مختلف طریقوں سے ایذا پہنچانا کبھی چغلی سے کبھی غیبت سے کبھی اسے نقصان پہنچانے کی کوشش میں لگے رہنا کب جماعت کے ثواب کو مکمل کرے گا۔

کاش کی مساجد کی کمیٹی کے لوگوں کو یہ سمجھ آجائے۔جو علماء کو ستا کر،ان کی غیبت کر کے،ان کی مخالفت کر کے اپنی نمازوں کو برباد کر رہے ہیں۔ایسے لوگ مساجد کی خدمت سے ثواب کے بجائے عذاب حاصل کر رہے ہیں۔

(۲) انسان جب جماعت سے نماز ادا کر رہا ہوتا ہے۔اس وقت اس کا "نعبد" کہنا واضح ہے کہ اے اللہ ہم سب مل کر تیری ہی عبادت کر رہے ہیں۔لیکن جب اکیلے وہ نماز ادا کر رہا ہو۔تو پھر بھی جمع کا صیغہ ہی استعمال کرے اس لئے کہ اس کی عبادت کے ساتھ فرشتے بھی شریک ہیں۔اب مطلب یہ ہوگا کہ اے اللہ میں اور تیرے فرشتے مل کر تیری ہی عبادت کر رہے ہیں۔اس لئے جمع کا صیغہ " نعبد " (ہم عبادت کر رہے ہیں) ہی استعمال ہوگا۔

(۳) تمام مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔اگر یہ "ایاک اعبد" پڑھتا تو اس میں وہ اپنے عبادت کا تذکرہ تو کرتا لیکن اپنے دوسرے مومنین بھائیوں کی عبادت کا کوئی ذکر نہ ہوتا۔جب وہ "

ایاک نعبد" کہتا ہے تو وہ اپنی عبادت کے ساتھ دوسرے مشرق ومغرب شمال وجنوب میں رہنے والے مومن بھائیوں کی عبادت کا تذکرہ بھی کرتا ہے۔گویا کہ وہ اپنے مومن بھائیوں کی مہمات کی اصلاح میں کوشش کرتا ہے:

" واذا فعل ذلک قضی اللہ مهماته لقوله علیه السلام من قضی لمسلم حاجة قضی اللہ له جمیع حاجاته "

جب انسان دوسروں کی مشکلات کی بہتری کی کوشش کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ اس کی مشکلات کو دور فرماتا ہے۔اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو کسی مسلمان کی حاجت کو پورا کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ اس کی تمام حاجات کو پورا فرماتا ہے۔

(۴) یہ رب تعالیٰ کا بندے پر خصوصی انعام ہے کیونکہ بندہ جب رب تعالیٰ کی تعریف کرتا ہے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ کہتا ہے تو اسے رب تعالیٰ کے حضور شرف مقبولیت حاصل ہوجاتا ہے۔اب یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے گویا کہ یوں آواز آتی ہے:

" فوضت الینا جمیع محامد الدنیا والآخرة فقد عظم قدرک عندنا وتمکنت منزلتک فی حضرتنا فلا تقتصر علی اصلاح مهماتک وحدک ،ولکن اصلح حوائج جمیع المسلمین فقل ایاک نعبد وایاک نستعین "

اے میرے بندے جب تو نے دنیا اور آخرت کی تمام حمدیں میرے سپرد کردیں تو تیرا مرتبہ میرے نزدیک عظیم ہو چکا ہے اب صرف اپنی حاجات اور مشکلات کی اصلاح میں کوشش نہ کر۔بلکہ تو تمام مسلمانوں کی حاجات کو پورا کرنے کیلئے میرے حضور یوں عرض کر ﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں۔

گویا کہ آسان لفظوں میں یہ کہا جائے خلوص دل سے رب تعالیٰ کی حمد بیان کرنے والا اور عبادت کرنے والا رب تعالیٰ کا مقبول ہوجاتا ہے مقرب ہوجاتا ہے اندازہ لگائیں کہ جمع کے صیغہ میں کیا کمال ہے اور کتنی ہی زیادہ عجیب حکمت ہے۔وہ مسئلہ یہ ہے ، ایک شخص کو کسی دوسرے سے خود رب

تعالیٰ دوسرے مسلمانوں کا حاجت روا بنا دیتا ہے۔

(۵) ایک شرعی مسئلہ کو سامنے رکھئے! اگر ایک شخص دوسرے سے مثال کے طور پر دس بکریوں کا ایک ہی سودا کرے کہ میں ان تمام دس بکریوں کے تمہیں دس ہزار روپے دوں گا۔ بعد میں اسے ایک بکری پسند نہ آئے تو وہ ایک بکری واپس نہیں کرسکتا کہ اس میں عیب ہے۔ بلکہ یا تمام رکھے یا تمام واپس کرے۔

اب اس مسئلہ کے بعد توجہ کریں کہ بندہ رب کے حضور گویا کہ یوں عرض کرتا ہے اے مولائے کائنات میری عبادت اس درجہ کی نہیں کہ میں تیرے حضور پیش کرسکوں کیونکہ وہ تقصیرات کے ساتھ ملی جلی عبادت ہے۔ وہ کوتاہیوں پر مبنی ہے اس لئے رب کائنات میں اپنی عبادت کو تیرے عابدین، متقین کی عبادت کے ساتھ ملا کر تیری حضور پیش کر رہا ہوں ہوسکتا ہے کہ ان کی کامل عبادت سے مل کر میری ناقص عبادت بھی تیرے حضور شرف قبولیت عطا کرے۔

اب مسئلہ جو بیان کیا ہے اس کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں کہ یہ ہو نہیں ہوسکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ جو رب العلمین ہے اور رحمٰن ورحیم ہے تمام متقین کی عبادت کو رد کردے۔ جب سب کی عبادت قبول ہوگی۔ تو یہ اس کی شان کریمی سے دور ہے کہ ایک کی عبادت کو رد کردے:

" وحننیذ عبادۃ ھذا القائل مقبولۃ ببرکۃ قبول عبادۃ غیرہ "

''اس وقت اس شخص کی عبادت دوسروں کی عبادت کی برکت سے قبول ہوجائے گی''

گویا یہ شخص عرض کرتا ہے کہ مولائے کائنات اگر میری عبادت قبولیت کے قابل نہیں تو اسے رد نہ کر کیونکہ میں اکیلا نہیں میرے ساتھ تو تیرے مقبول بندوں کی عبادت بھی ہے۔ لہذا انبیاء کرام ملائکہ اور اولیاء کرام کی عبادت کے وسیلہ جلیلہ سے ہر شخص کی عبادت قبول ہوجائے گی، خواہ عبادت کرنے والا اپنی عبادت میں کوتاہیاں ہی کیوں نہ کرے۔

کمالات عبادت:

جس شخص کو عبادت کے فوائد اور کمالات کا پتہ چل جائے وہ عبادت میں مشغولیت آسان سمجھے گا۔ اور دوسرے کاموں میں مشغولیت کو مشکل سمجھے گا۔ اس میں چند وجوہ پائی جاتی ہیں:

(۱) کمال خود ذاتی طور پر محبوب چیز کا نام ہے۔ انسان کے احوال میں کمال اور قوت پیدا ہوتی ہے

جب وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی سعادت حاصل کرنے میں مشغول ہوتا ہے۔اس کا دل انوار الالٰہیہ سے جگمگانے لگتا ہے۔ذکر اور قراءت کی شرافت کی وجہ سے اس کی زبان کو بھی شرافت حاصل ہوجاتی ہے۔اللہ تعالیٰ کی خدمت کی وجہ سے اس کے اعضاء میں جمال آجاتا ہے۔ان احوال سے ہی عبادت کرنے والے کے مراتب انسانیہ اور درجات بشریہ میں بزرگی اور شرافت آجاتی ہے۔یہی وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے اس کی سعادت میں روز بروز ترقی ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کے کمالات نمایاں نظر آتے ہیں جو شخص ان چیزوں سے واقف ہوتا ہے اسے عبادت میں خاص ذوق حاصل ہوتا ہے۔وہ عبادت کو روحِ جان سمجھتا ہے اسے عبادت گراں نہیں گزرتی۔

(۲) عبادت امانت ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّا عرضنا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴾

بیشک ہم نے امانت پیش فرمائی آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور آدمی نے اٹھالی۔بیشک وہ اپنی جان کو مشقت میں ڈالنے والا بڑا نادان ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس آیت میں امانت سے مراد طاعت اور فرائض ہیں امانت کے ادا کرنے کا حکم بھی خود رب قدوس نے فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا ﴾ بیشک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں جن کی ہیں انہیں سپرد کر دو۔امانت کا ادا کرنا کامل صفات میں سے ایک صفت کاملہ ہے۔جو خود بذاتہ ایک محبوب کام ہے جب ایک طرف سے امانت ادا کر دی جائے تو دوسری طرف سے بھی اس امین کا خیال کیا جاتا ہے۔

صحابہ کرام میں سے ایک صحابی بیان فرماتے ہیں ایک اعرابی مسجد کے دروازے پر آیا اپنی اونٹنی سے اترا اس نے اونٹنی کو وہیں اسی طرح چھوڑ دیا مسجد داخل ہوکر بڑے اطمینان سے نماز ادا کی اور جو چاہتا تھا وہ دعاء کی۔ہم اس پر تعجب کر رہے تھے (کہ اسے اونٹنی کی کوئی فکر نہیں کہ اونٹنی کو باندھنے کے بغیر اور کسی کے سپرد کرنے کے بغیر چھوڑ آیا ہے) جب وہ نماز دعا وغیرہ سے فارغ ہوکر نکلا اس نے اونٹنی کو نہ پایا تو رب تعالیٰ کے حضور یہ عرض کرنے لگا۔"الھی ادیت امانتک فاین امانتی "اے

اللہ میں نے تیری امانت کو ادا کر دیا میری امانت کہاں ہے۔

راوی کہتے ہیں ہمیں اور زیادہ تعجب ہوا زیادہ دیر نہ گزری کہ ایک شخص اونٹنی پر سوار آیا جس کا ہاتھ کٹا ہوا تھا اس نے اونٹنی اس شخص کے حوالے کر دی "والنکتة انه لماحفظ امانة الله حفظ الله امانته" یہاں سے نکتہ یہ سمجھ آیا کہ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی امانت کی حفاظت کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ اس کی امانت کی حفاظت کرتا ہے۔

یہی مطلب ہے جو نبی کریم ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو ارشاد فرمایا"یاغلام احفظ الله فی الخلوات یحفظک فی الفلوات " اے لڑکے تم اللہ تعالیٰ کے احکام کی حفاظت کرو خلوتوں میں وہ تمہاری حفاظت فرمائے گا وسیع بیابان جنگلوں میں۔

(۳) جب انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہوتا ہے تو وہ غرور وتکبر سے نکل کر سرور کی طرف آ جاتا ہے یعنی اسے عبادت کرنے میں سرور حاصل ہوتا ہے۔جب کہ عبادت سے مانع غرور تھا وہ ختم ہو چکا ہے۔اور عبادت میں مشغولیت کی وجہ سے مخلوق سے توجہ ہٹ جاتی ہے اور خالق کی طرف کامل طور پر توجہ ہو جاتی ہے اس صورت حال سے انسان کو وہ سرور اور لذت حاصل ہوتی ہے کہ دنیا سے اور اپنی ذات سے بے خبر ہو جاتا ہے۔

☆ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ ایک چھت سے ایک سانپ گرا وہاں جو لوگ موجود تھے وہ سب ادھر ادھر بھاگ کھڑے ہوئے لیکن امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ نماز ادا فرما رہے تھے آپ نے نماز کو جاری رکھا آپ کو یہ محسوس بھی نہ ہوا کہ لوگ سانپ دیکھ کر بھاگ رہے ہیں۔

☆ حضرت عروہ ابن زبیر کے کسی عضو کو متعدی زخم کی وجہ سے کاٹنے کی ضرورت درپیش آئی، کہ اگر اس عضو کو رہنے دیا تو گویا کہ متعدی بیماری (کینسر) دوسرے اعضاء کو بھی بیکار کر دے گی۔لیکن اس وقت کے انتظامات کے پیش نظر ایک عضو کو کاٹنا بہت مشکل تھا بیہوش کر کے اپریشن کرنے کا اس وقت تصور نہ تھا۔آخر کار لوگوں نے یہ سوچا کہ جب یہ نماز ادا کر رہے ہوں تو عضو کو کاٹ دیا جائے ایسا ہی کیا گیا آپ کو ذرا بھر علم نہ ہوا کہ میرا عضو کاٹ دیا گیا ہے۔

☆ نبی کریم ﷺ جب نماز شروع فرماتے "کانوا یسمعون من صدرہ ازیزا کازیز المرجل" تو صحابہ کرام آپ کے سینہ مبارک سے اس طرح آواز سنتے جس طرح دیگ کے ابلنے کی آواز آتی ہے۔

☆ اگر تمہاری عقل میں یہ باتیں نہ آئیں تو قرآن پاک پڑھ کر دیکھئے رب تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے تذکرہ میں ارشاد فرمایا﴿ فَلَمَّا رَاَيْنَه' اَكْبَرْنَه' وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ﴾ جب عورتوں نے یوسف کو دیکھا اس کی بڑائی بولنے لگیں اور اپنے ہاتھ کاٹ لئے ۔یعنی مصر کی عورتوں نے جب یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو آپ کے جمال کا ان کے دل پر یہ اثر ہوا کہ وہ غلبہ محبت میں یہاں پہنچ گئیں کہ اپنے ہاتھ اپنے ہی ہاتھوں میں لئے چھریوں سے کاٹ لئے انہیں محسوس نہ ہوسکا۔

جب ایک انسان کے جمال کا یہ اثر ہوسکتا ہے تو ذات کبریاء کی عظمت کا اثر کیوں نہ ہو کہ وہ اپنے آپ سے بے خبر نہ ہو۔پھر یہ بھی خیال رہے کہ رب تعالیٰ محبوب بھی ہے اور اس کا رعب اور ہیبت بھی دلوں پر چھائی ہوئی ہے۔جب ہم دنیا کے بادشاہوں کو دیکھتے ہیں کہ جب ان کا رعب اور دبدبہ کسی پر چھاجائے تو اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ اپنے قریب بیٹھے ہوئے اپنے جانے پہچانے احباب کو بھی نہیں پہچان سکتا تو مالک الملک اور ملک الملوک کے سامنے کھڑے ہونے سے جب یہ کیفیت حاصل ہوجائے تو اس میں کون سا تعجب ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

مختلف اعضاء کی مختلف عبادات: حقیقت میں عبادت یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی تعظیم بجالانا۔شرع میں عبادت کی بہت سی قسمیں ہیں۔بعض کا تعلق ظاہر سے ہے اور بعض کا باطن سے ۔پھر ہر ایک کی مختلف قسمیں ہیں۔

زبان کی عبادت: تلاوت قرآن وتسبیح وتہلیل ودیگر ادعیه خواندن ودعا کردن۔
قرآن پاک کی تلاوت کرنا، سبحان اللہ پڑھنا، لا الہ الا اللہ پڑھنا اور دعائیں پڑھنا اور دعا کرنا۔

آنکھ کی عبادت: "وآنچه تعلق بچشم دار ،دیدن مشاہد خیر مثل کعبه شریف وقرآن مجید ودیدن بزرگان مثل انبیاء واولیاء وزیارت قبور شهداء وصالحان"

وہ عبادت جن کا تعلق آنکھ سے ہے وہ یہ ہے کہ خیر و برکت والے مقامات کی زیارت کرنا، جیسے کعبہ شریف کی زیارت کرنا، قرآن پاک کی زیارت کرنا، بزرگان دین کو دیکھنا، جیسے خوش قسمت لوگوں نے انبیاء کرام کی زیارت کی۔ اسی طرح اولیاء کرام کی زیارت کرنا اور شہداء اور نیک لوگوں کی قبروں کی زیارت کرنا۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ انسان اپنے آپ کو نیکی کے کاموں میں لگائے گا اور رب تعالیٰ کی یاد میں اپنا وقت صرف کرے گا یعنی دراصل یہ عبادت حقیقی کے ذرائع ہیں اس لئے مجازاً انہیں بھی عبادت کا نام دیا گیا ہے۔ اسی طرح آسمان کو دیکھنا، ستاروں کو دیکھنا اور دریا میں کشتی کو دیکھنا تا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی حکمت پر ان چیزوں سے دلیل پکڑے تو یہ بھی حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے اسباب ہیں جو مجازی طور پر عبادت کا درجہ رکھتے ہیں۔

کان کی عبادت: وبگوش شنیدن قران مجید وشنیدن ذکر، وسماع آنچہ محبت او تعالی دردل افزاید وشوق طاعت او بر انگیزد۔

کانوں سے تعلق رکھنے والی عبادت یہ ہے کہ قرآن پاک کو سننا اللہ تعالیٰ کے ذکر کا سننا اور ہر اس کلام کا سننا جو دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کو بڑھائے، اور اس کی طاعت کے شوق کو زیادہ کرے یہ تمام کان کی عبادت کا درجہ رکھتے ہیں۔

ہاتھوں کی عبادت: وبدست نوشتن قرآن ونوشتن اسمای۔

ہاتھ سے تعلق رکھنے والی عبادت یہ ہے کہ قرآن پاک کا لکھنا اور اسماء گرامی لکھنا، مطلق اسماء گرامی سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ وہ اسماء گرامی اللہ تعالیٰ کے ہوں یا رسول اللہ ﷺ کے اسماء گرامی ہوں۔ بلکہ حدیث پاک لکھنا، فقہ اور دینی مسائل پر مشتمل کتب لکھنا سب یہی حکم رکھتی ہیں۔

پاؤں کی عبادت: وپا رفتن بمسجد وبحج وبرائے زیارت صلحاء وبرائے جہاد اعدای او وبکار ادائی بندگان بیچارہ۔

پاؤں سے تعلق رکھنے والی عبادت یہ ہے کہ مسجد میں جانا، حج کے لئے جانا، نیک لوگوں کی زیارت کے لئے جانا، جہاد کے لئے جانا، بیچارے، ضعیف لوگوں کی حاجات کو پورا کرنے کے لئے جانا۔

یہ جو عبادت ذکر کی گئی ہیں ان کا تعلق ظاہر سے ہے باطن سے تعلق رکھنے والی عبادات بھی مختلف ہیں۔

عقل کی عبادت: اللہ تعالیٰ کی آیات میں فکر کرنا، قران پاک کے معانی میں غور وفکر کرنا، اور شریعت کے احکام میں غور وفکر کرنا۔

نفس کی عبادت: جن چیزوں سے انسان کو محبت ہے ان کو چھوڑ کر صبر کرنا نفس کی عبادت ہے روزہ رکھنا، اعتکاف بیٹھنا، مصیبتوں پر صبر کرنا، جزع وفزع کو مصائب پر چھوڑنا، حرام اور گناہوں والے کاموں سے رکنا یہ سب نفس کی عبادات ہیں۔

دل کی عبادت: اما عبادت قلب پس محبت است بمحبوبان او وبغض داشتن به مبغوضان او وامید داشتن از ثواب او وترسیدن از عذاب او.

دل کی عبادت یہ ہے کہ رب تعالیٰ کے محبوبوں سے محبت رکھنا اور رب تعالیٰ جن سے ناراض ہو جو اس کے نزدیک بغض کے مستحق ہیں ان سے بغض رکھنا اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھنا اور اس کی عذاب سے ڈرنا۔

روح کی عبادت: واما عبادت روح پس سعی کردن است درمشاہدہ وانس ولذت یا فتن از مراقبہ او ۔روح کی عبادت یہ ہے کہ رب تعالیٰ کے انوار کی تجلیات کے مشاہدہ کرنے میں کوشش کرنا، اور مراقبہ میں اس کی ذات وصفات سے انس پکڑنا اور لذت حاصل کرنا۔

سر (راز) کی عبادت: واما عبادت سر پس مستغرق بودن در معرفت او۔ راز اور گویا کہ روح کی جان کی عبادت یہ ہے کہ وہ انسان رب تعالیٰ کی معرفت میں مستغرق ہو۔

مال سے متعلق عبادت: ہر وہ نیکی کے کام جن کا تعلق مال سے ہے خواہ زکواۃ ہو، یا صدقہ ہو، یا خیرات یہ سب چیزیں مال سے تعلق رکھنے والی عبادات ہیں۔واز ینجا معلوم شد کہ

عبادت درحقیقت مشغول کر دن است تمام اعضاء وقوی ظاہر وباطن رادرراہ اوبمرضیات او۔یہاں سے واضح ہوگیا کہ عبادت درحقیقت تمام اعضاء اور قوی خواہ ظاہری ہوں یاباطنی۔انہیں اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق اس کی راہ میں لگانا ہے۔(ازعزیزی)

وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ:

جس طرح "ایاک نعبد" میں بیان کیا جاچکا ہے کہ "ایاک" کے پہلے ذکر کرنے کی وجہ سے تخصیص پائی گئی ہے اسی طرح یہاں بھی تخصیص پائی گئی ہے۔"نستعین ای نطلب المعون والتائید والتوفیق" نستعین کا معنی یہ ہے کہ ہم امداد طلب کرتے ہیں۔ہم تائید طلب کرتے ہیں ہم توفیق طلب کرتے ہیں اور "ایاک نستعین" کا مکمل معنی یہ ہوا کہ ہم تجھ سے ہی امداد طلب کرتے ہیں ہم تجھ سے ہی تائید طلب کرتے ہیں ہم تجھ سے ہی توفیق طلب کرتے ہیں۔ (قرطبی)

یہاں استعانت کی دوقسمیں:

"والمراد طلب المعونة فی المهمات کلها او فی العبادات" (بیضاوی)

امداد طلب کرنے کے یہاں دو معنی مراد ہیں ایک یہ کہ ہم تمام مہمات ومشکلات میں تجھ سے ہی امداد طلب کرتے ہیں۔دوسرا معنی یہ ہے کہ ہم عبادت میں تجھ سے ہی امداد طلب کرتے ہیں۔

عبادت میں امداد طلب کرنا:

"وایاک نستعین بک نستعین علی عبادتک ومنک نستوثق علی طاعتک" (تفسیر ابن عباس)

ہم تجھ سے ہی تیری عبادت پر امداد طلب کرتے ہیں اور ہم تجھ سے ہی تیری طاعت پر وثوق طلب کرتے ہیں۔

"قال صاحب الکشاف الاحسن ان یراد الاستعانة به وبتوفیقه علی اداء العبادة" (روح المعانی)

صاحب کشاف نے کہا ہے کہ بہتر یہی ہے کہ یہاں معنی یہ مراد لیا جائے کہ ہم عبادت کے ادا کرنے میں تجھ سے ہی امداد اور تیری ہی توفیق طلب کرتے ہیں۔

عبادت میں امداد طلب کرنا کیوں؟

یہ بات واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معصیت سے اس وقت تک بچنا ممکن نہیں جب تک اللہ تعالیٰ اسے محفوظ نہ رکھے اور اللہ تعالیٰ کی طاعت کی توفیق اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک اللہ تعالیٰ توفیق نہ عطا فرمائے اس پر نقلی اور عقلی دلائل موجود ہیں۔

عقلی دلائل: (۱) جس شخص کو قدرت حاصل ہو تو یقیناً وہ کام کے کرنے اور کام کے چھوڑنے پر ایک جیسا قادر ہے جب تک کام کے کرنے یا نہ کرنے پر وجہ ترجیح نہ پائی جائے تو اس وقت تک کسی ایک پر عمل ممکن نہیں۔ یہ ترجیح کی وجہ بندے سے پائی جانی ممکن نہیں کیونکہ بندے کو آخر کار اللہ تعالیٰ سے ہی طلب کرنا پڑتا ہے واضح ہوا کہ بندہ جو عبادت کا کام کرے گا اس میں اللہ تعالیٰ کی امداد کا محتاج ہوگا۔

(۲) تمام مخلوق دین حق اور سچا اعتقاد طلب کرتی ہے حالانکہ سب قدرت، عقل کوشش اور طلب میں برابر ہیں۔ لیکن بعض لوگ حق کو نہیں پا سکتے اور بعض لوگ حق کو پا لیتے ہیں۔ یقیناً جن لوگوں نے حق کو پالیا ہے ان کا کوئی معین (مددگار) تھا جس کی امداد سے انہوں نے حق کو پالیا ہے:" **وماذاک المعین الا اللہ تعالیٰ لان ذلک المعین لو کان بشرا او ملکا لعاد الطلب فیہ** "وہ مدگار صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اس لئے کہ اگر کسی انسان یا فرشتے کی امداد اور راہنمائی سے اسے راہ حق مل گیا تو وہ بھی دراصل اللہ تعالیٰ کی امداد ہی ہے کیونکہ اس بندے اور فرشتے کا مددگار اللہ تعالیٰ ہے۔

(۳) انسان کبھی کوئی کام کرنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ اس پر عمل نہیں کر سکتا باوجود اس کے کہ کتنا عرصہ ہی اس کے دل میں تمنا پائی جاتی ہے۔ لیکن پھر اچانک وہ کبھی اس کام پر عمل کر لیتا ہے اپنی خواہش کے مطابق کسی چیز کو طلب کر لیتا ہے۔ یہ حالت جو اسے حاصل ہوئی کہ اس کام کے اسباب کا حصول اس کی رکاوٹوں کی دوری اور اس کام کرنے کی توفیق کا حاصل ہونا جس کام کی تمنا تھی اس کا حاصل ہو جانا صرف اللہ تعالیٰ کی امداد سے ہی حاصل ہوا ہے لہذا معلوم ہوا کہ عبادت کرنے کی توفیق رب تعالیٰ سے ہی حاصل ہوتی ہے اس لئے عبادت میں اسی سے امداد طلب کی جائے۔

نقلی دلائل: (۱) ایک تو یہی دلیل ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا" وایاک نستعین " ہم تجھ سے ہی امداد طلب کرتے ہیں جیسا کہ تفسیر ابن عباس اور روح المعانی سے ذکر کر دیا گیا ہے کہ یہاں عبادت میں امداد طلب کرنا مراد ہے۔

(۲) ارشاد باری تعالیٰ ہے "استعینوا باللہ "اللہ سے امداد طلب کرو۔عبادت میں امداد طلب کرنے کو بھی یہ الفاظ مبارکہ شامل ہیں۔ان آیات سے جبریہ اور قدریہ فرقوں کا بھی رد ہو گیا۔جبریہ فرقہ وہ ہے جو انسان کو پتھر کی طرح مجبور مانتا ہے اور قدریہ فرقہ وہ ہے جو انسان کو اپنے اعمال کا خالق مانتا ہے اسی فرقہ کو معتزلہ بھی کہا گیا ہے۔ان کاردان سے اس طرح واضح ہے کہ اگر انسان مجبور محض ہے تو امداد طلب کرنے کا مقصد ہی کچھ نہیں۔اور اگر انسان اپنے اعمال کا خود خالق ہو تو پھر بھی امداد طلب کرنے کا مطلب نہیں نکل سکتا۔اس لئے کہ وہ نیکیوں کو خود پیدا کرنے والا جب ہے تو اسے کسی سے امداد طلب کرنے کی ضرورت نہیں واضح ہوا کہ یہ دونوں فرقے باطل ہیں۔خیال رہے کہ صحیح عقیدہ یہ ہے کہ بندہ ذاتی طور پر کچھ قدرت نہیں رکھتا البتہ رب تعالیٰ نے بندے کو کام کے کرنے نہ کرنے کی قدرت دے رکھی ہے اسی لئے بندہ مختار ہے کہ کام کرے یا نہ کرے۔بندے کو کاسب فعل (کام کرنے والا) کہا جاتا ہے اور رب تعالیٰ افعال کا خالق ہے خواہ وہ افعال خیر ہوں یا شر ہوں۔یہ بھی خیال رہے کہ بری چیز کا کسب برا ہے بری چیز کی تخلیق بری نہیں تخلیق صرف امتحان کے لئے ہے۔(ماخوذ از کبیر)

اعتراض: جب عبادت کے لئے استعانت (امداد طلب کرنا) ہے تو عقل کا تقاضا یہ ہے کہ امداد پہلے طلب کی جاتی اور عبادت بعد میں ﴿اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ کو " ایاک نعبد " سے پہلے ہونا چاہئے تھا بعد میں آنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: اس میں چند وجوہ ہیں:

(۱) عبادت امانت ہے جس طرح رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ﴾

بے شک ہم نے امانت پیش فرمائی آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور آدمی نے اٹھالی۔ اس امانت سے مراد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنھما کے قول کے مطابق طاعت وفرائض ہیں۔ عبادت جب امانت ہے اور امانت کا ادا کرنا بہت اہم ہے تو عبادت کو پہلے ہی ذکر کرنا ضروری تھا۔

(۲) جب متکلم عبادت کی نسبت اپنی طرف کرتا ہے۔ بیشک اوروں کو بھی ساتھ ملاتا ہے پھر بھی وہم ہوتا ہے کہ یہ اپنی عبادت پر اعتبار کر رہا ہے اور اپنے آپ سے صادر ہونا بیان کر رہا ہے جب اس کے بعد ﴿وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ کہتا ہے تو واضح کر دیتا ہے " **ان العبادة مما لاتتم الابمعونة وتوفیق و اذن منه سبحانه** " بیشک عبادت ان چیزوں میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ کی امداد اور توفیق اور اذن کے بغیر حاصل نہیں ہوتیں۔

(۳) عبادت سے جس طرح رب تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے اس طرح استعانت سے تقرب حاصل نہیں ہوتا لہذا عبادت کا پہلے ذکر کرنا ہی ضروری ہے۔

(۴) استعانت عبادت کی قبولیت کا وسیلہ بنایا گیا ہے عبادت مقصود ہے اس لئے مقصد عظیم کو پہلے ذکر کیا گیا تاکہ مقصد اور مقصد کی قبولیت کے ذریعہ اور واسطہ میں فرق پیش نظر رہے۔

(۵) رب تعالیٰ کا بندوں سے مطالبہ ہے کہ میری عبادت کرو بندوں کا رب تعالیٰ سے مطالبہ اور عرض یہ ہے کہ اے اللہ تعالیٰ عبادت کو صحیح ادا کرنے اور اس کی قبولیت میں تو ہی ہماری امداد فرما۔ پتہ چلا کہ عبادت رب تعالیٰ کا مطلوب ہے اور استعانت بندوں کا مطلوب ہے۔ اس لئے بندے کو چاہئے کہ پہلے رب تعالیٰ کے مطلوب کا ذکر کرے اور پھر اپنے مطلوب کا تاکہ بندے کی عبودیت میں خلوص اور صداقت پائی جائے۔

(۶) بندوں پر عبادت لازم ہے۔ سوائے کسی عذر شدید کے انسان کے لئے کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ عبادت کو چھوڑ دے بلکہ جنوں اور انسان کی تخلیق کی وجہ ہی عبادت ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ﴾ اور میں نے جنوں اور انسان کو نہیں پیدا کیا سوائے اس کے کہ وہ میری عبادت کریں۔

(۷) ﴿مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ میں یوم جزاء کا ذکر کیا گیا ﴿اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ میں امداد کی طلب کا ذکر ہوا اور ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾ میں صراط مستقیم پر چلنے کی درخواست پائی گئی ہے۔ عقل بھی یہی چاہتا ہے کہ جب جزاء کے دن کا ذکر کیا گیا تو اس پر رب تعالیٰ کی عبادت کی جائے جب عبادت سے رب تعالیٰ کا قرب حاصل ہوجائے گا تو دعاؤں میں مقبولیت آجائے گی اب امداد طلب کرنے کی دعاء اور ہدایت طلب کرنے کی دعاء میں خصوصی مقبولیت آجائے گی۔ (از روح المعانی)

تمام امور میں رب تعالیٰ سے امداد طلب کرنا:

" وایاک نستعین فی امور الدنیویة والاخرویة کالصحة والغنی والمال والولد واهم الحاجات واداء العبادات " (الجواهر الطنطاوی)

ہم تجھ سے ہی امداد طلب کرتے ہیں تمام کاموں میں خواہ وہ دنیاوی ہوں یا اخروی جیسے صحت تجھ سے ہی طلب کرتے ہیں غناء (مالداری) تجھ سے ہی طلب کرتے ہیں مال تجھ سے ہی طلب کرتے ہیں اولاد تجھ سے ہی طلب کرتے ہیں تمام حاجات کو پورا کرنے کی امداد تجھ سے ہی چاہتے ہیں۔ اور عبادات کے ادا کرنے میں تجھ سے ہی امداد طلب کرتے ہیں۔

ایک اور تقسیم سے استعانت کی دو قسمیں:-

ضروریه / ممکنه ، غیر ضروریة / میسرة۔

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے استعانت کی تقسیم فرماتے ہوئے ذکر فرمایا کہ دو قسمیں ہیں ضروریہ اور غیر ضروریہ اصول فقہ کی کتب نور الانوار وغیر میں ان ہی دو قسموں کے نام ذکر فرمائے۔ ممکنہ اور میسرہ۔

ضروریه / ممکنه: ایک ہی چیز کے دو نام ہیں خواہ ضروریہ کہہ لیا جائے یا اسی کو ممکنہ سے کر دیا جائے:

" الضروریة مالایتاتی الفعل دونه کاقتدار الفاعل وتصوره وحصول آلة

ومادة يفعل بها فيها وعند استجماعها يوصف الرجل بالاستطاعة ويصح ان يكلف بالفعل "

قدرۃ ممکنہ یاقدرۃ ضروریہ اسے کہاجاتا ہے جس کے بغیر کوئی کام کرناممکن ہی نہ ہو جس طرح کام کرنے والے کا کام کرنے پر قادر ہونا۔اس کام کے لئے جن آلات کی ضرورت ہے ان کا پایا جانا اس کام کاتصور،خیال پایاجانا۔جس چیز سے کسی کو بنانا ہے اس چیز کا پایاجانا یعنی کسی چیز کی اصل اور اس کے مادہ کاموجود ہونا۔جب یہ تمام چیزیں پائی جائیں گی تو کہاجائے گا کہ انسان کو استطاعت حاصل ہے۔اسی پر کسی کام کے لازم ہونے اور انسان کے مکلف ہونے کی دار ومدار ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ سے قدرۃ ممکنہ کے طلب کرنے کا یہ مقصد ہے کہ اے اللہ تعالیٰ جب تو نے مجھ پر احکام کوفرض کیا ہے اور بعض کاموں سے اجتناب کرنے کاحکم دیا ہے تو مجھے طاقت بھی عطاء فرما کہ میں تیرے احکام کو بجالاسکوں اور جن کاموں سے تو نے روکا ہے ان سے مجھے رکنے کی طاقت بھی حاصل ہو۔

غیرضروریہ رمیسرہ:

" وغير الضرورية تحصيل مايتيسر به الفعل ويسهل كالراحلة فى السفر للقادر على المشى ويقرب الفاعل الى الفعل ويحثه عليه وهذا القسم لايتوقف عليه صحة التكليف "

قوۃ میسرہ یاغیرضروریہ اسے کہاجاتا ہے کہ کام جس کے ذریعے آسان ہوجائے اورکام کرنے والے کوسہولت حاصل ہوجائے۔جیسے ایک شخص چل سکتا ہولیکن سفر وہ سواری کے ذریعے کرنے کی قوت کوطلب کررہا ہو۔قوۃ میسرۃ اسے بھی کہاجاتا ہے جوکام کرنے والے کوکام کرنے کے قریب پہنچادے اوراسے کام پرابھارے اس قسم پرصحت تکلیف کی دارومدارنہیں۔

یعنی حج اس شخص پرفرض ہوجائے گا جس کے پاس آنے جانے کاخرچ ہوسواری کا کرایہ ادا کرسکے اور جتنی دیر اسے حج کرنے پرصرف ہواتنی دیر کے لئے اس کے اھل وعیال کا خرچ بھی ہو۔حج میں قوت میسرہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ کئی سواریاں ہوں کئی خدام ہوں ۔ ہرطرح کی آسائش حاصل ہو لیکن حج کے فرض ہونے کے لئے یہ قوت حاصل ہوناضروری نہیں۔

تنبیہ : بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص چلنے پر قادر ہو بیشک سواری کا کرایہ ادا کرنے پر نہ قادر ہو تو اس پر حج فرض ہونا چاہئے کیونکہ اسے قوت ممکنہ حاصل ہے لیکن ایسا نہیں اس لئے کہ اللہ تعالٰی کا جو ارشاد ہے ﴿وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً﴾ اللہ کے لئے لوگوں پر حج بیت اللہ فرض ہے جو اس تک پہنچنے کی طاقت رکھیں اس میں استطاعت سے مراد بغیر حرج اور تکلیف کے وہاں جاسکیں۔ اس لئے حج کے لئے جانے میں قوت ممکنہ میں سواری کا ہونا داخل ہے۔ عام معمولی سفر درپیش ہو تو اس میں پیدل چل سکنا قوۃ ممکنہ اور سواری کا ساتھ ہونا قوۃ میسرہ ہے۔

(ماخوذ از بیضاوی ، شیخ زادہ ، نور الانوار ، قمر الاقمار)

قوۃ میسرہ کی دو قسمیں:

قوۃ میسرہ کی پھر دو قسمیں ہیں مثلاً ایک شخص نے گندم کی کٹائی کرنی ہے ، مکان بنانا ہے کوئی ایسا کام کرنا ہے جس میں اسے معاونت کی ضرورت ہے اکیلے وہ کام نہیں کرسکتا تو وہ یہ تمنا رکھے کہ کاش مجھے معاون مل جائیں۔ معاونین کے ملنے کی تمنا کو کہا جائے گا " **طلب استطاعة الیسر** " آسانی کی طاقت طلب کرنا۔ قوۃ میسرہ کی دوسری قسم یہ ہے کہ وہ شخص اپنے احباب یا مزدوروں کو کہے میرے ساتھ مل کر گندم کی کٹائی کر دو ، مکان بنا دو ، گاڑی کو دھکا لگا دو وغیرہ۔ اسے "**طلب الیسر بالشرکة** " کہا جائے گا یعنی یہ طلب ہوگی کہ میرے ساتھ کام میں شریک ہو جاؤ۔

خیال رہے کہ یہ دو قسمیں بیضاوی سے ہی حاصل ہو رہی ہیں۔ ذرا پھر سے غور و فکر سے بیضاوی کی عبارت جو درج کی جاچکی ہے اسے پڑھیں تو "**تحصیل مایتیسر به الفعل** " اور " **او یقرب الفاعل بالفعل** " سے سمجھ آجائیں گی سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی جائے ذہن و ضمیر پر باطل کے تالے لگ جائیں تو سمجھ آنا ممکن نہیں۔ (ماحصل من بیضاوی)

رب تعالٰی سے امداد طلب کرنا حرام بلکہ کفر:

قوۃ میسرہ کی دوسری قسم "**طلب الیسر بالشرکة** " جس کا ابھی ذکر کیا ہے یہ اللہ تعالٰی سے طلب نہیں کی جاسکتی اگر طلب کرے گا تو حرام اور گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا اگر اس کا عقیدہ یہ ہو کہ

رب کائنات یہ کام کرتا ہے تو وہ کافر ہو جائے گا۔

چونکا دینے والا عنوان راقم نے قائم کیا ہے لیکن طیش میں آنے کی بجائے غور وفکر سے کام لیں جوش میں نہ آئیں بلکہ ہوش میں آئیں غصہ سے سر دھننے کو چھوڑ کر تدبر کا سر دھنئے آیئے آپ کو دعوت فکر دیتا ہوں۔

خدارا انصاف کیجئے ! کیا یہ کہنا جائز ہے؟ کہ اے رب کائنات میں اکیلا ہوں میرے ساتھ مل کر تو مجھے گندم کٹوا کر میری امداد کر، میں صرف تجھ سے ہی امداد طلب کرنے کا قائل ہوں۔

کیا یہ کہا جا سکتا ہے؟ کہ میں نے مکان بنانا ہے، اینٹیں اٹھانی ہیں۔ سیمنٹ، ریت، بجری کا کام کرنا ہے۔ یہ سارے کام تو میں سرانجام دے نہیں سکتا میں کسی اور سے امداد طلب کرنا جائز نہیں مانتا اس لئے اے رب قدوس تجھ سے ہی امداد طلب کرتا ہوں یہ میرے کام تو ہی آ کر کر دے۔

کیا یہ کہنا جائز ہے؟ کہ میرے سامنے کھانا پڑا ہوا ہے۔ میری طبیعت سے کچھ زائد ہے۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ یہ ضائع ہو جائے بلکہ میں یہ کھانا ختم کرنے کے لئے امداد طلب کرتا ہوں۔ لیکن اے مولائے کائنات تو جانتا ہے کہ میں تیرے بغیر کسی اور سے تو امداد طلب نہیں کرتا۔ اس لئے تجھ سے ہی امداد طلب کرتے ہوئے درخواست کرتا ہوں ذرا میرے ساتھ کھانے میں شریک ہو جا تا کہ یہ کھانا ختم ہو جائے۔

یہ چند مثالیں صرف سمجھانے کے لئے بیان کی ہیں اس قسم کی ہزاروں صورتیں ایسے ہی ہیں جن میں رب تعالیٰ سے امداد طلب کرنا حرام ہے۔ جائز سمجھ کر امداد طلب کرنا کفر ہے۔

رب تعالیٰ اور اس کے بندوں سے امداد طلب کرنا حرام ہے:

اللہ تعالیٰ نے خود ہی ایک دوسرے کی امداد کا ایک ضابطہ بیان فرما دیا ہے۔ یقیناً اسی ضابطہ کے مطابق ہی امداد طلب بھی کی جائے گی۔ اور کسی کی امداد کی بھی جائے گی ارشاد باری تعالیٰ:

﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ نیکی اور پرہیزگاری پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر باہم مدد نہ کرو۔

یہاں سے یہ مسئلہ روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ کسی قسم کی معصیت پر کسی سے بھی امداد طلب کرنی حرام ہے خواہ بندوں سے طلب کرے۔ یا رب تعالیٰ سے اس لئے کسی کو کہنا ڈاکہ مارنے میں قتل کرنے میں میری امداد کرنا جس طرح حرام ہے اسی طرح رب تعالیٰ سے یہ درخواست کرنی بھی حرام ہے کہ اے اللہ مجھے ڈاکہ مارنے اور قتل و غارت کی توفیق عطا فرما۔

غیر اللہ سے امداد طلب کرنے کے بغیر انسان کی زندگی محال ہے:

اگر یہ کہا جائے کہ استعانت (امداد طلب کرنا) اللہ کے بغیر کسی اور سے ناجائز ہے تو انسان کا زندگی گزارنا ممکن نظر نہیں آتا۔ انسان تو ہر وقت کسی نہ کسی کا محتاج ہوتا ہی ہے غیر اللہ سے امداد حاصل کرتا ہی ہے۔ پیدا ہوتے ہوئے دایہ کا محتاج، پھر تربیت میں ماں باپ کا محتاج، استاذ کا محتاج، درزی کا محتاج، موچی کا محتاج، مستری کا محتاج، دکاندار کا محتاج، سواریوں کے مالکان کا محتاج غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں کسی نہ کسی کا محتاج ہے اس کے بغیر کوئی زندگی گزار کر تو دکھائے۔

تمام امور (کاموں) میں رب تعالیٰ سے امداد طلب کرنیکا کیا مطلب؟

جواہر طنطاوی کے حوالہ سے جو بیان کیا گیا ہے کہ انسان صحت کے حصول، مال کی طلب وغیرہ تمام دنیاوی اور اخروی امور میں اللہ تعالیٰ سے امداد طلب کرے تو اس کا کیا معنیٰ؟ اس کا ایک ہی جواب ہے کہ حقیقت میں امداد کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ لیکن اس نے بندوں کو خود ہی طاقت دے رکھی ہے اور اسباب بنا دیئے ہیں۔ ان اسباب اور ذرائع سے امداد طلب کرنا دراصل اللہ تعالیٰ سے ہی امداد طلب کرنا ہے۔ ڈاکٹر سے دوا لی تو شفا حاصل ہوگئی شفا تو رب تعالیٰ نے ہی دی ہے دوا کو مؤثر چونکہ رب تعالیٰ نے ہی بنایا ہے اور ڈاکٹر کو علم طب رب تعالیٰ نے ہی عطا کیا ہے۔

اللہ مدد، اللہ ہی کافی ہے کا یہی مطلب ہے:

یہ وجہ جو بیان کی جا چکی ہے بس صرف اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اللہ مدد اور ''مجھے اللہ ہی کافی ہے'' کہا جا سکتا ہے۔ جگہ جگہ پر یہی اشتہار لگانے والوں کو چندے کے کیمپ چوراہوں میں لگائے دیکھا

ہوں تو تعجب سے مسکراتے ہوئے وہاں سے گزرتا ہوں کہ سبحان اللہ اشتہار ''اللہ مدد'' اور ''مجھے اللہ ہی کافی ہے'' کے کہاں اور یہ چندہ بٹورنے کے کمپ کہاں؟ ہاں ہاں انہیں بھی یہی کہنا پڑے گا اللہ تعالیٰ ہی ہمیں اغنیاء سے دلارہے ہیں ۔ یہ اغنیاء تو صرف ایک ذریعہ ہیں دینے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ جب ہر مسلمان کا عقیدہ یہی ہے تو اشتہار بازی کا کیا مقصد مسلمانوں کو اختلافات پیدا کر کے اسلام سے متنفر کرنے کا کیا مقصد؟

تنبیہ : انبیاء کرام اور اولیاء عظام کے توسل کو عام طور پر شرک سے تعبیر کر دیا جاتا ہے آیئے پہلے شرک کا معنی سمجھا جائے کہ شرک کیا ہے مسلمانوں کو مشرک بنانے والے حقیقت میں جہلاء ہیں جو علم سے خالی ہیں۔

شرک کسے کہتے ہیں: ''الاشراک هو اثبات الشریک فی الالوهیة بمعنی وجوب الوجود کما للمجوس او بمعنی استحقاق العبادة کما لعبدة الاصنام'' (شرح عقائد ص ۲۱)

یعنی شرک کی دو قسمیں ہیں، ایک یہ ہے کہ مجوسیوں کی طرح مستقل خدا، واجب الوجود اور معبود سمجھ کر کسی دوسرے کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرادیا جائے کیونکہ وہ مستقل طور دو خدا مانتے تھے۔ ایک نیکیوں کو پیدا کرنے والا ہے اور دوسرا برائیوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ نیکیوں کو پیدا کرنے والے خدا کا نام یزدان ہے اور برائیوں کا پیدا کرنے والا خدا اہرمن ہے۔

شرک کی دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ معبود حقیقی کے بغیر کسی اور کو عبادت کا مستحق ہونا تسلیم کیا جائے۔ جس طرح بت پرست اپنے بتوں کو عبادت کے لائق تسلیم کرتے تھے۔ یعنی اگرچہ مجوسیوں کی طرح یہ اپنے بتوں کو مستقل خدا نہیں مانتے تھے لیکن پھر بھی معبود مانتے تھے ان کے سامنے سجدہ کرتے تھے۔ مستقل خدا ماننے کا یہ مطلب ہے کہ وہ خدا خود خالق ہے مخلوق نہیں اپنے وجود میں کسی کا محتاج نہیں۔

بتوں کی پوجا کرنے والے اپنے بتوں کو مخلوق مانتے تھے یہ بھی تسلیم کرتے تھی کہ یہ ہم نے خود تراشے ہیں لیکن وہ اپنے بتوں کو عبادت کا مستحق اس طرح مانتے تھے۔ جس طرح مسلمان اللہ تعالیٰ کو عبادت کا مستحق مانتے ہیں۔

مسلمانوں اور مشرکوں میں امتیازی فرق

مشرکوں کا پہلا فرقہ: (مجوسی)

مشرکوں کا پہلا فرقہ مجوسی ہیں ان کا عقیدہ اگرچہ بیان کیا جاچکا ہے لیکن کچھ وضاحت کی جاتی ہے:

(۱) مجوسی ایک خدا کے ساتھ دوسرا خدا اسی طرح مانتے ہیں جس طرح ایک خدا خالق ہے اسی طرح دوسرا خدا بھی خالق ہے۔

(۲) مجوسی کہتے ہیں کہ جس طرح ایک خدا اپنے وجود میں کسی کا محتاج نہیں اسی طرح دوسرا خدا بھی کسی کا محتاج نہیں۔

(۳) مجوسیوں کا کہنا یہ ہے کہ جس طرح ایک خدا کی ابتداء اور انتہا نہیں اسی طرح دوسرے خدا کی ابتدا اور انتہا نہیں۔

(۴) مجوسیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جس طرح ایک خدا عطا کرنے میں خود مستقل ہے کسی کا محتاج نہیں اسی طرح دوسرا خدا بھی عطا کرنے میں خود ہی مستقل ہے وہ کسی کا محتاج نہیں۔

مسلمان کا عقیدہ:

اس فرقہ کے مدمقابل مسلمانوں کے عقیدہ کو بھی دیکھیے پھر انصاف کیجئے کیا مسلمانوں میں ذرا بھر شرک کی بو بھی پائی جاتی ہے۔ جب ایسا نہیں تو کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کو مشرک بنا کر اپنی عاقبت برباد کی جارہی ہے:

(۱) انبیاء کرام اور اولیاء کرام مخلوق ہیں خالق نہیں۔ خالق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ اپنے وجود میں کسی کا محتاج نہیں لیکن انبیاء کرام اور اولیاء کرام اپنے وجود میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ لیکن انبیاء کرام اور اولیاء کرام کی ابتدا ہے اور انتہا بھی ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ عطا کرنے میں خود قادر ہے کسی کا محتاج نہیں لیکن انبیاء کرام اور اولیاء کرام عطا کرنے میں خود قادر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں یہ رب تعالیٰ سے ہی دلاتے ہیں۔

مشرکوں کا دوسرا فرقہ:

مشرکوں کا دوسرا فرقہ یعنی بت پرست اگرچہ خدا کو بھی مانتے تھے جیسا کہ قرآن پاک میں آتا ہے:

﴿ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ (پ ۲۱)

اگر آپ ان سے سوال کریں زمین وآسمان کا خالق کون ہے تو وہ البتہ ضروری یہی کہیں گے "اللہ"۔

لیکن خدا کو ماننے کے باوجود بتوں کو واجب الوجود نہ ماننے کے باوجود عبادت کا مستحق سمجھتے تھے ان کے اس عقیدہ کو قرآن پاک میں بیان کر دیا گیا ہے کہ وہ بتوں کو صرف وسیلہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ معبود مانتے تھے:

﴿ وَعَجِبُوْۤا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ﴾ (پ ۲۳)

"اور انہیں اس پر تعجب ہوا کہ ان کے پاس ان سے ہی ایک ڈر سنانے والا تشریف لایا اور کافر بولے یہ جادوگر ہے بڑا جھوٹا۔ کیا اس نے بہت خداؤں کا ایک خدا کر دیا ہے بیشک یہ عجیب بات ہے"۔

﴿ اَلَا لِلّٰهِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَی اللّٰهِ زُلْفٰی ﴾ (پ ۲۳ ص ۱۵)

"ہاں خالص اللہ ہی کی بندگی ہے اور وہ جنہوں نے اس کے سوا اور ولی بنا لئے ہیں وہ کہتے ہیں ہم تو انہیں صرف اتنی بات کے لئے پوجتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے پاس نزدیک کر دیں"۔

ان بیان کردہ آیات سے واضح ہوا کہ کافر، مشرکین عرب برملا کہہ رہے ہیں کہ ہم ان بتوں کو خدا مانتے ہیں کیا سارے خداؤں کو ایک مان لیں؟ ہم تو ان کی عبادت کرتے ہیں تاکہ اللہ کے قریب کریں۔

مسلمانوں کا عقیدہ: انبیاء کرام اور اولیاء کرام اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ اس کے مقبول بندے ہیں معبود نہیں انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو معبود ماننا تو بفضلہ تعالیٰ امت مصطفیٰ ﷺ کے کسی جاہل کا عقیدہ بھی نہیں۔ علماء کا یہ باطل عقیدہ کیسا ہو سکتا ہے؟ یہ بہتان عظیم ہے خدارا عقل سے کام لیجئے

مسلمانوں کو مشرک بنانا جہالت عظیمہ ہے جہالت سے بچتے نہیں تو ہم ہی دعا کرتے ہیں "اللھم انا نعوذ بک من الجاھلین المخربین الشیاطین" مشرکوں کے دونوں فرقوں سے مسلمانوں کا امتیازی فرق بیان کردیا گیا ہے اللہ تعالیٰ سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے اور ضد، عناد، ہٹ دھرمی سے بچائے۔ضدی، معاند کا راہ راست پر آنا بہت مشکل ہے۔

اہل سنت و جماعت کا انبیاء کرام اور اولیاء کرام کے متعلق عقیدہ:

(۱) کوئی نبی کوئی ولی معبود نہیں عبادت کے لائق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔
(۲) ہر نبی، ہر ولی کی قبر کے سامنے سجدہ کرنا حرام ہے سجدہ صرف رب قدوس کی ذات کو ہوسکتا ہے۔
(۳) کوئی نبی کوئی ولی رب تعالیٰ کی ذات اور صفات میں اس کا شریک نہیں۔
(۴) اولیاء کرام اور انبیاء کرام کے توسل سے دعا کرنا جائز ہے اور دعا میں قبولیت ہوتی ہے۔
(۵) انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو قبروں میں زندگی حاصل ہے۔
(۶) انبیاء کرام اور اولیاء کرام کے تصرفات بعد از وفات بھی جاری ہیں۔
(۷) انبیاء کرام اور اولیاء کرام کا مشکل کشا ہونا اور دستگیر ہونا اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہے۔گویا کہ یہ ذریعہ ہوتے ہیں حقیقی طور پر یہ صفات اللہ تعالیٰ کو حاصل ہیں۔
(۸) نعمتیں اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے اور یہ اس کی عطا کا ذریعہ ہیں دیتا وہی ہے دلاتے یہ ہیں۔

مفتی محمد شفیع دیو بندی ﴿وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کی تفسیر تفصیلی طور پر بیان کرنے کے بعد بطور خلاصہ یوں ذکر فرماتے ہیں:

> وسیلہ استعانت اور استمداد کے مسئلہ میں بکثرت لوگوں کو اشکال رہتا ہے امید ہے کہ اس تشریح سے اصل حقیقت واضح ہوجائے گی اور یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ انبیاء واولیاء کو وسیلہ بنانا نہ مطلقاً جائز ہے اور نہ مطلقاً ناجائز۔ بلکہ اس میں وہ تفصیل ہے جو اوپر ذکر کی گئی ہے کہ کسی کو مختار مطلق سمجھ کو وسیلہ بنایا جائے تو شرک وحرام ہے۔اور محض واسطہ اور ذریعہ سمجھ کر کیا جائے تو جائز ہے۔(معارف القرآن جلد اول ص۱۰۲)

بفضلہٖ تعالیٰ علماء اہل سنت و جماعت بریلوی کا یہی مسلک ہے کبھی مختار مطلق، قادر مطلق کسی

نبی کسی ولی کو نہیں مانا پھر جھگڑا کس کا؟ آئے دن جہلاء اپنے اکابر کے راستہ سے کیوں ہٹ رہے ہیں۔

مولانا محمود الحسن دیوبندی ﴿وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ پر حاشیہ آپ نے ان الفاظ سے رقم فرمایا:

> اس آیت شریف سے معلوم ہوا کہ اس کی ذات پاک کے سوا کسی سے حقیقت میں مدد مانگنی بالکل ناجائز ہے۔ہاں اگر کسی مقبول بندہ کو محض واسطہ رحمت الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر استعانت ظاہری اس سے کرے تو یہ جائز ہے کہ یہ استعانت درحقیقت حق تعالیٰ ہی سے استعانت ہے۔

مسئلہ واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کو جب رحمت الٰہی کا ذریعہ اس کی عطا کا سبب مانا جائے تو وہ امداد حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہوگی۔مولنا کے متبعین کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ ان کے یہ الفاظ "درحقیقت حق تعالیٰ ہی سے استعانت ہے" کو پڑھیں اور سوچیں وہ کیا لکھ گئے۔اعانت نہیں لکھا بلکہ استعانت لکھا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کو رب تعالیٰ کی عطا کا ذریعہ مان کر ان سے امداد طلب کرنی درحقیقت رب تعالیٰ سے ہی امداد طلب کرنی ہے۔سبحان اللہ ایک اور مسئلہ سمجھ میں آ گیا کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے اس کی صفات کا مظہر ہیں ان کی امداد ظاہری ہوگی ان میں حقیقت رب تعالیٰ کی طاقت جلوہ گر ہوگی۔یہی وجوہ راقم نے "الحمد للہ" کی بحث میں اور "رب العلمین" کی بحث میں اور "الرحمن الرحیم" کی بحث میں علامہ رازی رحمہ اللہ کی تفسیر کبیر سے پہلے ذکر کر دی ہیں اور ساتھ ساتھ نشاندہی کر دی تھی کہ ان عبارات کو دھیان میں رکھا جائے تا کہ ﴿وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ کی بحث میں کام آئیں۔

خلاصہ ان کا یہ ہے کہ جب یہ کہا گیا ہے کہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں تو جب ہم بندوں کی تعریف کرتے ہیں تو پھر رب تعالیٰ سے تخصیص کا کیا معنی ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بندوں کی یا کسی اور چیز کی تعریف کرنی بھی حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی ہی تعریف ہوگی۔کیونکہ ان چیزوں کو قابل تعریف اللہ تعالیٰ نے ہی بنایا ہے۔اسی طرح ﴿رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کا رب ہے حالانکہ بندے بھی بندوں کے مربّی ہیں تو صرف رب تعالیٰ کے مربّی ہونے کا کیا مطلب؟ تو اس کا جواب بھی یہی ہے کہ بندوں کو مربّی اللہ تعالیٰ نے ہی بنایا ہے اس لئے حقیقت میں ربوبیت صرف اللہ تعالیٰ کو ہی حاصل ہے۔

یہی وجہ ﴿ الرحمن الرحیم ﴾ میں بھی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ہی رحمٰن ورحیم ہے تو بندوں کے رحم کرنے کا کیا مقصد ہوگا؟ تو اس کا جواب بھی یہی دیا جائے گا کہ بندوں کی رحمت رب تعالیٰ کی عطا سے ہے لہذا حقیقت میں رحم کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ یہی نکتہ مولنا محمود الحسن صاحب کے حاشیہ سے سمجھ آیا کہ ﴿اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ سے جب یہ واضح ہوا کہ ''ہم صرف تجھ سے ہی امداد طلب کرتے ہیں'' تو اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں سے امداد طلب کرنے کا کیا مطلب تو اس کا جواب مولنا نے یہ دیا کہ اللہ کے مقبول بندوں کو رب تعالیٰ کا واسطہ سمجھا جائے گا تو وہ حقیقت میں امداد رب تعالیٰ سے ہی طلب ہوگی اگرچہ بظاہر مقبولانِ خدا سے استعانت ہوگی کاش کہ یہ بات ان کے اپنوں کو بھی سمجھ آجائے۔

خیال رہے کہ مولنا محمود الحسن صاحب کے ترجمہ قرآن پر سورۃ بقرۃ پر حاشیہ بھی ان کا اپنا ہی ہے اس کے بعد مولنا شبیر احمد عثمانی کا حاشیہ ہے۔

شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں:

'' درینجا باید فہمید کہ استعانت از غیربوجھی کہ اعتماد بران غیر باشد واورا مظہر عون الٰہی ندا ندا حرام است واگرالتفات محض بجانب حق است واور ایکے از مظاہر عون دانستہ ونظر بکار خانہ اسباب وحکمت اوتعالیٰ دراں نمودہ بغیر استعانت ظاہری نماید ،دور از عرفان نخواہد بود ،درشرع نیز جائز ورواست وانبیاء واولیاء ایں نوع استعانت بغیر کردہ اند ودرحقیقت ایں نوع استعانت بغیر نیست بلکہ استعانت بحضرت حق است لا غیر''

(تفسیر عزیزی پ اول ص ۱۰)

﴿ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ﴾ کو سمجھنے کے لئے یہ بات سمجھنی چاہئے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے غیروں سے اس طرح امداد طلب کرے کہ ان پر ہی کلی طور پر اعتماد ہو یعنی ان کو ہی مستقل امداد کرنے والا سمجھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ کی امداد کا واسطہ، ذریعہ اور مظہر نہ سمجھے تو یہ حرام ہے۔ لیکن اگر توجہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہو کہ حقیقت میں امداد کرنے والا وہی ہے لیکن اس نے خود اپنے کارخانہ قدرت میں اسباب بھی بنا

دیئے ہیں ان ظاہری اسباب سے امداد طلب کرنے میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے، یہ عقیدہ رکھنے والا عرفان سے دور نہیں یہی عقیدہ شرع میں جائز ہے۔

انبیاء کرام اور اولیاء کرام سے امداد طلب کرنے کو بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ غیر سے امداد طلب کی جارہی ہے حالانکہ حقیقت میں یہ " استعانت بالغیر "(غیر سے امداد طلب کرنا) ہے ہی نہیں بلکہ یہ استعانت صرف رب تعالیٰ سے ہی ہے اور کسی سے نہیں۔

سبحان اللہ اہل سنت وجماعت بریلوی مسلک کا عقیدہ صاف ستھرا بلا غبار ہے، ابھی تک جو تین حوالے نقل کئے ہیں ان سب کا نچوڑ اور خلاصہ یہ ہے کہ نبیوں اور ولیوں سے مانگنا رب تعالیٰ سے مانگنا ہے، ان سے استعانت رب تعالیٰ سے استعانت ہے، ان کی عطا رب تعالیٰ کی عطا ہے۔ یہی بات میں اپنی طرف سے کہتا تو شائد میری برادری کے لوگ مجھ پر کیا کیا فتوے لگاتے مشرک کہنے سے نیچے ان کا کوئی فتویٰ نہیں۔ لیکن مجھے کچھ کہنے سے پہلے سوچنا کہ تمہارے فتویٰ کی زد میں کہیں مفتی محمد شفیع صاحب، مولنا محمود الحسن صاحب اور شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ تو نہیں آرہے۔ ہاں ذرا ہوش سے ذرا سمجھ سے کام لینا۔

انبیاء کرام اور اولیاء کرام زندہ ہیں:

ابھی جس مسئلہ کو ثابت کیا گیا ہے کہ انبیاء کرام اور اولیاء کرام سے استعانت جائز ہے جب انہیں رب تعالیٰ کی عطا کا واسطہ مانا جائے۔ یہ استعانت اسی وقت ممکن ہوگی جب کہ انبیاء کرام اور اولیاء کرام کی وفات کے بعد زندگی ثابت ہو۔ اس مسئلہ کو تفصیلی طور پر کوئی دیکھنا چاہے تو رئیس المحققین والمدققین استاذی المکرم حضرت علامہ مولنا ابوالحسنات محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی کی کتاب '' جلاء الصدور'' کا مطالعہ کرے۔ یہاں تو بہت مختصر بحث ذکر کی جاتی ہے جس سے کچھ نہ کچھ مسئلہ سمجھ میں آسکے۔ آیئے ذرا توجہ فرمائیں شہید کی زندگی قرآن پاک سے یعنی نص قطعی سے ثابت ہے ارشاد باری ہوتا ہے:

﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴾ (پ ۲)

''اور جو خدا کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں ہاں تمہیں خبر نہیں''۔

یعنی شہید کی زندگی میں شک کرنے والا وہ ہوگا جسے شعور نہیں، خبر نہیں۔ شعور والے تو یقین

رکیں گے کہ یہ رب تعالیٰ کا حکم ہے اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾ اور جو اللہ کی راہ میں مارے گئے ہرگز انہیں مردہ نہ خیال کرنا بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں روزی پاتے ہیں۔

مقام توجہ: جب شہید نبی کریم ﷺ کی امت کا ایک فرد ہونے کی وجہ سے ایسی زندگی حاصل کر لیتا ہے کہ اس کو مردہ کہنا اور مردہ خیال کرنا بھی منع ہے تو یقیناً نبی کو بھی زندگی حاصل ہوگی اس لئے کہ نبی کا مقام شہید کے مقام سے بلند ہے۔ یہ عقل کے بھی خلاف ہے کہ غلام قبر میں زندہ رہیں، اور آقا مردہ (معاذ اللہ) اسی لئے علامہ علی قاری رحمہ اللہ مرقاۃ باب الجمعہ میں " قال ان الله حرم على الارض ان تاكل اجساد الانبياء فنبى الله حى يرزق "(ابن ماجہ، مشکوۃ باب الجمعہ) نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء کرام کے جسموں کو کھائے اللہ کے نبی زندہ ہوتے ہیں ان کو رزق دیا جاتا ہے۔ اس حدیث کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں:

" فان الله تعالىٰ قال فى حق الشهدا من امته بل احياء عند ربهم يرزقون فكيف سيدهم بل رئيسهم لانه حصل له ايضا مرتبة الشهادة مع مزيد السعادة باكل الشاة المسمومة وعودسمها المغمومة " (مرقاۃ)

بیشک اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت کے شہداء کے حق میں فرمایا ہے "وہ اپنے رب کے ہاں زندہ ہیں ان کو رزق دیا جاتا ہے" تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ امت کے شہداء کے سردار بلکہ ان کے رئیس زندہ نہ ہوں جب کہ ان کو مرتبہ شہادت بھی حاصل ہوا ہے اور مزید سعادت بھی حاصل ہے۔ نبی کریم ﷺ کو مرتبہ شہادت اس طرح حاصل ہوا کہ آپ کو خیبر میں ایک یہودیہ نے زہر آلود بکری کا گوشت کھلا دیا تھا۔ وقت وصال وہی زہر کا اثر لوٹ کر آیا تھا اس طرح آپ کو مرتبہ شہادت سے بھی رب تعالیٰ نے نواز دیا تھا۔

تنبیہ: " وانما عصمة الله تعالىٰ من الشهادة الحقيقية للبشاعة الصورية لاظهار القدرة الكاملة بحفظ فرد من بين اعدائه من شر البرية " (مرقاۃ)

آپ کو اللہ تعالیٰ نے ظاہری شہادت سے دو وجہ سے نہیں نوازا۔ ایک وجہ یہ تھی کہ آپ کی ظاہری

شکل مبارک کی شان وشوکت برقرار رہے ایسا نہ ہو کہ کفار آپ کی صورت مبارک میں بگاڑ نہ پیدا کریں۔دوسری وجہ یہ تھی کہ رب تعالیٰ نے اپنی قدرت کو ظاہر فرمایا کہ ایک فرد کو کثیر مخلوق کے شر سے کیسے بچایا۔

فائدہ : اسی حدیث مذکور کی وضاحت بیان کرتے ہوئے علی قاری رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں "اولیاء اللہ لا یموتون ولکن ینتقلون من دارا الفناء الی دار البقاء "(مرقاۃ) اللہ کے ولی مرتے نہیں بلکہ اس فانی دنیا سے باقی رہنے والے جہان کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔

نبی کی زندگی شہید کی زندگی سے اعلیٰ ہے:

شہید کی زندگی اگر چہ نص قطعی سے ثابت ہے لیکن نبی کی زندگی سے کم درجہ ہے کیونکہ شہید زندہ ہونے کے باوجود دنیاوی احکام میں مردہ والے احکام رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ لوگوں کو ان کی زندگی کا شعور نہیں۔

شہید کی زوجہ بیوہ ہوتی ہے: شہید کی بیوہ کو عدت وفات گذارنی پڑتی ہے عدت گزارنے کے بعد جہاں چاہے نکاح کرلے پتہ چلا کہ شہید پر کئی احکام دنیا میں مردہ والے لاگو ہوتے ہیں۔

نبی کی بیویاں نبی کے نکاح میں: اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایا:

﴿ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ﴾ (پ۲۲ص۴)

''اوران کے بعد کبھی ان کی بیبیوں سے نکاح نہ کرو''۔

نکاح کی ممانعت اسی وجہ سے کی گئی کہ نبی زندہ ہوتے ہیں ان کی بیویاں ان کے نکاح میں ہوتی ہیں۔بیوہ نہیں ہوتیں کہ کسی اور سے نکاح کرلیں۔

شہید کی وراثت تقسیم ہوتی ہے: شہید زندہ ہونے کے باوجود جب اس ظاہری دنیا سے چلا جاتا ہے اس کی وراثت تقسیم ہوتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ دنیاوی احکام میں وہ مردہ کی طرح ہے۔

نبی کی وراثت تقسیم نہیں ہوتی: رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

"انا معاشر الانبیاء لانرث ولا نورث ماترکناہ صدقة" ہم انبیاء کرام نہ کسی کے وارث ہوتے ہیں اور نہ ہمارا کوئی وارث ہوتا ہے ہم جو مال چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔

اس سے بھی پتہ چلا کہ نبی کی قبر میں زندگی ایسے ہی ہے جیسے دنیا میں ظاہری طور پر تھی بلکہ دنیا کی زندگی سے اعلیٰ ہوتی ہے۔ اسی پر مولانا اعزاز علی دیوبندی کی عبارت ملاحظہ فرمائیں جو انہوں نے نور الایضاح باب زیارۃ النبی کے حاشیہ پر لکھی ہے:

"مثله صلى الله عليه وسلم بعد وفاته كمثل شمع فى حجرة اغلق بابها فهو مستور عمن هو خارج الحجرة ولكن نوره كماكان بل ازيد وهذا حرم نكاح ازواجه بعده صلى الله عليه وسلم لم يجر احكام الميراث فيما تركه لانهما من احكام الموت"

نبی کریم ﷺ کی مثال دنیا سے رخصت ہوجانے کے بعد اسی طرح ہے جس طرح ایک شمع کو باہر سے کمرہ میں لے جائیں اور اس کا دروازہ بند کردیا جائے اگرچہ وہ شمع کمرے سے باہر والوں سے چھپ گئی لیکن اس کی روشنی اسی طرح ہے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ کیونکہ باہر روشنی کم تھی اندر جاکر زیادہ ہوگئی (اسی طرح نبی کریم ﷺ قبر شریف میں اگرچہ باہر والے لوگوں سے مستور ہیں لیکن آپ کی زندگی پہلے سے بھی زیادہ ارفع و بلند ہے) اسی وجہ سے آپ کے دنیا سے رخصت ہوجانے کے باوجود آپ کی ازواج مطہرات سے نکاح کرنا حرام ہے اور آپ کے ترکہ پر وراثت کے احکام جاری نہیں ہوئے کیونکہ یہ دونوں کام مردہ لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

انبیاء کرام اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں:

" اخرجه مسلم عن انس ان النبى ﷺ ليلة اسرى به مر بموسىٰ عليه السلام وهو يصلى فى قبره "

مسلم شریف حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی کریم ﷺ معراج کی رات موسیٰ علیہ

السلام کی قبر سے گزرے تو وہ اپنی قبر میں نماز ادا کر رہے تھے۔

"عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون"

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں نماز ادا کر رہے ہیں۔ (بیہقی)

"عن سعید بن مسیب انہ کان یلازم المسجد ایام الحرۃ والناس یقتتلون قال فکنت اذا حانت الصلوۃ اسمع اذانا یخرج من قبل القبرا لشریف" (طبقات ابن سعد، دارمی)

سعید بن مسیب کہتے ہیں کہ میں مسجد نبوی میں ہی ہوتا تھا جب ایام حرہ کا واقعہ درپیش آیا لوگ جنگ کرنے میں مشغول ہوتے میں قبر شریف سے نماز کے وقت اذان کی آواز سنتا۔

تنبیہ: یزیدی دور میں جب مدینہ طیبہ پر حملہ کیا گیا ظلم وستم ہوا مسجد نبوی میں تین دن تک اذانیں نمازیں بند رہیں اس واقعہ کو ایام حرہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"الانبیاء بعد ما قبضوا ردت الیھم ارواحھم فھم احیاء بھم کالشھداء"

انبیاء کرام کی وفات کے بعد ان کی روحوں کو ان پر لوٹا دیا جاتا ہے وہ اسی طرح زندہ ہیں جس طرح شہداء زندہ ہیں۔ (بیہقی) (انباء الاذکیاء بحیاۃ الانبیاء الحاوی للفتاوی)

نبی کریم ﷺ سے استعانت:

"عن ابی الجوزاء قال قحط اھل المدینۃ قحطا شدیدا فشکوا الی عائشۃ فقالت انظروا قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاجعلوا فیہ کوی الی السماء حتی لایکون بینہ وبین السماء سقف ففعلوا فمطروا مطرا حتی نبت العشب وسمنت الابل تفتقت من الشحم فسمی عام الفتق" (دارمی، مشکوۃ باب الکرامات)

ابوجوزاء سے مروی ہے اہل مدینہ ایک مرتبہ سخت قحط سالی میں مبتلا ہوگئے یعنی بارش نہیں ہو رہی تھی۔ انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آ کر شکایت کی آپ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے مزار انور کو دیکھو اور ان کے حجرہ (یعنی روضہ شریف) کی چھت سے تھوڑا سا سوراخ کر دو۔ یہاں

تک کہ آپ کی قبرانور اورآسمان کے درمیان چھت کا حجاب نہ رہے صحابہ کرام نے ایسا ہی کیا تو اتی کثیر بارش ہوئی جس کی کثرت سے بہت زیادہ گھاس پیدا ہوئی۔درخت سر سبز وشاداب ہوگئے اونٹ (کھا کھا کر) اتنے موٹے ہوگئے کہ چربی کی وجہ سے ان کی کوہانیں پھٹ گئیں اس سال کا نام ہی عام الفتق (پھٹنے کا سال) پڑ گیا۔اسی حدیث کی شرح میں علامہ علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" وقيل انه صلى الله عليه وسلم كان يستشفع به عند الجذب فتمطر السماء فامرت عائشة بكشف قبره مبالغة فى الاستشفاع فلا يبقى بينه وبين السماء حجاب " (مرقاة)

بیان کیا گیا ہے کہ قحط سالی میں جب بھی نبی کریم ﷺ کے وسیلہ سے بارش طلب کی جاتی تو بارش ہوجاتی حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا نے آپ کی قبر کی چھت میں سوراخ کا حکم توسل میں مبالغہ ثابت کرنے کے لئے دیا تاکہ آپ کے اورآسمان کے درمیان کوئی حجاب نہ رہے۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے بعد آپ کے وسیلہ سے دعا کرنے کا حکم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیا اور صحابہ کرام نے اس پر عمل کیا۔اگر یہ ناجائز ہوتا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس کا حکم نہ دیتیں اور نہ ہی صحابہ کرام اس پر عمل کرتے۔ذرا انصاف سے بتائیں کیا یہ نبی کریم ﷺ سے استعانت نہیں؟

استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا مفتی عبد القیوم ہزاروی اپنی عربی کتاب العقائد والمسائل میں توسل کے جواز پر دلیل قائم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" الدليل على ذلک احاديث كثيرة صحيحة صريحة منها مارواه الترمذي والنسائى والبيهقى والطبرانى باسناد صحيح عن عثمان بن حنيف رضى الله عنه ان رجلا اعمى جاء الى النبى صلى الله عليه وسلم فقال يارسول الله ادع الله ان يكشف عن بصرى فقال ان شئت دعوت وان شئت صبرت فهو خيرلک ،قال فادعه فامره ﷺ ان يتوضأ فيحسن وضوئه ويدعو بهذا الدعاء اللهم انى اسئلک واتوجه اليک بنبيک محمد نبى الرحمة ،يا محمد انى اتوجه بک الى ربى فى

حاجتی هذه لتقضی لی ،اللهم شفعه فی فذهب ثم رجع وقد كشف الله عن بصره ، وفی روایة البیهقی فقام وقد ابصر"

(ترمذی ابواب الدعوات ، ابن ماجه صلوة الحاجة نسائی فی عمل الیوم واللیلة ،
بیهقی فی الدلائل باب ماجاء فی تعلیمه الضریر ،بخاری فی التاریخ الکبیر)

(مزید حوالے ''عقائد و مسائل '' میں دیکھیں) توسل کے جواز پر کثیر احادیث موجود ہیں ان میں سے ایک حدیث جو ترمذی ،نسائی ،بیہقی اورطبرانی نے اسناد صحیح سے بیان کی ہے وہ یہ ہے۔عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بیشک ایک نابینا شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا یارسول اللہ! آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے نظر عطا فرمادے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم چاہتے ہو تو میں دعا کر دیتا ہوں اور اگر تم صبر کرو تو تمہارے لئے بہتر ہے۔ اس شخص نے عرض کیا آپ دعا فرمادیں نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو حکم دیا کہ اچھی طرح وضو کر کے آؤ پھر یہ دعا کرو۔

ترجمہ : '' اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیرے نبی محمد جو رحمت ہیں ان کے وسیلہ سے تیری طرف میں متوجہ ہوتا ہوں اے محمد میں تمہارے وسیلہ سے اپنی حاجت کے لئے اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تاکہ وہ میری حاجت پوری فرمائے اے اللہ ان کو (اپنے نبی کریم کو) میرا شفیع بنا ''۔

وہ (نابینا صحابی) گیا پھر واپس لوٹ کر آیا تو اسے نظر حاصل ہو چکی تھی بیہقی کی ایک روایت میں ہے کہ اسے اٹھتے ہی نظر مل گئی۔

حدیث پاک سے حاصل ہوا:

نبی کریم ﷺ کی نظر آنے والے پرفتن دور کی طرف تھی کہ لوگ وسیلہ کے منکر ہوں گے اس لئے آپ نے نابینا صحابی کو اپنے وسیلہ سے دعا کرنے کے متعلق ارشاد فرمایا اور اسے کہا کہ تم دعا کرو حالانکہ اس صحابی نے آپ کو دعا کرنے کے متعلق کہا تھا۔ نبی کریم ﷺ کے وسیلہ سے دعاء کرنے کا طریقہ بھی خود نبی کریم ﷺ بتائیں اور دعا صحابی کریں پھر بھی کسی کو شک رہے تو یوں ہی سمجھیں کہ آپ کے ارشادات پر ابوجہل ،ابولہب کو شک ہی رہا تھا۔

انبیاء کرام سے استعانت:

" ان النبی صلی الله علیه وسلم قال ان الشمس تدنو یوم القیمة حتی یبلغ العرق نصف الاذن فبینماهم کذلک استغاثوا بآدم ، ثم بموسی ، ثم بمحمد صلی الله علیه وسلم الحدیث " (بخاری کتاب الزکواۃ)

بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا تحقیق قیامت کے دن سورج قریب ہوگا یہاں تک کہ پسینہ کانوں کے نصف تک پہنچ رہا ہوگا اسی دوران لوگ حضرت آدم علیہ السلام سے فریاد طلب کریں گے پھر موسیٰ علیہ السلام سے پھر محمد ﷺ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ الہام ان کو اس استغاثہ کی تعلیم دی جائے گی۔ پتہ چلا کہ انبیاء کرام سے استغاثہ دنیا اور آخرت میں جائز ہے۔ اسی کا نام استعانت بھی۔
(از العقائد والمسائل ص ۴۲)

سید امام احمد بن زینی دحلان رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" والحاصل ان مذهب اهل السنة والجماعة جواز التوسل والاستغاثة بالاحیاء والاموات لانا لانعتقد تاثیرا ولا نفعا ولاضرا الا الله وحده لا شریک له والانبیاء لا تاثیر لهم فی شئی وانما یتبرک بهم ویستغاث بمقامهم لکونهم احباء الله تعالیٰ " (خلاصة الکلام فی بیان امراء البلد الحرام ص ۳۴۴ بحواله العقائد والمسائل)

اہل سنت وجماعت کا مذہب یہ ہے کہ توسل جائز ہے۔ زندہ اور فوت شدہ کو فریاد کے لئے پکارنا جائز ہے اس لئے کہ ہمارا یہ عقیدہ ہی نہیں کہ وہ ذاتی طور پر کوئی تاثیر رکھتے ہیں۔ بلکہ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ وہ ذاتی طور پر نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی نقصان، ذاتی طور پر یہ قدرت صرف رب تعالیٰ کو حاصل ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ انبیاء کرام اگرچہ ذاتی طور پر کوئی تاثیر نہیں رکھتے لیکن ان سے تبرک حاصل کیا جا سکتا ہے ان کے مرتبہ اور بلندی مقام کی وجہ سے ان سے فریاد طلب کی جا سکتی ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے توسل:

" عن انس ان عمر بن الخطاب رضی الله عنه کان اذا قحطوا استسقی

بالعباس بن عبد المطلب فقال اللهم انا کنا نتوسل الیک بنبیها فتسقنا وانا نتوسل بعم نبینا فاسقنا فسقوا" (رواہ البخاری، مشکوۃ ص ۱۳۲)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں لوگ قحط سالی میں مبتلا ہو گئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے وسیلہ سے بارش کی دعا کی عرض کیا اے اللہ ہم اپنے نبی کریم ﷺ کے وسیلہ سے تجھ سے بارش طلب کرتے تھے تو ہمیں بارش عطا کرتا تھا اب ہم اپنے نبی کریم ﷺ کے چچا کے وسیلہ سے دعا کر رہے ہیں کہ تو ہمیں بارش عطا فرما (ان کی دعا قبول ہوئی) بارش عطا کر دی گئی''۔

اعتراض: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے توسل سے دعا کرنا اس بات کی علامت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ظاہری حیات کے بعد آپ کے توسل سے دعا کرنا جائز نہیں اگر جائز ہوتا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے وسیلہ سے دعا نہ کی جاتی معلوم یہ ہوا کہ زندہ کے وسیلہ سے دعا کرنا جائز ہے۔لیکن جو دنیا سے رخصت ہو گئے ان کے وسیلہ سے جائز نہیں۔

پہلا جواب: اس سے پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد بھی زندگی حاصل ہوتی ہے لہذا زندہ، مردہ کا فرق بیان کرنا ہی بیہودہ ہے۔ جاہلوں نے اسی لئے انبیاء کرام کو مردہ کہنا شروع کر دیا تا کہ اپنے جاہلانہ عقیدہ کو کسی نہ کسی طرح ثابت کیا جا سکے جیسا کہ ان کے دوسرے بھائی نبی کریم ﷺ کی ایک بیٹی ثابت کرتے ہیں تین کا انکار کرتے ہیں کہ کہیں حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی شان نہ ماننی پڑے۔ دلائل کا انداز دونوں یاروں کا ایک جیسا ہے۔

دوسرا جواب: معترضین جو یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے وسیلہ سے دعا کرنا، نبی کریم ﷺ کے وسیلہ سے دعا کرنا، ناجائز ہونے کا تقاضا کرتا ہے یہ غلط ہے:

" فان التوسل کما ہو جائز بالاحیاء کذالک جائز بالاموات وعمر رضی اللہ عنہ فعل احد الجائز ین وھذا کما یستدل احد بان التوسل بالاعمال الصالحۃ لیس بجائز والالما توسل عمر بالذات وھذہ

سفسطة ظاهرة" (البصائر)

جس طرح زندہ کے وسیلہ سے دعا کرنا جائز ہے اسی طرح جو حضرات دنیا سے رخصت ہو جائیں ان کے وسیلہ سے دعا کرنا بھی جائز ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دو جائز کاموں میں سے ایک جائز پر عمل کیا ہے آپ کے ایک جائز کام پر عمل کرنے سے دوسرے جائز کو ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔

یہ اعتراض تو اس طرح ہے جیسے کوئی شخص اس سے یہ دلیل پکڑے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چونکہ ایک ذات انسان یعنی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے وسیلہ سے دعا کی لہذا نیک اعمال کے وسیلہ سے دعا کرنا جائز نہیں۔ اگر جائز ہوتا تو آپ نیک اعمال کے وسیلہ سے دعا کرتے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے وسیلہ سے دعا نہ کرتے۔ یہ سوال ایسا لغو اور بے حیثیت ہے جس کی اہل علم کے نزدیک ایک بلبلہ جیسی بھی حیثیت نہیں۔ بلکہ معترض کی اس اعتراض سے جہالت ظاہر ہو رہی ہے۔

پس یہی سمجھیں کہ نبی کریم ﷺ کے توسل پر اعتراض کی وجہ بھی جہالت و دیوانگی ہے عقل سے دوری کی علامت ہے جب کہ نیک اعمال سے استعانت (امداد طلب کرنا) قرآن وحدیث سے ثابت ہے تو اس ناپختہ دلیل سے قرآن وحدیث کا انکار کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

آیئے ایک مثال قرآن پاک سے اور ایک حدیث پاک سے پیش کرتا ہوں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

☆ ﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ﴾ (پ ۲)

''اے ایمان والو نماز اور صبر سے امداد طلب کرو''۔

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تین آدمی راستہ میں چل رہے تھے کہ بارش آگئی وہ پہاڑ کی غار میں چلے گئے پہاڑ سے ایک پتھر گرا جس نے غار کے منہ کو بند کر دیا وہ اس غار میں بند ہو گئے وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے اپنے اپنے اعمال کی طرف نظر کرو جو تم نے خالص اللہ کے لئے نیکی کے اعمال کئے ہیں ان کے وسیلہ سے دعا کرو شائد اللہ تعالیٰ اس پتھر کو ہٹا دے۔

ایک نے ان سے کہا اے اللہ میرے والدین بوڑھے تھے اور میرے بچے چھوٹے تھے میں بھیڑ بکریاں چراتا تھا جب میں شام کو واپس لوٹتا تو دودھ دوہ کر اپنے بچوں سے پہلے اپنے والدین کو پلاتا ایک دن میں کہیں دور چلا گیا جب میں شام کو واپس لوٹا تو میں نے والدین کو سویا ہوا پایا میں نے دودھ

دوہا جس طرح پہلے دوہا کرتا تھا دودھ کا برتن لئے ہوئے میں آ گیا اور ان کے سر کی جانب کھڑا ہو گیا میں نے ان کو جگانا ناپسند سمجھا اور بچوں کو والدین سے پہلے دودھ دینا بھی پسند نہ سمجھا میرے بچے بھوک کی وجہ سے چلاتے ہوئے میرے قدموں سے لپٹ رہے تھے صبح تک یہی معاملہ رہا۔ اے اللہ جب تو جانتا ہے کہ میں نے یہ کام فقط تیری رضا کے لئے کیا تھا تو اس پتھر کو اتنا ہٹا دے کہ ہم آسمان کو دیکھ سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے غار کے منہ کو اتنا کھول دیا کہ وہ آسمانوں کو دیکھنے لگے۔

دوسرے نے عرض کیا اے اللہ جس طرح لوگ عورتوں سے محبت کرتے ہیں میں ان سے بڑھ کر اپنے چچا کی بیٹی سے محبت کرتا تھا ایک دن میں نے اس سے اپنی خواہشات کے پورا کرنے کا مطالبہ کیا لیکن اس نے انکار کر دیا کہ پہلے ایک سو دینار پیش کرو۔ میں نے کوشش کر کے ایک سو دینار جمع کر لئے وہ پیسے لے کر میں نے اس سے ملاقات کی۔ جب میں اس سے جماع کرنے کے لئے مکمل تیار ہوا اس نے کہا اے اللہ کے بندے اللہ سے ڈر۔ پردہ بکارت کو نہ کھول میں اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا اے اللہ جب تو جانتا ہے کہ یہ کام میں نے فقط تیری رضاء کے لئے کیا ہے تو اس پتھر کو اور ہٹا دے اللہ تعالیٰ نے اسے اور ہٹا دیا۔

تیسرے نے کہا اے اللہ میں نے ایک شخص کو مزدوری پر لگایا کہ تجھے دو صاع چاول (تقریبا آٹھ کلو) دوں گا۔ جب وہ اپنے کام کو ختم کر چکا تو کہنے لگا کہ میری مزدوری مجھے دو۔ جب میں نے اس کی مزدوری اس کے سامنے پیش کی (اس نے اختلاف کرتے ہوئے) مزدوری کو چھوڑا اور چلا گیا۔ میں ان چاولوں کو کاشت کرتا رہا یہاں تک کہ میں نے ان چاولوں کی پیداوار کے ذریعے کئی گائے خرید لیں اور ان کے لئے ایک چرواہا خرید لیا (یعنی غلام خرید لیا) کچھ عرصہ کے بعد وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا اے شخص اللہ سے ڈر مجھ پر ظلم نہ کر میرا حق مجھے دے دے میں نے اسے کہا جا، وہ گائے اور ان کا چرواہا لے جا۔ اس نے کہا اللہ سے ڈر میرے ساتھ مزاح نہ کر، میں نے کہا میں تمہارے ساتھ مزاح نہیں کر رہا۔ وہ گائے اور ان کا چرواہا لے جا وہ شخص تمام گائے اور چرواہا لے گیا۔ اے اللہ جب تو جانتا ہے کہ یہ کام میں نے صرف تیری رضا کے لئے کیا ہے باقی پتھر کو بھی ہٹا دے تو اللہ تعالیٰ نے باقی پتھر کو بھی ہٹا دیا۔ (بخاری، مسلم، مشکوۃ باب البر والصلۃ)

اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ نیک اعمال کے وسیلہ سے دعا کرنا صرف جائز ہی نہیں ہے بلکہ اس سے مصیبتیں دور ہوجاتی ہیں۔اگر یہ خیال کیا جائے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے وسیلہ سے دعا کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ دعا صرف زندہ شخص کے وسیلہ سے ہوسکتی ہے لہذا نیک اعمال کے وسیلہ سے دعا کرنی منع ہے۔یہ دلیل لغو، من گھڑت، بے حقیت ہے قرآن پاک اور حدیث پاک کا صریح انکار ہے دین سے بغاوت ہے۔

تیسرا جواب: حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے وسیلہ سے دعا بھی حقیقت میں نبی کریم ﷺ کے وسیلہ سے ہی دعا تھی اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا "**اللهم انا كنا نتوسل بنبينا وانا نتوسل اليک بعم نبينا صلى الله عليه وسلم**" اے اللہ ہم اپنے نبی کے وسیلہ سے دعا کرتے تھے اب ہم اپنے نبی کریم ﷺ کے چچا کے وسیلہ سے دعا کررہے ہیں:

" فهذه الاضافة دليل على ان المنظور فيه قرابة النبى ﷺ " (البصائر ص ۲۶)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے وسیلے سے دعا کی وہ نبی کریم ﷺ کا چچا سمجھ کر وسیلہ پیش کیا :"**بعم نبينا**" یہاں اضافت پائی گئی جو دلالت کررہی ہے کہ مقصود نبی کریم ﷺ کی قرابت مقصود تھی ورنہ اور کئی جلیل القدر صحابہ کرام بھی موجود تھے۔اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی دعا بھی اس پر دلالت کررہی ہے کہ حقیقت میں دعا نبی کریم ﷺ کے وسیلہ سے ہی تھی کیونکہ جو آپ نے دعا کی اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں "**اللهم ان القوم توسلوابى لمكانى من نبيک**" اے اللہ بیشک قوم نے مجھے تیرے نبی کا قریبی سمجھ کر میرا وسیلہ پیش کیا۔

چوتھا جواب: یہ کہنا غلط ہے کہ دنیا سے رخصت ہونے کے بعد انبیاء کرام اور اولیاء کرام سے استعانت منع ہے اس سے پہلے "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث نبی کریم ﷺ کے مزار کے توسل سے بارش کی دعا" گزرچکی ہے اور مدارک نے زیر آیۃ ﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ ﴾ کے یہ بیان کیا ہے:

" قيل جاء اعرابى بعد دفنه عليه السلام فرمى بنفسه على قبره وحثا من ترابه على رأسه وقال يارسول الله قلت فسمعنا وكان فيما انزل عليک ولوْ انّهُم اذْ

ظلموا انفسھم ۔۔۔ الایة وقد ظلمت نفسی وجئتک استغفر اللہ ذنبی واستغفرلی من ربی فنودی من قبرہ قد غفرلک " (مدارک)

نبی کریم ﷺ کے دفن ہونے کے بعد ایک اعرابی آیا اور قبراطہر سے لپٹ کر قبر انور کی خاک سر پر ڈالتے ہوئے نہایت حالت زار سے عرض کررہا ہے۔ یارسول اللہ میں نے اپنی جان پر ظلم کیا آپ نے اللہ کا نازل کردہ ارشاد فرمایا ہم نے سنا ﴿وَلَوْ اَنَّھُمْ اِذْ ظَّلَمُوْا اَنْفُسَھُمْ﴾ پوری آیۃ صحابی نے تلاوت کرنے کے بعد عرض کیا یارسول اللہ میں نے اپنی جان پر ظلم کیا اور میں آپ کے پاس حاضر ہوا۔ میں خود تو اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کر رہا ہوں آپ بھی رب سے میرے لئے استغفار فرمائیں قبراطہر سے آواز آئی تمہیں بخش دیا گیا۔

نبی کریم ﷺ کے جبہ مبارک سے استعانت:

نبی کریم ﷺ کا جبہ مبارک تھا جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا۔ اس کے بعد وہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے پاس آیا۔ اس جبہ مبارک کو دھو کر اس کے پانی سے بیمار شفا حاصل کرتے تھے۔

حضرت اسماء فرماتی ہیں:

" وکان النبی ﷺ یلبسھا فنحن نغسلھا للمرض لنشفی بھا"

(مسلم ج ۲ باب تحریم اناء الذھب والفضة علی الرجال)

نبی کریم ﷺ کا وہ جبہ جسے آپ پہنا کرتے تھے ہم اسے مریضوں کی صحت یابی کے لئے دھو کر اس کے پانی کو استعمال میں لاتے تھے مریضوں کو شفا حاصل ہو جاتی تھی۔

اس حدیث کی وضاحت میں علامہ نووی بیان فرماتے ہیں:

"وفی ھذا الحدیث دلیل علی استحباب التبرک بآثار الصالحین وثیابھم "

یعنی اس حدیث پاک میں دلیل ہے کہ آثار صالحین اور ان کے کپڑوں سے تبرک حاصل کرنا مستحب ہے واضح ہوا کہ آثار صالحین سے استعانت صرف جائز ہی نہیں بلکہ مستحب ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام سے بعد از وفات استعانت:

" تخاصم اهل مصر وتشاجر في دفنه كل يجب ان يدفن في محلتهم حتى هموا بالقتال فرأوا ان يعملوا له صندوقا من مر مر وجعلوه فيه ودفنوا في النيل بمكان يمر عليه الماء ثم يصل الى مصر ليكونوا كلهم فيه شرعا "

''حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات کے بعد اہل مصر نے جھگڑا کیا۔تمام نے آپ کو دفن میں کوشش کی کیونکہ ہر ایک یہی پسند کرتا تھا کہ آپ کو ہمارے محلہ میں دفن کیا جاے یہاں تک کہ جنگ کا خطرہ پیدا ہو گیا۔آخر کار اس بات پر صلح ہوئی کہ آپ کو سنگ مرمر کے صندوق میں بند کر کے دریائے نیل میں دفن کر دیا جائے تا کہ وہاں سے پانی گزر کر شہر میں آئے اور سب ہی اس پانی سے فائدہ حاصل کریں۔اس طرح سب کو حضرت یوسف علیہ السلام سے امداد حاصل ہو جائے گی'' (مدارک زیر آیته توفنی مسلماء والحقنی بالصالحین پ ۱۳)

واضح ہوا کہ ہر زمانے میں ایمان والے انبیاء کرام سے مدد طلب کرتے رہے اور ان کو فائدہ حاصل ہوتا رہا۔

علم والوں کی استعانت علم والوں سے:

" قال الامام الشافعي اني لاتبرك بابي حنيفة رحمه الله واجئ الى قبره فاذا عرضت لي حاجة صليت ركعتين وسألت الله عنده قبره فتقضى سريعا "

''حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے تبرک حاصل کرتا ہوں آپ کے مزار انور پر حاضری دیتا ہوں جب کوئی حاجت درپیش آتی ہے تو دو رکعت نماز نفل ادا کرتا ہوں پھر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی قبر کے پاس آ کر اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہوں اللہ تعالیٰ میری حاجت کو جلدی پورا کر دیتا ہے''۔(شامی جلد اول)

" معروف الكرخي بن فيروز من المشائخ الكبار مستجاب الدعوات يستقي بقبره وهو استاذ السري السقطي " (شامی جلد اول)

سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ کرخی بن فیروز جو بہت بڑے مشائخ سے تھے جن کی دعا کو قبول کیا جاتا تھا ان کی قبر سے توسل سے دعا کی جاتی تھی۔

انبیاء کرام سے استعانت تو اولیاء کرام سے استعانت کیوں؟

" قال الشیخ عفیف الدین الیافعی الاولیاء ترد علیهم احوال یشاهدون فیها ملکوت السموات والارض وینظرون الانبیاء احیاء غیر اموات کما نظر النبی صلی الله علیه وسلم الی موسی علیه السلام فی قبره قال وقد تقرر ان ماجاز للانبیاء معجزة جاز للاولیاء کرامة بشرط عدم التحدی " (الحاوی للفتاوی)

'' شیخ عفیف الدین یافعی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے برگزیدہ بندوں پر احوال پیش کیے جاتے ہیں۔ وہ زمین وآسمان کے ملکوت کا مشاہدہ کرتے ہیں اور انبیاء کرام کو زندہ حالت میں دیکھتے ہیں نہ کہ مردہ حالت میں جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا''۔

اس کے بعد شیخ یافعی فرماتے ہیں کہ یہ بات واضح ہے کہ جو چیز انبیاء کرام کے لئے بطور معجزہ ثابت ہوسکتی ہے وہ اولیاء کرام کے لئے بطور کرامت ثابت ہوسکتی ہے۔ البتہ انبیاء کرام کے معجزات چیلنج کے جواب میں ثابت ہوئے ہیں۔ یعنی وہ جب کسی کو کہیں میں تمہارے مطالبہ پر یہ کر کے دکھاتا ہوں تو وہ کر کے دکھا دیتے ہیں لیکن کرامت میں چیلنج اور چیلنج کا جواب نہیں ہوتا۔ اس سے پتہ چلا کہ جس طرح انبیاء کرام سے استعانت جائز ہے اسی طرح اولیاء کرام سے استعانت جائز ہے۔

کاش کی معترضین اپنے اکابر کی بات مانیں:

قصائد قاسمی میں مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند فرماتے ہیں:

مدد کر اے کرم احمدی کہ تیرے سوا
نہیں ہے قاسم بیکس کا کوئی حامیٔ کار

اس شعر میں لفظ ''اے'' ذکر ہے جو ''یا'' کا ترجمہ ہے اس شعر میں نبی کریم ﷺ کا پکار کر استعانت (مدد طلب) کی گئی ہے خاص کر کے ''مدد کر'' لفظ بھی بہت واضح ہے کہ حضور ﷺ سے امداد طلب کی گئی ہے پھر سب کی نفی کر دی گئی کہ اے حضور آپ کے بغیر ''قاسم بیکس کا کوئی حامی کار نہیں''

عجیب بات یہ ہے کہ ہم عربی میں ''یارسول اللہ'' کہہ کر پکاریں تو اس فریاد اور استعانت پر اعتراض ہو لیکن آپ کے مولنا عربی لفظ ''یا'' کا معنی ''اے'' سے پکاریں تو جائز۔ ہم کہیں نبی کریم ﷺ امداد فرماتے ہیں تو ''ایاک نستعین'' کے مخالف ہوجائیں اور اس سے شرک لازم آئے۔ لیکن آپ کے مولنا کہیں کہ نبی کریم ﷺ کے بغیر کوئی امداد کرسکتا ہی نہیں تو یہ عین ایمان ہو۔

ایک ہی کام سے ایک مومن رہے اور دوسرا مشرک ہوجائے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے اس پر تعجب بلکہ افسوس نہ کیا جائے تو اور کیا **کیا جاتے**۔

مولنا اشرف علی تھانوی صاحب نے اپنی کتاب ''نشر الطیب'' کے آخر میں ''شیم الحبیب'' کے عربی اشعار کا ترجمہ کیا ہے۔ جس کا نام ''شیم الطیب'' رکھا ہے اس کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

یاشفیع العباد خذ بیدی ، انت فی الاضطرار معتمدی

دستگیری کیجئے میری ، نبی ، کشمکش میں تم ہی ہو میری ولی

لیس لی ملجا سواک اغث ، مسنی الضر سیدی سیدی

جز تمہارے ہے کہاں میری پناہ ، فوج کلفت مجھ پہ آ غالب ہوئی

غشنی الدھر ابن عبد اللہ ، کن مغیثا فانت لی مددی

ابن عبداللہ زمانہ ہے خلاف ، اے میرے مولیٰ خبر لیجئے مری

ان اشعار میں حرف نداء بھی استعمال ہوا اور حضور ﷺ سے امداد بھی طلب کی گئی ہے ''ایاک نستعین'' کا کوئی خلاف نہیں ہوا۔

مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کے پیر و مرشد حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ نے ایک طویل نعت لکھی ہے ہر شعر کے آخر میں ''یارسول اللہ'' ہے اس کا ایک شعر یہ ہے:

جہاز امت کا کر دیا ہے آپ کے ہاتھوں ، تم اب چاہو ڈباؤ یا تراؤ یارسول اللہ

اس شعر میں اہل سنت و جماعت کا مکمل عقیدہ ذکر کر دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ (اور دوسرے انبیاء کرام اور اولیاء کرام) کو اختیار دیا ہے وہ امت کی کشتی کو پار لگادیں یا ڈبادیں۔

اعتراض: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جبرائیل سے امداد طلب نہیں کی جب کہ آپ

کو آگ میں ڈال دیا گیا تھا اگر اللہ تعالیٰ کے غیروں سے امداد جائز ہوتی تو آپ بھی ضرور جبرائیل سے امداد طلب کرتے۔

پہلا جواب: ابھی تک جو بحث ذکر کی گئی ہے اس سے واضح ہو رہا ہے کہ امداد انبیاء کرام اور اولیاء کرام سے طلب کی جاتی ہے۔ امداد طلب کرنے والے ان کو اپنے آپ سے اعلیٰ اور برتر مانتے ہیں۔

انبیاء کرام سب فرشتوں سے اعلیٰ ہیں۔ اس لئے ابراہیم علیہ السلام نے جبرائیل سے امداد طلب نہیں کی کہ مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں اپنے سے کم درجہ والے سے امداد طلب کروں۔ لیکن یہ بھی خیال رہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ اپنے سے کم درجہ والے سے امداد طلب کرنا جائز نہیں اسی لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا " من انصاری الی اللہ " اللہ کے دین میں میری کون امداد کرے گا " قال الحواریون نحن انصار اللہ " حوارین نے کہا ہم اللہ کے دین میں آپ کی امداد کریں گے۔

واضح ہوا کہ اپنے سے کم درجہ والے سے کوئی شخص امداد نہ طلب کرے تو سنت ابراہیمی پر عمل ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص اپنے سے کم درجہ والے سے امداد طلب کرے تو سنت عیسوی پر عمل ہوگا۔ جس پر کوئی چاہے عمل کرے دونوں راہ انبیاء کرام نے اپنے اپنے عمل سے متعین کر دیئے ہیں۔ کسی کو بھی ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ بھی خیال رہے کہ اپنے سے اعلیٰ درجہ والے سے امداد طلب کرنے کی ممانعت ثابت نہیں کی جا سکتی۔

دوسرا جواب: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توکل کا اعلیٰ معیار قائم کیا۔ ہر انسان سے یہ کیسے ہو سکتا ہے:

" لما قید نمرود رجلیه ویدیه ورماه فی النار جاء جبریل علیه السلام وقال له هل لک من حاجة ؟ فقال اما الیک فلا فقال سله فقال حسبی من سوالی علمه بحالی " (کبیر الجزاء الاول ص ۲۵۴)

" نمرود نے جب ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ، پاؤں کو باندھ کر آپ کو آگ میں ڈال دیا۔ تو آپ کے پاس جبرائیل علیہ السلام آئے اور عرض کیا کہ آپ کو میری کوئی حاجت ہو تو فرمائیں آپ نے فرمایا مجھے تم سے کوئی حاجت نہیں جبرائیل نے کہا اچھا اپنے رب تعالیٰ سے ہی سوال کر لیجئے۔ آپ نے کہا وہ میرے سوال کے بغیر ہی مجھے کافی ہے وہ میرے حال کو جانتا ہے "

سبحان اللہ ! ابراہیم علیہ السلام پر اپنے آپ کو قیاس کرنے والو''اللہ مدد'' اور''اللہ ہی مجھے کافی ہے'' کی اشتہاری بازی کرنے والو کبھی ایسا کر کے تو دکھاؤ۔ کبھی اغنیاء سے چندے کی اپیل، کبھی پولیس سے امداد طلب کرنا، کبھی وکلاء سے امداد طلبی، کبھی ڈاکٹر کے پاس جانا، کبھی مستری کے پاس کام کرنے کی حاجت لے کر جانا، کبھی ایک کے پاس، کبھی دوسرے کے پاس۔ کہنا یہ کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کی سنت پر عمل کر رہے ہیں لیکن یہ صرف زبانی دعوی عمل کا اس کے مطابق نام تک بھی نہیں۔ پھر عذر لنگ یہ پیش کرنا کہ ہم تو مردوں سے امداد طلب کرنا منع کرتے ہیں زندوں سے منع تو نہیں کرتے ذرا یہ تو بتائیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے قیامت تک زندہ رہنے والے جبرائیل کی امداد کو کیا رد نہیں کیا تھا۔ تم پھر زندہ سے امداد کیوں طلب کر رہے ہو۔ کیا ابراہیم علیہ السلام نے رب تعالیٰ سے بھی سوال کرنے کی جبرائیل کی درخواست کو رد نہیں کیا تھا؟ تم گلا پھاڑ پھاڑ کر دعائیں کیوں کرتے ہو؟ اللہ مدد کہنا پھر کیسے صحیح ہوگا۔ پھر زندہ، مردہ کا سوال ہی غلط ہے۔ جب کہ انبیاء کرام اور اولیاء کرام کی وفات کے بعد بھی زندگی ثابت ہے جیسا کہ معمولی بحث اس پر بھی پیش کر دی گئی ہے۔

ہم بھی استعانت (طلب امداد) زندہ سے ہی کر رہے ہیں۔ معاملہ اصل میں قسمت کا ہے کوئی کہہ رہا ہے ہمارا نبی مردہ ہے کوئی کہہ رہا ہے ہمارا نبی زندہ ہے کوئی کہہ رہا ہے ہمارا نبی بے اختیار ہے کوئی کہہ رہا ہے ہمارا نبی با اختیار ہے اسے رب نے مختار بنایا ہے تو تجھے کیا؟ کوئی کہتا ہے ہمارے نبی کو دیوار کے پیچھے کا علم نہیں کوئی کہتا ہے ہمارے نبی کو لوح محفوظ کا علم اور ما کان و ما یکون کا علم دے دیا گیا ہے جھگڑا کچھ نہیں اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔

حرف آخر: انبیاء کرام اور اولیاء کرام سے استعانت کے جواز پر شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ اور مفتی محمد شفیع صاحب اور مولنا محمود الحسن کے جو فتاوی ذکر کیے ہیں کہ کون سی استعانت جائز ہے۔ اور کون سی استعانت ناجائز ہے وہی عقیدہ اہل سنت و جماعت بریلوی مسلک کا ہے۔ یعنی انبیاء کرام کے توسل سے دعا رب تعالیٰ سے مانگنا واسطہ انبیاء کرام اور اولیاء کرام کا یا آسان لفظوں میں یوں کہیں کہ ہمارا عقیدہ یہ ہے دیتا وہ اور دلاتے یہ ہیں۔ اسی طرح انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو اس عقیدہ سے پکارنا کہ ان کو رب تعالیٰ مطلع فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہی ان کو تصرفات کی اجازت دے رکھی

ہے۔اس عقیدہ کو مختصر طور پر بیان کر دیا گیا اگر ان حوالوں کو ہی جمع کیا جائے تو ضخیم کتاب بن سکتی ہے۔صرف سمجھانے کے لئے مختصر بیان کر دیا گیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ تفسیری انداز پر یہ بحث بھی طویل ہوگئی ہے لیکن میری اپنی ہی برادری کے حضرات ﴿اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ پر بڑا زور دیتے ہیں۔اسی وجہ سے میرے عزیز قاضی سعید الرحمٰن ابن قاضی عبد الطیف صاحب آف بلاول نے کہا کہ اس مسئلہ پر کچھ تفصیل ضرور ذکر ہو تو اسی اشارہ پر کچھ بحث مختصر ہونے کے باوجود اپنے خیال میں بسیط ہوگئی۔ایک ہی نقطہ یاد رکھیں جو میں نے ذکر کیا ہے اس پر سلف صالحین کا اجماع ہے اس کے خلاف جہلاء کا ضدی گروہ ہے ماننا انہوں نے بھی نہیں منوانا ہمارا خیال بھی نہیں اپنے احباب کو مسئلہ بتانا مقصود تھا۔نبی کریم ﷺ کے ارشادات کو کفار نے نہیں مانا تو میری بات کون مانے گا۔

﴿ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ﴾

(۱)''ہم کو سیدھا راستہ چلا (۲) چلا ہمیں راستہ سیدھا''

''اھد'' امر کا صیغہ ہے ھدایۃ سے لیا ہوا ہے جس کا معنی ہے''ہدایت دے''''نا'' جمع متکلم ضمیر منصوب متصل ہے جس کا معنی ہے''ہمیں'' الھدایۃ دلالۃ بلطف'' ہدایۃ کا معنی ہے مہربانی سے کسی کی راہنمائی کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب ہدایت حاصل ہوگی ساتھ ہی اس کی طرف سے مہربانی اور لطف بھی حاصل ہوگا اور جس کو ہدایت دی جائے گی اس پر بھلائی ہوگی اسی لئے ہدایت کا استعمال بھلائی کے کاموں میں ہوتا ہے۔

اس پر اعتراض یہ ہوگا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا''فاھدوھم الی صراط الجحیم''(فرشتوں کو قیامت کے دن حکم ہوگا کہ اللہ کے بغیر اوروں کی عبادت کرنے والوں کو) ہانکو دوزخ کی طرف۔اس آیت میں ھدایۃ کا استعمال ہے لیکن خیر میں نہیں تو اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ اس میں ''تھکم'' پایا گیا ہے جیسا کہ ﴿فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ﴾ میں تہکم پایا گیا ہے۔مجازی طور پر ھدایۃ کا معنی تقدم بھی آتا ہے، کہا جاتا''ھداہ'' وہ اس سے مقدم ہوا۔اسی سے وحشی جانوروں کے سردار کو''ھو ادی

الوحش" کہا جاتا ہے کہ وہ بھی مقدم ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی اتنی قسمیں ہیں جو شمار میں نہیں آسکتیں اس لئے کہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وإنْ تعُدُّوْا نعْمة اللهِ لا تُحْصُوْها ﴾ اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتیں شمار کرو تو شمار نہیں کر سکو گے۔

البتہ چند قسمیں اس طرح بیان کی جاسکتی ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ قوتیں عطا کی ہیں جن کی وجہ سے انسان مصلحت حاصل کرنے کی قدرت رکھتا ہے جیسا کہ انسان کو رب تعالیٰ نے قوۃ عقلیہ عطا کی، حواس ظاہرہ اور حواس باطنہ عطا کئے۔

(۲) انسان کو رب تعالیٰ نے ایسے دلائل عطا کئے جن کی وجہ سے حق و باطل میں فرق کیا جاسکتا ہے اور صلاح وفساد میں امتیاز کیا جاسکتا ہے اسی طرف رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی سے اشارہ ملتا ہے جب کہ ارشاد فرمایا ﴿وهدينٰهُ النَّجْدَيْنِ ﴾ اور اسے دوا بھری دو چیزوں کی راہ دکھائی (یعنی بچے کو ماں کے دودھ بھرے دو پستانوں کی ہدایت دی) واضح ہوا بچے کو اس کی اصلاح کے لئے دودھ پینے اور نفع مند سمجھنے کی ہدایت رب تعالیٰ نے ہی دی۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول بھیج کر کتابیں نازل فرما کر اپنے بندوں کو ہدایت دی۔ یہ مسئلہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات گرامیہ سے واضح ہورہا ہے ﴿وجعلْنا منْهُمْ ائمَّةً يَهْدُوْنَ بِامْرِنا ﴾ اور ہم نے ان کو (اسحٰق، یعقوب، لوط، ابراہیم علیہم السلام) امام کیا کہ ہمارے حکم سے بلاتے ہیں۔ اور ارشاد ہوا:

﴿ اِنَّ هذا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ ﴾ "بیشک یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھی ہے"۔

(۴) " والرابع ان يكشف على قلوبهم السرائر ويريهم الاشياء كما هي بالوحي او الالهام والمنامات الصادقة وهذا قسم يختص بنيله الانبياء والاولياء " (بیضاوی)

ھدایت کی چوتھی قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں چھپی ہوئی چیزوں کو منکشف کر دیتا ہے اور ان کو چیزیں دکھا دیتا ہے کبھی وحی، کبھی الہام سے، اور کبھی سچے خوابوں کے ذریعے لیکن ہدایت کی یہ

چوتھی قسم صرف انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو حاصل ہوتی ہے۔

غیب کا علم لوگ تو نبی کریم ﷺ کے علم غیب میں بھی شک کرتے ہیں لیکن قاضی بیضاوی رحمہ اللہ علیہ نے تو یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اولیاء کرام کو بھی چھپی چیزوں پر مطلع کر دیتا ہے۔

ھدایۃ کا ایک اور معنیٰ: "قیل الاصل فیه الامالة" بعض نے کہا کہ ھدایت کا معنی مائل کرنا، پھیرنا جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا" انا ھدنا الیک " بیشک ہم تیری طرف میلان کرتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ جب مرض وصال میں مسجد میں نماز کے لئے تشریف لائے تو اسے ان الفاظ مبارکہ سے بیان گیا گیا "یتھادی بین اثنین " دو آدمیوں کے درمیان (ان کے سہارے پر) آپ حرکت فرمارہے تھے۔

اس وجہ سے ہدیہ کو بھی ہدیہ کہا جاتا ہے کہ اس میں بھی وہ چیز ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف منتقل ہوجاتی ہے۔حج سے رکاوٹ وغیرہ جب احرام کے بعد ہو تو احرام سے آزاد ہونے کے لئے حرم میں ذبح کے لئے جو جانور بھیجا جاتا ہے اسے "ھدی " کہا جاتا ہے کہ اسے حرم کی طرف چلایا جاتا ہے۔اب ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾ کا معنی ہوگا ہمارے دلوں کا دین حق کی طرف میلان قائم رکھ (قرطبی)۔

الھدیٰ اور الھدایۃ میں فرق: لغوی معنی کے لحاظ سے دونوں کا معنی ایک ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے "الھدی " کو اپنے ساتھ مخصوص فرمایا کسی انسان کی طرف اسے منسوب نہیں کیا البتہ "ھدایۃ "کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف بھی ہے اور بندوں کو ہدایت دینے کا اختیار بھی اللہ تعالیٰ نے دے رکھا ہے، اس لئے ہدایت رب تعالیٰ کے ساتھ مطلقاً خاص نہیں حقیقی طور پر وہی ہادی ہے اور مجازی طور پر بندے بھی ہادی ہیں۔ (ماحصل من مفردات راغب)

اھتداء: لفظ اھتداء خاص ہے اس سے جو انسان کوشش کرے اپنے اختیار سے خواہ وہ امور دنیا کے حصول میں کوشش ہو، یا اخروی امور کے حصول میں کوشش ہو۔

فائدہ: ھدایت کی تکمیل دو چیزوں پر موقوف ہے ہدایت دینے والے کی طرف سے تعلیم اور

تعریف پائی جائے اور ہدایت حاصل کرنے والے میں صلاحیت پائی جائے، جس طرح بارش زمین میں پودہ جات اگانے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔لیکن بارش کا نفع اسی زمین کو ہوتا ہے۔جس میں اگانے کی صلاحیت ہو۔ریتلی زمین،شور زمین کو بارش سے کوئی نفع نہیں ہوتا اسی طرح ہدایت تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر ایک کو حاصل ہوتی ہے لیکن نفع صرف ان کو ہی ہوتا ہے جن میں ہدایت کو قبول کرنے کی صلاحیت ہو۔

اسی بحث سے ﴿وَاللّٰہُ لَایَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴾(اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا)اور﴿وَاللّٰہُ لَایَھْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ ﴾(اللہ تعالیٰ کافر قوم کو ہدایت نہیں دیتا) کا مفہوم بھی سمجھ آ گیا کہ ان میں سمجھنے، ماننے ،ایمان لانے کی گویا کہ صلاحیت ہی نہیں ۔کہ وہ رب تعالیٰ کی ہدایت سے نفع حاصل کرسکیں۔ (از مفردات راغب)

الصراط: اصل میں سین سے سراط ہے چونکہ طاء حروف مطبقہ سے تھا اور سین مخفضة مہموسة سے تھا اس لئے دونوں کی صفات میں تباین تھالہذا سین کو صاد سے تبدیل کر دیا گیا کیونکہ صاد بھی مطبقہ سے ہے۔

سراط لیا ہوا ہے "سرط الطعام " سے جس کا معنی ہے اس نے طعام کو نگلا۔راستہ کو بھی اسی وجہ سے سراط کہا گیا ہے کہ وہ بھی اپنے پر چلنے والا کو نگل لیتا ہے۔اسی وجہ سے راستہ کو"لقم" (لام پر زبر قاف ساکن) بھی کہا گیا ہے۔کہ وہ چلنے والے کو لقمہ بنالیتا ہے۔یا چلنے والا اسے لقمہ بنالیتا ہے کہ اسے طے کرتا ہے خیال رہے سیدھے راستہ کو"لقم" (لام اور قاف پر زبر) کہا جاتا ہے۔

فائدہ: قریش کی لغت (۱) صاد سے "صراط " ہے اور بنی قیس کی لغت (۲) میں سین سے "سراط " ہے۔اور کچھ باقی حضرات نے صاد کو اس انداز پر پڑھا ہے کہ اس میں معمولی سی "زاء" کی آواز بھی آتی ہے۔اگر چہ تینوں صورتیں جائز ہیں۔تاہم مصحف عثمان رضی اللہ عنہ میں صرف صاد والی لغت ہی استعمال ہے۔اس لئے یہی سب سے بہتر ہے۔ (بیضاوی وشیخ زادہ)

المستقیم:" المستوی لاعوجاج فیه "(روح المعانی) مستقیم کا معنی سیدھا ہونا جس میں ٹیڑھا پن نہ پایا جائے۔

صراط مستقیم بمعنی وسط الطریق:

جب صراط مستقیم صراط مستوی (سیدھے راستہ) کو کہا جاتا ہے۔تو صراط مستوی کو درمیانہ راستہ ہونا ضروری ہے۔اسی لئے ذکر کیا گیا ہے ''الصراط المستقیم وھو الذی یکون معتدلابین الافراط والتفریط'' صراط مستقیم اس راستہ کو کہا جاتا ہے جو افراط اور تفریط کے درمیان ہو۔

(نور الانوار ص ۲)

افراط اور تفریط دونوں ہی مذموم ہیں:

☆ عبادت میں افراط یہ ہے کہ ہندوؤں کی طرح جسے چاہا معبود بنالیا۔اور تفریط یہ ہے کہ دنیا کے مشاغل اور کاروبار زندگی سے اپنے آپ کو فارغ نہ کرے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے کوئی وقت نہ نکالے: چنانچہ معمول فرقہ انگریز ودیگر ملاحدہ است جیسا کہ انگریزوں اور دوسرے بے دین لوگوں کا طریقہ ہے۔

☆ استعانت میں افراط (زیادتی) یہ ہے کہ ہر چیز کو مؤثر سمجھ کر امداد طلب کرے ستاروں کو مؤثر سمجھے، دنوں سے نحوست اور برکت کی کامل تاثیر سمجھتا ہو اور تفریط (نقص، کمی) یہ ہے کہ دوا غذا کو بھی مؤثر نہ سمجھے، کسی قسم کے پرہیز کو بھی غیر مؤثر سمجھے ''ومثل صحبت نیکاں وصحبت بداں ودعاء والتجا درجناب الٰہی ساقط الاعتبار انکارند'' بلکہ نیک لوگوں کی صحبت کے فوائد کا انکار کرے اور برے لوگوں کی صحبت کے نقصانات کو تسلیم نہ کرے اور رب تعالیٰ سے دعا کرنے کے متعلق بھی کہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ (عزیزی)

صراط مستقیم جبر وقدر کے وسط:

جبریہ فرقہ اس کا قائل ہے کہ انسان پتھر کی طرح مجبور محض ہے نہ وہ خالق ہے اور نہ ہی اسے کسب کرنے کا کوئی اختیار ہے جو کام بھی وہ کرتا ہے اس سے جبریہ طور پر اللہ تعالیٰ کراتا ہے یہ فرقہ باطل ہے ان کا مذھب حق مانا جائے تو ثواب وعذاب باطل ہو کر رہ جائیں گے۔قدریہ فرقہ یہ کہتا ہے کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے ان کا مذہب باطل ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہ واللہ

خلقکم وما تعملون ﴿ اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا اور جو تم عمل کرتے ہو۔

اس سے واضح ہوا کہ تمام افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا" القدریة مجوس هذه الامة" قدریہ فرقہ والے اس امت کے مجوسی ہیں۔

ان دونوں فرقوں کے درمیان اہل سنت و جماعت کا مذہب ہے وہی صراط مستقیم ہے اہل سنت و جماعت کا مذہب یہ ہے کہ بندہ کسی چیز کا خالق تو نہیں البتہ اللہ تعالیٰ نے بندہ کو کام کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دے رکھا ہے۔ اسی وجہ سے اسے ثواب حاصل ہوتا ہے اور عذاب بھی ہوگا۔

(نور الانوار مع قمر الاقمار)

رفض وخروج کے درمیان صراط مستقیم:

رافضیوں نے اکثر صحابہ کو چھوڑ دیا اسی وجہ سے وہ رافضی کہلائے انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق وحضرت عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت کا انکار کیا، موزوں پر مسح کا انکار کیا تاکہ ان کا باطل مذہب پاؤں پر مسح کرنا ثابت ہو جائے۔ اور انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی صحابہ کرام کو گالیاں دیں، وہ صحابہ کرام کو گالیاں دے کر محبت علی کا دم بھرتے ہیں۔ یہ مذہب باطل ہے کیونکہ انہوں نے محبت علی میں افراط سے کام لیا ہے۔

خارجیوں نے محبت علی میں تفریط کی ہے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا انکار کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑائیاں کیں بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عداوت کی وجہ سے آپ کے سسر ہونے کے ناطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی گالیاں دیں (معاذ اللہ) یہ مذہب بھی حق سے دور ہے سرے سے باطل مذہب ہے۔

صراط مستقیم ان کے درمیان ہے جو اہل سنت و جماعت کا مذہب ہے کہ صحابہ کرام تمام عادل ہیں۔ اپنے اپنے وقت تمام خلفاء راشدین کی خلافتیں برحق تھیں۔

(نور الانوار مع قمر الاقمار وسر الاسرار)

اسی مسئلہ کو علامہ نووی رحمہ اللہ نے کچھ تفصیل سے بیان کیا ہے عوام وخواص کے فائدہ کے لئے

اسے نقل کر رہا ہوں تاکہ وہ اپنے ایمان کو درست رکھ سکیں" اختلف الناس فی تفضیل بعض الصحابة " بعض لوگوں نے صحابہ کرام کو بعض کو بعض پر فضیلت سے انکار کیا لیکن جمہور حضرات اس طرف ہیں کہ صحابہ کرام میں بعض حضرات کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔

" فقال اهل السنة افضلهم ابوبکر صدیق ثم عمر قال جمهورهم ثم عثمان ثم علی "

" اہل سنت وجماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ تمام صحابہ کرام سے افضل حضرت ابوبکر صدیق، پھر حضرت عمر پھر حضرت عثمان پھر حضرت علی المرتضٰی (رضی اللہ عنہم) ہیں"۔ اہل سنت میں سے بعض حضرات نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر فضیلت دی ہے "والصحیح المشهور تقدیم عثمان " لیکن صحیح اور مشہور یہی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو فضیلت حاصل ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے "قال ابو منصور البغدادی اصحابنا مجمعون علی ان افضلهم الخلفاء الاربعة علی الترتیب المذکور "ابومنصور بغدادی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ہمارے اصحاب اس پر متفق ہیں کہ تمام صحابہ کرام سے افضل چار خلفاء راشدین ہیں۔ ان میں فضیلت کی وہی ترتیب ہے جو ان کی خلافت میں ہے۔ پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا درجہ بھی پہلا ہے۔ اور دوسرے خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا درجہ بھی دوسرا ہے اور تیسرے خلیفہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا درجہ بھی تیسرا ہے اور چوتھے خلیفہ حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کا درجہ بھی چوتھا ہے۔

" واما عثمان رضی الله عنه فخلافته صحیحة بالاجماع وقتل مظلوما وقتلته فسقة لان موجبات القتل مضبوطة ولم یجر منه رضی الله عنه مایقتضیه "

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت صحیح ہے اس پر اجماع امت ہے آپ کو مظلومیت کی حالت میں شہید کیا گیا۔ آپ کو فاسقوں نے قتل کیا ہے۔ آپ نے ان کی منشاء کے مطابق کام نہیں کیا تو انہوں نے اپنے آپ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے میں حق بجانب سمجھا۔ اور اپنے زعم باطل میں آپ کو شہید کرنے کے اسباب مضبوط سمجھے:

" ولم یشارک فی قتله احد من الصحابة وانما قتله همج ورعاع من غوغاء القبائل وسفلة الاطراف والارزال تخربوا وقصدوه من مصر فعجزت الصحابة عن دفعهم فحصروه حتی قتلوه رضی الله عنه"

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کوشہید کرنے میں کوئی صحابی بھی شریک نہیں تھا۔ بلکہ آپ کو بے وقوف منافقین اور دیہقانیوں نے شہید کیا۔ جومختلف اطراف سے کمینے اور گھٹیا لوگ جمع ہو گئے تھے۔ جنہوں نے تخریب کاری کی یہ مصر سے آئے ہوئے لوگ تھے (جن کا قائد عبد اللہ بن سبا یہودی منافق تھا) ان لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کر کے آپ کوشہید کر دیا، صحابہ کرام ان کے دفاع کرنے سے عاجز آ گئے (کیونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قتال کی اجازت نہیں دے رہے تھے):

" واما علی رضی اللہ عنہ فخلافته صحیحة بالاجماع و کان هو الخلیفة فی وقته لا خلافة لغیره '

'' لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت صحیح ہے آپ اپنے دور کے خلیفہ برحق تھے اس وقت خلافت کا دوسرا کوئی حقدار نہیں تھا''

"واما معاویة فهو من العدول الفضلاء والصحابة النجباء " لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ عادل ، فاضل حضرات میں سے ہیں۔ یعنی عادل اور صاحبِ فضیلت صحابی ہیں۔ اور عظیم المرتبت اور رب تعالیٰ کے مقبول صحابہ میں سے ہیں۔

جولڑائیاں صحابہ کرام کے درمیان واقع ہوئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر گروہ اپنے اپنے شکوک وشبہات کی وجہ سے اپنے آپ کو حق پر سمجھتا تھا یہی وجہ ہے کہ "وکلهم عدول" تمام صحابہ کرام عادل تھے۔ چونکہ ان کے اختلافات اور لڑائیوں میں ہر ایک اپنی اپنی تاویل پیش کرتا (اپنی حقانیت پر دلائل پیش کرتا) اسی وجہ سے "ولم یخرج شئی من ذالک احدا منهم من العدالة " ان میں سے کسی ایک کو بھی ان وجوہ نے عدالت سے نہیں نکالا بلکہ تمام صحابہ کرام بفضلہ تعالیٰ عادل تھے۔ (کوئی بھی ظالم نہیں تھا)۔

ان کے اختلاف ایسے ہی تھے جیسے ائمہ مجتہدین کے اختلافات ہوتے ہیں۔ ان کی اجتہادی خطا کی وجہ سے کسی پر عیب نہیں لگایا جاسکتا (اسی طرح صحابہ کرام کے جو اختلافات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اور خون کا بدلہ لینے کے مطالبہ پر شروع ہوئے وہ کی اجتہادی خطا اور اپنی اپنی طرف سے

دلائل کے پیش کرنے کی وجہ سے تھے لہذا تمام کو عادل اور نیک متقی سمجھا جائے گا بڑے بڑے اولیاء کی ساری عمر کی نیکیاں ان کے ایک لمحہ کے برابر نہیں ہو سکتیں جو انہوں نے نبی کریم ﷺ کی صحبت میں گزارا)۔

جب صحابہ کرام کی لڑائیوں کے اسباب مشتبہ تھے، شدید اشتباہ کی وجہ سے ہر شخص اپنی اپنی رائے کے مطابق عمل کر رہا تھا۔ ہر ایک کے پاس کوئی نہ کوئی دلیل تھی اس صورت حال میں صحابہ کرام کے تین گروہ بن گئے۔ کچھ لوگ ایک گروہ کو حق پر سمجھنے لگے اور ان کی امداد کرنا اپنے آپ کے لئے واجب سمجھنے لگے اور دوسرے گروہ کو باغی سمجھنے لگے اسطرح بعض ایک گروہ سے مل گئے۔ کچھ لوگ دوسرے گروہ کو حق پر سمجھتے ہوئے ان کے ساتھ مل گئے انہوں نے ان کے ساتھ تعاون کرنے کو واجب سمجھا۔ اور دوسرے گروہ کو باغی سمجھا۔ تیسرے حضرات وہ تھے جو کوئی فیصلہ نہ کر پائے بلکہ متحیر رہے کہ کس فریق کو حق پر سمجھا جائے جب ان سے کوئی فیصلہ نہ ہو سکا "فاعتزلوا الفریقین" تو انہوں نے دونوں فریقوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی:

" وکان ھذا الاعتزال ھو الواجب فی حقھم لانہ لایحل الاقدام علی قتال مسلم حتی یظھر انہ مستحق لذالک "

جن لوگوں کو یہ نہ پتہ چل سکا کہ کون سا فریق حق پر ہے ان کا ہر فریق سے کنارہ کش ہونا ان کے لئے واجب تھا۔ اس لئے کہ کسی مسلمان کو ناحق بغیر تحقیق کے قتل کرنا جائز نہیں۔ اگر ان کو معلوم ہوتا کہ ایک فریق حق پر ہے دوسرا باغی ہے تو یقیناً ان کے لئے حق کا ساتھ دینا واجب ہوتا، حق سے کنارہ کشی ان کے لئے لازم نہ ہوتی" ولھذا اتفق اھل الحق ومن یعتد بہ فی الاجماع علی قبول شھاداتھم ورواياتھم وکمال عدالتھم رضی اللہ عنھم "اسی لئے اہل حق کا اس پر اتفاق ہے اور جن لوگوں کا اجماع معتبر ہے وہ اس پر متفق ہیں کہ تمام صحابہ کرام کی شہادات قابل قبول ہیں اور ان کی روایات معتبر ہیں وہ سب ثقہ راوی ہیں اور تمام کامل عادل ہیں "رضوان اللہ علیھم اجمعین" (از نووی شرح مسلم ج ثانی کتاب فضائل الصحابۃ) میں اپنے عزیز طلباء کرام کو عام طور پر دو حدیثیں یاد رکھنے کی ترغیب دیتا ہوں کہ ایمان بڑی چیز ہے:

" عن عبد الله بن مغفل قال قال رسول الله ﷺ الله الله فی اصحابی لا تتخذوهم غرضا من بعدی فمن احبهم فبحبی احبهم ومن ابغضهم فببغضی ابغضهم ومن آذاهم فقد آذانی ومن آذانی فقد آذی الله ومن آذی الله فیوشک ان یاخذه ......رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب" (مشکوۃ باب مناقب الصحابة)

'' عبد اللہ ابن مغفل سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ سے ڈرتے رہو اللہ سے ڈرتے رہو میرے صحابہ کے حق میں ، میرے بعد ان کو مورد طعن و تشنیع نہ بنانا۔ جو شخص ان سے محبت کرے گا وہ میرے ساتھ محبت رکھنے کی وجہ سے ہی ان سے محبت کرے گا۔ اور جو شخص ان سے بغض رکھے گا وہ میرے ساتھ بغض رکھنے کی وجہ سے ہی ان سے بغض رکھے گا۔ جس شخص نے ان کو اذیت پہنچائی اس نے مجھے اذیت پہنچائی۔ جس نے مجھے ایذا (تکلیف) پہنچائی اس نے اللہ کو ایذا پہنچائی جس نے اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچائی قریب ہے کہ اللہ اسے اپنی گرفت میں لے لے''۔

بہت واضح ہوا کہ گستاخ صحابہ درحقیقت گستاخ رسول ہے اور گستاخ رسول درحقیقت گستاخ خدا ہے۔ اور گستاخ خدا قیامت کے دن اسی کی گرفت میں ہوگا۔

محبّ صحابہ کرام درحقیقت محبّ مصطفیٰ ہے۔ اور محبّ مصطفیٰ ہی درحقیقت محبّ خدا ہے اب جس کا جو دل مانے وہ راستہ اختیار کرے چاہے تو گمراہ ہو، چاہے تو مومن رہے ﴿ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾

ہاں خیال رہے کوئی شخص ضعیف ایمان والا حدیث پاک میں " هذا حديث غريب " کے الفاظ دیکھ کر حدیث ضعیف کہہ کہ لوگوں کو گمراہ نہ کرے اس عقل کے اندھے سے پوچھئے کیا حدیث غریب صحیح اور حسن نہیں ہوسکتی۔ غریب وضعیف کا فرق نہ سمجھنا ، طنز صحابہ کرام پر کرنا، سبحان اللہ کیسی علمیت ، جہلاء کا کام ہے شور وغل کرنا ، اور سنجیدہ حضرات کا کام ہے متانت سے بات کرنا، یہی حق وباطل کا فرق ہے:

'' عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ اذا رأيتم الذين يسبون اصحابی فقولوا لعنة الله علی شركم........ رواه الترمذی " (باب مشکوۃ مناقب الصحابة)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم دیکھو ان لوگوں کو جو میرے صحابہ کو گالیاں دے رہے ہوں تو تم کہو اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو تمہارے شر پر۔

سبحان اللہ میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کا کیسا پیارا ارشاد گرامی ہے کہ فتنہ بازوں سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔ صحابہ کرام کی شان میں ان کے گستاخانہ کلمات کو سن کر ان کی فتنہ بازیوں پر لعنت کر و یعنی انہیں منحوس سمجھو اس لئے کہ وہ بد بخت خود تو گمراہ ہیں کہیں تمہیں بھی گمراہ نہ کر دیں۔

اہل سنت و جماعت صراط مستقیم پر:

اہل سنت و جماعت کا شاندار عقیدہ جس میں صحابہ کرام و اہل بیت عظام کی عظمت کا پاس کیا گیا ہے:

" ونعم ماقال الامام فخر الدين الرازى فى تفسيره نحن معاشر اهل السنة بحمد الله ركبنا سفينة محبة اهل البيت واهتدينا بنجم هدى اصحاب النبى ﷺ فنرجو النجاة من اهوال القيامة ودركات الجحيم والهداية الى مايوجب درجات الجنان والنعيم المقيم " (مرقاۃ باب مناقب اهل البيت)

" علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے کتنا اچھا اپنی تفسیر میں بیان فرمایا ہم اہل سنت بحمد اللہ محبت اہل بیت کی کشتی پر سوار ہیں اور صحابہ کرام کی ہدایت کے ستاروں سے ہدایت حاصل کر رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہمیں قیامت کی ہولناکیوں اور جہنم کے تمام طبقات سے نجات حاصل ہو گی اور ایسے راستے کی ہدایت حاصل ہو گی جو ہمیں جنت اور نعیم مقیم میں پہنچا دے گا"۔

علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا عقیدہ اور تمام اہل سنت کا عقیدہ دو حدیثوں کو یکجا جمع کر کے ان کا نچوڑ اور خلاصہ بیان فرمایا ہے۔ ایک حدیث پاک وہی ہے جس کی شرح میں علامہ علی قاری رحمہ اللہ نے علامہ رازی رحمہ اللہ کا یہ قول ذکر فرمایا حدیث پاک کی طرف توجہ فرمائیں:

" عن ابى ذر انه قال وهو اخذ بباب الكعبة سمعت النبى ﷺ يقول الا ان مثل اهل بيتى فيكم مثل سفينة نوح من ركبها نجا ومن تخلف عنها هلك " (رواه احمد ،مشكوة باب مناقب اهل بيت)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بیشک آپ نے کعبہ کے دروازہ کو پکڑ کر فرمایا میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا خبردار بیشک تم میں میرے اہل بیت کی مثال نوح علیہ السلام کی کشتی کی ہے جو اس میں سوار ہوا وہ نجات حاصل کر گیا اور جو

اس میں سوار ہونے سے پیچھے رہ گیا وہ ہلاک ہوگیا۔

دوسری حدیث پاک جس کو اس حدیث سے ملا کر نتیجہ نکالا گیا، وہی نتیجہ اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے۔ وہ حدیث یہ ہے:

" عن عمر بن الخطاب قال سمعت رسول الله ﷺ يقول سألت ربی عن اختلاف اصحابی من بعدی فاوحی الی يا محمد ان اصحابک عندی بمنزلة النجوم فی السماء بعضها اقوی من بعض ولكل نور فمن اخذ بشئی مما هم عليه من اختلافهم فهو عندی علی هدی قال وقال رسول الله ﷺ اصحابی كالنجوم فبايهم اقتديتم اهتديتم " (رواه رزين ، مشكوة باب مناقب الصحابة)

" حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا میں نے اپنے رب سے اپنی موت کے بعد صحابہ کے اختلاف کے متعلق سوال کیا میری طرف وحی کی گئی اے محمد بیشک آپ کے صحابہ میرے نزدیک آسمان میں ستاروں کی مانند ہیں، بعض بعض سے قوی ہیں اور ہر ایک کو نورانیت حاصل ہے ان کے اختلافات میں سے کسی نے کوئی چیز حاصل کر لی وہ میرے نزدیک ہدایت پر ہوگا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے جس کی بھی اقتداء کرو گے ہدایت پا جاؤ گے "

وضاحت حدیث:

نبی کریم ﷺ کا سوال فروع شرائع میں اختلاف کی حکمت کے متعلق تھا۔ آسمان میں ستاروں کی طرح ہونے کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہدایت دیں گے۔ غلط راہ کو باطل کریں گے جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ﴾ ستاروں سے وہ ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ بعض کا بعض سے قوی ہونا اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ انوار سے مراتب میں بعض صحابہ کرام کو بعض سے فوقیت حاصل ہے۔ ہر ایک کو نور حاصل ہے یعنی تمام صحابہ کرام کو بقدر استعداد نور حاصل ہے۔

☆ ان کے اختلافات کے باوجود کوئی شخص کسی صحابی کے مسلک پر چلے وہ ہدایت پر ہوگا اس سے ثابت ہوا کہ امت کا اختلاف فروع دین میں رحمت ہے اصول دین میں اختلاف گمراہی کا سبب ہے۔

☆ سب کا ہدایت پر ہونا یہ دلیل ہے کہ صحابہ کرام کا اختلاف فروع دین میں تھا اصول دین میں

نہیں تھا۔

" ان مراده ﷺ الاختلاف الذی فی الدین من غیر اختلاف للغرض الدنیوی "

نبی کریم ﷺ نے جس اختلاف کا ذکر فرمایا اس سے مراد وہ اختلاف ہے جو دین میں ازروئے تحقیق کے ہو دنیاوی غرض حائل نہ ہو۔ (مرقاۃ)

اعتراض: صحابہ کرام کا اختلاف تو خلافت وحکومت میں تھا۔ یہ اختلاف تو دنیاوی غرض کی وجہ سے تھا دینی غرض کی وجہ سے نہیں تھا اس اختلاف کو رشد وہدایت کیسے کہا جاسکتا ہے۔

جواب: "الظاهر ان اختلاف الخلافة ایضا من باب اختلاف فروع الدین الناشئی عن اجتهاد کل لاعن الغرض الدنیوی الصادر عن الحظ النفسی " (مرقاۃ)

یہ ظاہر بات ہے کہ صحابہ کرام کا اختلاف ،خلافت کے معاملہ میں بھی فروعِ دین میں ہی اختلاف تھا جو ہر ایک کے اجتہاد کی وجہ سے اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ اس میں خواہشات نفسانیہ کی وجہ سے کوئی دنیاوی غرض حائل نہیں تھی۔ دونوں حدیثوں کے مطالب سمجھنے کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ دنیا میں کفر، گمراہیاں ، بدعات ، جہالتیں اور غلط قسم کی خواہشات سمندر کی موجوں کی طرح ہیں۔ گہرے دریا کی ظلمات سے نکلنے کے لئے کشتی کی ضرورت ہے۔ بغیر کشتی کے سمندر کی موجوں کی تھپیڑوں سے نکلنا ممکن نہیں ۔وہ کشتی اہل بیت کی محبت کی کشتی ہے۔ جب تک اہل بیت کی محبت کی کشتی پر سوار نہیں ہوگا۔ سمندر کی موجوں میں پھنسا رہے گا۔ لیکن یہ بھی خیال رہے کہ کشتی کا تاریکی میں ستاروں سے راہنمائی حاصل کرنے کے بغیر کنارے پر پہنچنا ممکن نہیں ہوتا۔

اس لئے محبت اہل بیت کی کشتی پر سوار ہونے کے باوجود صحابہ کرام سے راہنمائی حاصل کرنی ضروری ہے۔ کیونکہ وہ ستاروں کی طرح ہیں سبحان اللہ نبی کریم ﷺ نے اپنے دونوں ارشادات میں کیسا خوب رابطہ قائم فرمایا کہ صحابہ کرام کو ستاروں سے تشبیہ دی اور فرمایا کہ جس نے ان کی اقتداء کی وہ ہدایت حاصل کر گیا اور اہل بیت کو نوح علیہ السلام کی کشتی سے تشبیہ دی۔ اہل سنت وجماعت کیسے خوب عقیدہ پر قائم ہیں اسی کا نام صراط مستقیم ہے۔

تشبیہ و تعطیل کے درمیان صراط مستقیم:

ایک فرقہ مشبھہ ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو مخلوق سے تشبیہ دی اس کے لئے جسم تسلیم کیا انہوں نے کہا رب تعالیٰ کھاتا ہے اور پیتا بھی ہے۔

دوسرا فرقہ تعطیلیہ ہے جنہوں نے رب تعالیٰ کو معطل مانا ہے کہ اس نے صرف عقل اول کو پیدا کیا ہے اور عقل اول نے عقل دوم کو اس طرح وہ دس عقول مانتے وہی نظام عالم چلا رہے ہیں۔ اہل سنت و جماعت کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسمیت، کھانے، پینے وغیرہ سے پاک ہے۔ اور وہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہ خود ہی نظام عالم کو چلانے والا ہے۔ **مصرف الامور وہ خود ہی ہے۔**

(نور الانوار مع قمر الاقمار)

محبت و عقل کے درمیان صراط مستقیم:

ایسا عشق محض بھی نہ ہو جو مجذوبیت تک پہنچادے۔ اور ایسا عقل محض بھی نہ ہو جو ملحد، بے دین بنا دے جس کی وجہ سے انسان صرف ظاہری اسباب کا پچاری بن جائے۔ اور اس کے ذہن سے خالق کا تصور جاتا رہے۔ اس کے درمیان راہ سلوک ہے کہ شریعت کے مطابق چلے زہد و تقوی اختیار کرے عشق محض میں مبتلاء ہو کر اپنے آپ کو مقام مجذوبیت تک نہ پہنچائے اور فلاسفہ کی طرح ہر چیز کو فقط اسباب کے تابع نہ سمجھے بلکہ یہ ایمان رکھے کہ ان تمام چیزوں کو معرض وجود میں لانے والا صرف خالق کائنات ہے بس یہی صراط مستقیم ہے۔

(نور الانوار مع قمر الاقمار)

صراط مستقیم بمعنی عفت:

ایک راہ یہ ہے کہ انسان خواہشات نفسانیہ میں واقع ہو فسق و فجور میں مبتلا ہو دوسرا راستہ یہ ہے کہ انسان پر جمود (خشکی) طاری رہے، بخیل ہو، مال کو اپنے پاس روک کر رکھے بہت ہی حاجتمند کو ضرورت کے وقت مال نہ دے یہ دونون راستے باطل ہیں۔ ان کے درمیان عفت ہے وہی صراط مستقیم خواہشات ہوں لیکن شریعت کے تابع ہوں فسق و فجور سے دور رہے نیکی و تقوی اختیار کرے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرے حاجتمندوں کی حاجات کو پورا کرے۔

صراط مستقیم بمعنی شجاعت:

ایک راہ یہ ہے کہ انسان بلا مقصد ہر وقت پیشانی پر تیوری چڑھائے رکھے اسے دیکھیں تو آدم خور نظر آئے بے مقصد بلاوجہ جلدی سے طیش میں آجائے، ظالم ہو۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ بزدل ہو، جہاد کرنے سے ڈرے، ہر کسی کا خوف اس پر طاری ہو، ہر وقت غم اور پریشانی میں مبتلا ہو، جزع وفزع کرے یعنی صبر نہ کر سکے۔ یہ دونوں راستے باطل ہیں۔

ان دونوں راستوں کے درمیان صراط مستقیم ہے وہ یہ ہے کہ انسان خوش اخلاق ہو اس کا چہرہ ہنس مکھ ہو بلاوجہ کسی پر غصہ نہ کرے عدل وانصاف کرے صرف خوف خدا دل میں ہو جب خوف خدا دل میں ہوگا، بزدلی خود بخود جاتی رہے گی جہاد کے لئے شجاعت و بہادری حاصل ہوجائے گی، اسی طرح مخلوق کا خوف وحزن زائل ہوجائے گا جزع وفزع دور ہوجائیں گے، صبر حاصل ہوگا، اسی کا نام شجاعت ہے۔

صراط مستقیم بمعنی حکمت:

انسان کی ایک راہ یہ ہے کہ اسے جہالت حاصل ہو غباوت (کند ذہنی) حاصل ہو اور بلادت (بے وقوفی) حاصل ہو۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ انسان مکروفریب سے کام لے، دھوکہ باز ہو کسی اچھے کام سے دور رہے اور برے کاموں کو حاصل کرنے میں حیلہ باز ہو اس کی ہر رائے غلط طیش دلانے والی ہو۔ اس کے درمیان صراط مستقیم ہے جسے حکمت کہا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان علم دین حاصل کرے کم از کم اختیاری غباوت اور بلادت سے دور رہے، حق گوئی سے کام لے مکروفریب نہ کرے کسی کو ظاہر وباطن ایک جیسا رکھ کر نفع پہنچانے کی کوشش کرے، دھوکہ بازی سے کام نہ لے، حیلہ بازی سے نیکی کے کاموں کو چھوڑنے اور برائیوں کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے ہر شخص کو اچھی رائے دے لوگوں کو لڑانے کی کوشش نہ کرے۔

صراط مستقیم بمعنی عدل:

عدل کا معنی ہی چونکہ برابر ہے اس کا مدمقابل لفظ ظلم ہے جس کا معنی ہے "وضع الشئی فی غیر

محلہ " کسی چیز کو اپنے محل کے غیر میں رکھنا۔ چور، ڈاکو، جواباز، ہر قسم کے لیٹرے، قتل وغارت کا بازار گرم کرنے والوں کو چھوڑ دینا ان سے پیسے لے لینا، یا ان کے حق میں سفارش قبول کر لینا، یا اپنی نوکریاں بچانے کے لئے غاصبوں، لیٹروں، قانون کی دھجیاں بکھیرنے والوں کو حقدار سمجھ لینا ظلم عظیم ہے۔

اسی طرح چوروں کو سزا نہ دینا، قرآنی سزاؤں کو یہود ونصاریٰ کو خوش کرنے کے لئے وحشیانہ سزائیں کہنا بھی ظلم عظیم ہے۔

اس کے درمیانی راستہ کو ہی عدل کہا جائے گا وہی صراط مستقیم ہے عدل کو چھوڑ دینے کی وجہ سے ہی آج ہر طرف افراتفری کا بازار گرم ہے ہر طرف تخریب کاری کے اڈے قائم ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق عقیدہ صراط مستقیم:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ایک عقیدہ یہود کا ہے۔ جنہوں نے آپ کو معاذ اللہ ولد الزنا کہا ہے آپ کی والدہ مکرمہ پر ناجائز بہتان باندھا ہے اور معاذ اللہ حضرت مریم کے ناجائز تعلقات یوسف نجار سے ثابت کئے۔ یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق تفریط سے کام لیا کہ آپ کے مرتبہ کو کم کرنے کی ناپاک کوشش کی۔

دوسرا فرقہ نصاریٰ کا ہے جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تسلیم کیا بعض نے خدا کا بیٹا آپ کو کہا بعض نے آپ کو خدا کے ساتھ تیسرا خدا کا شریک مانا۔ ان لوگوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق افراط سے کام لیا ہے یعنی حد سے تجاوز کیا۔

لیکن اہل سنت وجماعت نے آپ کے متعلق وہ عقیدہ پیش کیا ہے جو عیسیٰ علیہ السلام نے خود بچپن میں اپنی والدہ کی پاکدامنی کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا " قال انی عبد الله اتنی الکتاب وجعلنی نبیا " کہ بیشک میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب عطا کی اور مجھے نبی بنایا۔

بس یہی صراط مستقیم ہے کہ آپ کو خدا نہ مانا جائے بلکہ خدا کا بندہ مانا جائے معاذ اللہ آپ پر بہتان تراشی سے اپنا ایمان برباد نہ کیا جائے بلکہ آپ کو اللہ تعالیٰ کا سچا نبی مانا جائے۔

(از جواهر طنطاوی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق عقیدۂ صراط مستقیم :

" عن علی قال قال رسول اللہ ﷺ فیک مثل من عیسی ابغضته الیهود حتی بهتوا امه واحبته النصاری حتی انزلوه بالمنزلة التی لیست له ثم قال یهلک فی رجلان محب مفرط یقرظنی بما لیس فی ومبغض یحمله شنانی علی ان یبهتنی ..... رواه احمد " (مشکوۃ باب مناقب علی)

" حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہاری مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہے یہود نے ان سے بغض کیا یہاں تک کہ ان کی والدہ پر بہتان لگایا اور نصاری نے ان سے محبت کی یہاں تک کہ ان کو وہ مرتبہ دیا جو ان کا نہیں تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا میرے حق میں دو شخص ہلاک ہو جائیں گے ایک وہ جو میرے ساتھ بہت زیادہ محبت کریں گے اور میری مدح میں وہ چیزیں ذکر کریں گے جو مجھ میں نہیں۔ اور دوسرا وہ جو مجھ سے بغض رکھے گا جس کی وجہ سے وہ میرے ساتھ عداوت کرے گا اور مجھ پر بہتان باندھے گا "۔

وضاحت حدیث: " یهلک فی " کا معنی یہ ہے کہ میرے حق میں بھٹک جائیں گے "رجلان " سے مراد دو گروہ ایک خارجی فرقہ اور دوسرا رافضی فرقہ "محب مفرط " کا معنی یہ ہے کہ حد سے زیادہ محبت میں مبالغہ کرنے والا "یقرظنی " تقریظ سے لیا ہوا ہے جس کا معنی ہے کسی کی مدح کرنا عام طور پر کتب کے شروع میں تقریظات ہوتی ہیں ان کا بھی یہی مطلب ہوتا ہے کہ مصنف اور اس کی تصنیف شدہ کتاب کی مدح کی جاتی ہے "بما لیس فی " کا مطلب یہ ہے کہ گویا کہ مجھے تمام صحابہ پر فضیلت دے گا جس کا میں مستحق نہیں۔ بعض لوگ مجھے انبیاء کرام پر فضیلت دے کر گمراہ ہوں گے حالانکہ اس منصب کا مجھ میں تصور تک بھی نہیں کیا جا سکتا اور کچھ لوگ مجھ میں اپنی نادانی کی وجہ سے الوھیت ثابت کریں گے جس کا مجھ میں وہم وگمان کرنا بھی ممکن نہیں۔

عجیب نکتہ : محبّ کے ساتھ مفرط کی قید ہے لیکن مبغض کے ساتھ مفرط ذکر نہیں "لان البغض باصله ممنوع بخلاف اصل الحب ممدوح " اس لئے کہ بغض کرنا مطلقاً ممنوع ہے۔ لیکن محبت کرنا قابل تعریف ہے لیکن حد سے زیادہ محبت کرنا، جس کی وجہ سے اس میں وہ اوصاف

بیان کئے جائیں جو اس میں نہیں یہ منع ہے "شنانی" کا معنی "عداوتی" میرے ساتھ عداوت (دشمنی) کرے گا "علی ان یبھتنی ......ای یتکلم علی البھتان وینسب الی الزور والعصیان" یعنی مجھ پر بہتان کی کلام کرے گا اور جھوٹ اور گناہ کی طرف مجھے منسوب کرے گا۔

☆ "وعن علی قال یجنی اقوام حتی یدخلوا النار فی حبی ویبغضنی اقوام حتی یدخلوا النار فی بغضی" (مسند احمد فی المناقب)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کئی قومیں مجھ سے محبت کریں گی وہ میری محبت کی وجہ سے جھنم میں جائیں گی اور کئی قومیں مجھ سے بغض رکھیں گی وہ میرے ساتھ بغض رکھنے کی وجہ سے وہ جھنم میں جائیں گی۔

☆ "وعن السدی قال قال علی اللھم العن کل مبغض لنا وکل محب لنا غال" (مسنداحمد فی المناقب)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے اللہ ہم سے بغض رکھنے والوں پر لعنت فرما اور اے اللہ ہم سے محبت میں حد سے تجاوز کرنے والوں پر لعنت فرما۔ اہل سنت وجماعت کا عقیدہ ہی درحقیقت صراط مستقیم ہے یہ وہ عقیدہ ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا

"لایحب علیا منافق ولا یبغضہ مؤمن" (مسند احمد ،ترمذی ،مشکوۃ باب مناقب علی)

حضرت علی سے کوئی منافق محبت نہیں کرے گا اور کوئی مومن بغض نہیں رکھے گا۔

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ محبت علی ایمان ہے اور بغض علی منافقت ہے۔

"عن ام سلمۃ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من سب علیا فقد سبنی" (مسند احمد ،مشکوۃ باب مناقب علی)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنھا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے علی کو گالیاں دیں اس نے مجھے گالیاں دیں"۔ (از مرقاۃ)

واضح ہوا کہ توہین علی المرتضی درحقیقت توہین رسول خدا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گستاخی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخی ہے نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے محبوب ،برگزیدہ صحابی اور اپنے وقت میں خلیفہ برحق ہیں۔

صراط مستقیم بمعنی کتاب اللہ:

" عن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ الصراط المستقیم کتاب اللہ "

" حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صراط مستقیم سے مراد کتاب اللہ (قرآن پاک) ہے"۔

صراط مستقیم بمعنی اسلام : " وقال میمون بن مہران عن ابن عباس فی قولہ تعالیٰ ......اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ قال ذاک الاسلام"

میمون ابن مہران کہتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ کے متعلق پوچھا گیا کہ صراط مستقیم کیا ہے تو آپ نے فرمایا "وہ اسلام ہے"۔ " عن ابن مسعود عن ناس من اصحاب النبی ﷺ اھدنا الصراط المستقیم قالو ھو الاسلام" حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور دوسرے کئی صحابہ نے یہی فرمایا ہے کہ "صراط مستقیم" سے مراد اسلام ہے۔

صراط مستقیم بمعنی نبی کریم ﷺ وحضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ عنہما:

" عن عاصم الاحوال عن ابی العالیۃ اھدنا الصراط المستقیم قال ھو النبی ﷺ وصاحباہ من بعدہ قال عاصم فذکرنا ذلک للحسن فقال صدق ابو العالیۃ ونصح "

عاصم احوال کہتے ہیں ابوالعالیہ نے کہا کہ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ میں صراط مستقیم سے مراد نبی کریم ﷺ اور آپ کے بعد آنے والے آپ کے دو یار ہیں۔ یعنی نبی کریم ﷺ کی اتباع اور آپ کے بعد آپ کے دویاروں یعنی حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی اقتداء کرنے کا نام صراط مستقیم ہے۔ عاصم کہتے ہیں میں نے حضرت حسن (بصری رحمہ اللہ) سے ذکر کیا کہ ابوالعالیہ یہ کہتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ ہاں انہوں نے سچ کہا ہے اور ہم بھی اسے صحیح قرار دیتے ہیں۔

صراط مستقیم بمعنی حق : "وقال مجاھد اھدنا الصراط المستقیم قال الحق وھذا الشمل " مجاہد نے کہا کہ صراط مستقیم سے مراد "حق" ہے یعنی دعاء یہ کی جاتی ہے کہ

اے اللہ مجھے حق پر چلا۔ یہ معنی مراد لینا زیادہ مناسب ہے کیونکہ یہ تمام معانی کو شامل ہے۔

صراط مستقیم بمعنی دین خدا:

"وقال ابن الحنفية قوله تعالیٰ اهدنا الصراط المستقیم قال هو دین الله الذی لا یقبل من العباد غیره"

ابن حنفیہ فرماتے ہیں کہ صراط مستقیم سے مراد اللہ تعالیٰ کا دین ہے کیونکہ وہ اپنے بندوں سے اپنے دین کے غیر کو پسند نہیں فرماتا۔

تنبیہ: خیال رہے کہ صراط مستقیم کا معنی اسلام مراد لیا جائے یا اللہ تعالیٰ کا دین مقصد ایک ہی ہے اس لئے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامَ﴾ بیشک دین اللہ تعالیٰ کے ہاں (پسندیدہ) اسلام ہے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ جب صراط مستقیم کا معنی ''حق'' مراد لیا جائے تو یہ درمیانے راستہ کو بھی شامل ہے کیونکہ افراط وتفریط کے درمیان والا راستہ ہی حق راہ ہے۔

تمام اقوال صحیح ہیں اور یہ ایک دوسرے کو لازم ہیں:

جتنے اقوال پیش کئے گئے ہیں کہ صراط مستقیم کیا ہے؟ ان میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ تمام اقوال صحیح ہیں تمام ہی صراط مستقیم ہیں کسی ایک سے بھی روگردانی ممکن نہیں:

" فان من اتبع النبی صلی الله علیه وسلم واقتدی باللذین من بعده ابی بکر وعمر فقد اتبع الحق ومن اتبع الحق فقد اتبع الاسلام ومن اتبع الاسلام فقد اتبع القرآن وهو کتاب الله وحبله المتین وصراطه المستقیم"

''جس شخص نے نبی کریم ﷺ کی تابعداری کی اور آپ کے بعد آپ کے دو یاروں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی اقتداء کی اس نے حق کی اتباع کی اور جس نے حق کی اتباع کی اس نے اسلام کی اتباع کی اور جس نے اسلام کی اتباع کی اس نے قرآن کی اتباع کی۔ یہی اللہ کی کتاب ہے اور اس کی مضبوط رسی ہے اور یہی صراط مستقیم''۔

واضح ہوا کہ صراط مستقیم تمام چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ کسی ایک کو بھی چھوڑے گا تو صراط مستقیم سے ہٹا ہوا ہوگا نبی کریم ﷺ کے ایک ارشاد گرامی سے پتہ چلتا ہے کہ صراط مستقیم تمام چیزوں کا مجموعہ ہے۔

" عن النواس بن سمعان عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ضرب الله مثلا صراطا مستقيما وعلى جنبى الصراط سوران فيهما ابواب مفتحه وعلى الابواب ستور مرخاة وعلى باب الصراط داع يقول ياايها الناس ادخلوا الصراط جميعا ولا تعوجوا وداع يدعو من فوق الصراط فاذا اراد الانسان ان يفتح شيأ من تلك الابواب قال ويحك لا تفتحه فانك ان تفتحه تلجه فالصراط الاسلام والسوران حدود الله والابواب المفتحة محارم الله وذالك الداعى على رأس الصراط كتاب الله والداعى من فوق الصراط واعظ الله فى قلب كل مسلم "

" نواس بن سمعان روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے صراط مستقیم کی مثال بیان فرمائی ہے کہ راستہ کے دونوں طرف دو دیواریں ہوں ان میں دروازے کھلے ہوئے ہوں دروازوں پر پردے لٹکے ہوئے ہوں اور راستے کے دروازے پر ایک شخص بلانے والا ہو جو یہ کہہ رہا ہو کہ اے لوگو! سب کے سب راستے میں داخل ہو جاؤ ٹیڑھے نہ ہو (یعنی سیدھے راستہ پر چلو دائیں بائیں نہ بھٹکو) اور ایک دعوت دینے والا راستے کے ایک طرف موجود ہو۔ جب کوئی انسان ان دروازوں میں سے کوئی دروازہ کھولنے کا ارادہ کرے تو وہ داعی کہتا ہے کہ تم پر افسوس ہے بلاوجہ دروازہ کھولنے کا ارادہ نہ کرو اگر تم دروازہ کھولنا ہی چاہتے ہو تو پھر اس میں داخل بھی ہو جاؤ۔ (مثال کی وضاحت آپ نے یوں فرمائی) راستہ اسلام ہے دو دیواریں اللہ کی حدیں ہیں کھلے ہوئے دروازے اللہ تعالیٰ کے محارم ہیں۔ (یعنی جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے) راستے پر داعی اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور راستے کے سرے پر دعوت دینے والا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصیحت دینے والا (واعظ) ہر مسلمان کے دل میں پایا جاتا ہے"۔ (ماخوذ از تفسیر ابن کثیر)

ابھی تک بیان کردہ بحث سے واضح ہو گیا کہ صراط مستقیم کے متعلق بیان کردہ تمام اقوال کے

مطابق عمل کرنے کا نام ہی صراط مستقیم ہے۔

میرا استاذ عظیم ترین استاذ: رئیس المحققین، استاذ المدققین، اشرف المدرسین ابوالحسنات حضرت علامہ مولانا محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی (راقم کے استاذ مکرم) فرماتے تھے کہ جب کسی مسئلہ میں مختلف اقوال پائے جاتے ہوں ان میں تعارض نہ پایا جائے اور ان کو جمع کرنا ممکن ہو تو جمع کرلیا جائے۔ ابن کثیر کی بحث پر نظر کرنے سے میرے دل سے بے ساختہ آواز اٹھی "میرا استاذ عظیم ترین استاذ ہے"۔

انسانوں کے مدارج کے مطابق صراط مستقیم کے مدارج:

جس طرح انسانوں میں کوئی عام ہیں اور کوئی خاص اسی کے مطابق ہر ایک کے درجات علیحدہ علیحدہ ہیں تو یقیناً صراط مستقیم کے بھی اسی طرح درجات ہیں۔ عوام تو کفر، فسق، جہالت، بدعات خواہشات سے بچنے اور شریعت پر چلنے، علم حاصل ہونے، اچھے اخلاق کے حصول کی دعا کرتے ہیں یہی ان کے لئے صراط مستقیم ہے۔ جس کو یہ حال حاصل ہوجائے وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت، قبول دعا اور صراط مستقیم کے حاصل ہونے پر اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرے اگر یہ صورت نہ حاصل ہو تو اپنے آپ کو ملامت کرے۔

خواص چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی تجلیات کے مشاہدات کا حصول چاہتے ہیں چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے جلال و جمال کی نعوت کی کوئی حد نہیں انسان جتنا مقرب ہو وہ اس سے اور زیادہ ترقی چاہتا ہے۔ اس کا صراط مستقیم یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ مجھے وہ مقام حاصل ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ کی قوت میرے ہاتھ بن جائے کہ میں اس سے پکڑوں اور میرے پاؤں بن جائے کہ میں اس سے چلوں اور میری آنکھیں بن جائے کہ میں اس سے دیکھوں اور میرے کان بن جائے کہ میں اس سے سنوں۔

مقربین ہمیشہ ترقی کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں اس ترقی کی راہ میں جب رکاوٹ دیکھتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کر کے اس رکاوٹ کو دور کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ

فرماتے ہیں "انه لیغان علی قلبی فاستغفر الله فی الیوم واللیلة سبعین مرة " بیشک میرے دل پر جب غبار چھا جاتا ہے تو میں دن رات میں اللہ تعالیٰ سے ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ جب مخلوق کی طرف متوجہ ہونے، دنیاوی مشاغل، گھریلو معاملات، اللہ تعالیٰ کی طرف کامل توجہ کرنے میں حائل ہوجاتے ہیں تو میں اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کے لئے اس سے استغفار کرتا ہوں۔ مقصد واضح ہوا کہ جس طرح کسی انسان کا درجہ ہوگا اسی کے مطابق اس کا صراط مستقیم ہوگا۔ اس پر قائم رہنے کی وہ دعاء کرے گا بلکہ اس سے درجہ رفیعہ کی طرف ترقی کی دعاء کرے گا۔

مسلمان ہے نماز ادا کر رہا ہے تو پھر اس کا یہ دعاء کرنے کا کیا مطلب ہے کہ اے اللہ ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت دے اس دعاء سے تو بظاہر یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ ہدایت پر نہیں۔

پہلا جواب: " قلنا المراد طلب اثبات علیه او حصول المراتب المرتبة علیه والزیادة علی الهدی الذی اعطوه" (کمالین)

ہم کہتے ہیں کہ یہاں مراد اس ہدایت پر ثابت رہنے کی طلب ہے جو اسے پہلے ہی حاصل ہے اور جو مراتب اس ہدایت پر مرتب ہیں جو اسے پہلے ہی حاصل ہے ان مراتب کے حصول کی دعاء ہے اور جو ہدایت حاصل ہے اس سے زیادتی کے حصول کی دعاء ہے۔

واضح ہوا کہ دعاء کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ تعالیٰ جو ہدایت تو نے ہمیں دے رکھی ہے اس پر ہمیں ثابت رکھ قائم ودائم رکھ تاکہ ہمیں اس کے ذریعے خصوصی مراتب حاصل ہوں اور پہلے سے زیادہ مدارج حاصل ہوتے رہیں۔

اس جواب کے بعد اعلیٰ حضرت مولانا الشاہ احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کے ترجمہ کو دیکھیں تو باکمال ترجمہ نظر آئے گا۔ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ ہم کو سیدھا راستہ چلا۔ (مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ)۔

لیکن اس کے خلاف کچھ اور تراجم دیکھیں ان میں آپ کو وہ کمال نظر نہیں آئے گا بلکہ اعتراض مندفع نہیں ہوگا۔

'' بتلا ہم کو سیدھی راہ '' (مولنا محمود الحسن)

'' بتلایئے ہم کو رستہ سیدھا'' (مولنا اشرف علی)

''ہمیں سیدھا راستہ دکھا'' (مودودی صاحب)

''دکھا ہم کو راہ سیدھی'' (شاہ رفیع الدین)۔

بتلا اور دکھا کا یہی مطلب ہے کہ ہدایت حاصل ہونے کی درخواست کر رہا ہے۔اسی پر اعتراض ہوا لیکن جب یہ ترجمہ کیا جائے ''ہم کو سیدھا راستہ چلا'' تو اس سے واضح ہوگا کہ جو ہدایت حاصل ہے اسی پر قائم رہنے کی درخواست کی جارہی ہے۔

فائدہ : علامہ محی الدین ابن عربی (شیخ اکبر) رحمہ اللہ نے بھی معنی یہی کیا ہے " ثبتنا علی الهداية " ہمیں ہدایت پر ثابت رکھ۔تاہم آپ نے استقامت اور صراط مستقیم کی تفسیر کرتے ہوئے یہ ذکر فرمایا۔اے اللہ ہمیں جو تو نے نعمت خاصہ رحیمیہ عطا کر رکھی ہے اسی راستہ پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرما وہ نعمت خاصہ اللہ تعالیٰ کی معرفت و محبت ہی کا نام ہے۔اور ھدایت سے مراد کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت حقانیہ،ذاتیہ عطا فرمائے جو انبیاء کرام،شہداء،صدیقین اور اولیاء کرام کو حاصل ہے جس کی وجہ سے انہوں نے رب تعالیٰ کی تجلیات کا اول و آخر میں مشاہدہ کیا اور ظاہر و باطن ان کا اسی مشاہدہ میں رہا بلکہ وہ رب تعالیٰ کے انوار کی تجلیات کے مشاہدہ میں اس طرح مستغرق رہے کہ مقام فناء سے ان کو مقام بقاء حاصل ہو گیا۔یعنی وہ دنیا کی زندگی میں ہی فنا فی اللہ کے مقام سے ترقی کر کے باقی باللہ کے مقام پر پہنچ گئے۔ (ابن عربی)

دوسرا جواب :جس راستہ پر قائم رہنے کی دعاء کی جارہی ہے۔وہ پہلے انبیاء کرام کا راستہ ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضامندی کو حاصل کرنے کے لئے بہت بڑی مشقتیں برداشت کیں۔حضرت نوح علیہ السلام کو ہر دن کئی مرتبہ مارا جاتا تھا۔جس سے آپ بیہوش ہو کر گر پڑتے تھے۔لیکن آپ ہر مرتبہ یہی کہتے "اللهم اهد قومي فانهم لا يعلمون " اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے بیشک یہ نہیں جانتے۔گویا کہ جن کو یہ مرتبہ حاصل ہے وہ اس پر قائم رہنے کی دعا کرتے ہیں۔جن کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ان کی دعا کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اے اللہ تعالیٰ تو نے ہمیں ایمان کی ہدایت سے جس طرح نوازا ہے اسی طرح ہمیں اور بلند مراتب عطا فرما تاکہ ہم بھی تیری رضا کے لئے مشقتیں جھیلیں لیکن اف تک بھی نہ کریں۔

اعتراض: نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ رب کے حضور عرض کیا "اللهم اهد قومي فانهم

لا یعلمون " لیکن نوح علیہ السلام ہر روز کئی کئی مرتبہ جب یہی عرض کرتے تو بظاہر نوح علیہ السلام کا مقام بلند نظر آئے گا یہ کس طرح درست ہوسکتا ہے؟

جواب: جب ہم نے واضح کر دیا کہ جن لوگوں کو پہلے انبیاء کرام کے مراتب حاصل تھے وہ ان پر قائم رہنے کی دعا کرتے تھے نبی کریم ﷺ کو نوح علیہ السلام سے جب یہی مرتبہ بلند و بالا حاصل تھا کیونکہ وہ کون سے مصائب نہیں جو میرے حبیب پاک علیہ التحیۃ والثناء نے نہیں برداشت کئے؟ جب آپ ان مراتب پر رہنے کے لئے ہر نماز کی ہر رکعات میں "اھدنا الصراط المستقیم" پڑھتے تو گویا کہ یہ بھی خود بخود رب تعالیٰ کے حضور دعا ہوجاتی "اللھم اھد قومی فانھم لایعلمون"۔

تیسرا جواب: جب پہلے یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ "صراط مستقیم" سے مراد افراط وتفریط کے درمیان راستہ ہے۔ جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا ﴾ "ہم نے تمہیں امت وسط بنایا"

یعنی عدل اور درست راہ کا نام درمیانہ راستہ ہے وسط ہی حق ہے افراط وتفریط مذموم ہیں۔ انسان جب رب تعالیٰ کو دلائل کے ذریعے پہچان کر مومن ہوجاتا ہے تو وہ رب تعالیٰ کی ہدایت کو حاصل کر لیتا ہے۔ تو اب اس کے دعا کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اے اللہ مجھے اعمال شہوانیہ اور اعمال غضبانیہ سے بچا کر رکھنا اور مجھے درمیانے راستہ پر قائم رکھنا۔

چوتھا جواب: اللہ تعالیٰ کے وجود، قدرت، علم، رحمت اور حکمت پر ممکنات میں تمام چیزوں میں دلائل موجود ہیں انسان اللہ تعالیٰ کو بعض دلائل سے جب پہچانتا ہے تو اس کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ میں ممکنات کی تمام چیزوں میں پائے جانے والے دلائل کو پہچان سکوں اور ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی معرفت بھی اسی طرح زیادہ حاصل ہو تو وہ رب تعالیٰ کے حضور ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ عرض کرتا ہے کہ اے مولائے کائنات مجھے اپنی معرفت کے دلائل جو تو نے دے رکھے ہیں ان سے اور زیادہ عطا فرما۔

پانچواں جواب: رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾
اور بیشک تم سیدھی راہ بتاتے ہو اللہ کی راہ کہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں۔

پ ۲۵ آیت ۵۳

اور رب تعالیٰ نے فرمایا "**وان هذا صراطی مستقیما فاتبعوه**" اور یہ ہے میرا سیدھا راستہ تو اسی پر چلو۔

ان آیات میں رب تعالیٰ نے صراط مستقیم کی ہدایت دینے کا حکم نبی کریم ﷺ کو دیا اور بندوں کو صراط مستقیم پر چلنے کا حکم فرمایا۔ اور صراط مستقیم کا اعلیٰ درجہ یہ ہے "**هو ان يكون الانسان معرضا عما سوى الله مقبلا بكلية قلبه وفكره وذكره على الله**" کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سوا تمام چیزوں سے اعراض کر کے کامل طور پر اپنے دل کو اللہ تعالیٰ کے ذکر وفکر میں لگادے۔

اس سے واضح ہوا کہ مومن رب تعالیٰ کے حضور عرض کرتا ہے کہ اے رب قدوس تو نے مجھے ایمان، اعمال صالحہ کی ہدایت کی دولت سے مالا مال کر دیا لیکن میں تجھ سے یہ دعا کرتا ہوں کہ تو میرے دل کو صرف اپنی طرف لگادے دنیا کی مشاغل سے میری توجہ کو ہٹادے مجھے اس مرتبہ پر پہنچادے کہ اگر تیرا حکم بظاہر بڑا سخت بھی ہو تو میں اس کی اطاعت کر سکوں کسی قسم کی چون وچرانہ کروں۔ جیسا کہ تو نے اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے بیٹے کو میری رضاء کی خاطر ذبح کر دو تو آپ نے اس کی اطاعت کی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ ذبح ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ تو وہ اس حکم کے مطیع ہو گئے۔ حضرت یونس علیہ السلام کو دریا میں ڈالنے کے لئے دوران سفر کشتی میں بیٹھے ہوئے امتحان آ گیا تو انہوں نے اپنے آپ کو کشتی میں ڈالے جانے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔ اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ حضرت خضر علیہ السلام کی شاگردگی اختیار کر لو تو آپ بلا چون وچرا چل پڑے۔ اور جب حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت زکریا علیہ السلام کو حکم ہوا کہ تم نے اچھے کاموں کا حکم دینا ہے اور برے کاموں سے روکنا ہے ہوسکتا ہے تمہیں قتل کر دیا جائے تمہیں دو ٹکڑے کر دیا جائے۔ لیکن تم نے میرے حکم سے پیچھے نہیں ہٹنا ان دونوں باپ بیٹے جلیل القدر نبیوں نے رب کے حکم کو ماننے سے ٹال مٹول کا خیال تک نہیں کیا بلکہ رب تعالیٰ کے حکم کے سامنے سر جھکا دیا اور ان کو شہید کر دیا گیا۔

مطلب واضح ہو گیا کہ ہدایت ایمان واسلام حاصل ہونے کے باوجود انسان یہ دعا کر رہا ہے کہ اے اللہ مجھے انبیاء کرام کے نقش قدم پر چلا اور ان کی طرح مصائب وآلام برداشت کرنے

کی توفیق عطا فرما اور اپنے احکام کی بجا آوری کا عظیم مرتبہ عطا فرما تا کہ میں تیرے کسی حکم سے بھی روگردانی نہ کرسکوں۔

فائدہ : یہ بھی خیال رہے کہ رب تعالیٰ کے احکام ماننے میں جن لوگوں نے مشکلات برداشت کیں ان کو انعامات سے نوازا گیا۔مشکلات کے بعد ان کو آسانیاں عطا ہوئیں۔اسی لئے رب تعالیٰ نے انسان کو دعا کرنے کا حکم دیا۔دعا بتائی ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ لیکن اس کے بعد یہ نہیں فرمایا کہ اے انسان تو یہ کہہ "صراط الذین ضربوا و قتلوا" کہ اے اللہ مجھے ان لوگوں کی راہ پر چلا جن کو مارا گیا اور قتل کیا گیا۔بلکہ یہ کہا کہ اے انسان تو یہ کہہ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ اے اللہ مجھے ان لوگوں کی راہ پر چلا جن پر تیرا انعام ہے پتہ چلا کہ اصل مقصد انعام عطا کرنا ہے جس کے لئے امتحانات سے بھی گزارا جاتا ہے۔

چھٹا جواب : انسان رب تعالیٰ کے حضور عرض کرتا ہے کہ اے اللہ جس طرح تو نے مجھے پہلے ہی ہدایت عطا فرما رکھی ہے۔پھر بھی میں عرض کرتا ہوں کہ مجھی تائبین کا مرتبہ عطا فرما دے۔اس لئے کہ میں دیکھتا ہوں کہ کئی لوگ گناہوں میں مبتلاء ہوتے ہیں معاصی کا ارتکاب کرتے ہیں لیکن موت سے پہلے ان کو توبہ کی توفیق حاصل ہو جاتی ہے۔وہ تیرے دربار میں جھک جاتے ہیں۔تیری رحمت کو طلب کرتے ہیں تو اپنے وعدہ کے مطابق ان کی توبہ کو قبول کر کے ان کو جہنم سے نجات دے دیتا ہے اور جنت کا مستحق بنا دیتا ہے۔

میں بھی یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر مجھ سے کوئی لغزش ہو جائے تو مجھے بھی توبہ کی توفیق عطا فرمانا تا کہ میں تیرے حضور حاضر ہونے پر شرمندہ نہ ہوں۔

واضح ہوا کہ ایمان واسلام کی ہدایت کے حاصل ہونے کے بعد درجہ تائبین کے حصول کی دعا کی جارہی ہے۔

ساتواں جواب : انسان یہ کہتا ہے اے مولائے کائنات بہت سے راستے ہیں احباب مجھے اور راستہ کی طرف لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔اعداء (دشمن) اور راہ پر چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔اور شیطان اور ہی غلط باطل راہوں پر چلانے کے لئے دن رات مجھے بھٹکانے پر لگا ہوا

ہے۔سیدھی راہ پر چلنے والی رکاوٹوں میں شہوت ،غضب ،کینہ اور حسد پائے جاتے ہیں۔اسی طرح اے رب کائنات راہ راست سے بھٹکانے کے لئے باطل فرقے دن رات تقریروں اور تحریروں سے کوشش کر رہے ہیں ۔کہیں تشبیہیہ فرقہ ہے تو کہیں تعطیلیہ کہیں جبریہ فرقہ ہے تو کہیں قدریہ۔کہیں رافضیہ فرقہ ہے تو کہیں خارجیہ کہیں آزادی نسواں کے نام پر لٹیرے راہ پر بیٹھے ہیں کہیں سائنسی ترقی کی خوشخبریاں سنا سنا کر اسلام سے دور کرنے والے ہیں۔کوئی یہودیوں کے یار اسلام سے دور ہٹانے کی کوشش کر رہے ہیں اور عیسائیوں کے غمخوار دینی تعلیم کو بند کرنے یا اسے گھٹانے کی فکر میں ہیں۔کہیں قادیانی اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے اسلام کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہیں۔اس لئے رب کائنات تو جانتا ہے ”والعقل ضعیف والعمر قصير والصناعة طويلة والتجربة خطرة والقضاء عسير “ عقل کمزور ہے عمر تھوڑی ہے کام بہت ہیں تجربہ کوئی خاص حاصل نہیں فیصلہ کرنا مشکل ہے۔اے رب قدوس میں راہ راست پر تیری مہربانی کے بغیر نہیں چل سکتا۔میری طاقت تو جواب دے چکی ہے میں خود تو حیران ہوں کہ ہر راہ پر بیٹھے لٹیروں سے اپنے آپ کو بچاؤں تو کیسے بچاؤں اس لئے تیرے حضور عرض کرتا ہوں کہ تو مجھے ان راہزنوں سے بچائے رکھ مجھے راہ راست پر قائم ودائم رکھ۔

کامیابی اسی میں ہے کہ انسان یہ سمجھے کہ میری عمر زیادہ گزر گئی اور تھوڑی رہ گئی۔اسی کے متعلق حضرت ابراہیم ادھم رحمہ اللہ کے زرین اقوال کی طرف توجہ فرمائیں ۔آپ ایک مرتبہ بیت اللہ شریف کی طرف پیدل ہی چل رہے تھے آپ کو ایک دیہاتی شخص سواری پر سوار ملا اس نے آپ سے پوچھا اے بڑے میاں کہاں جا رہے ہو؟ آپ نے فرمایا بیت اللہ شریف کی طرف اس نے کہا تم پاگل تو نہیں ہو ۔سواری تمہارے پاس، میں نہیں دیکھ رہا راستے کا خرچ تمہارے پاس نہیں سفر بہت لمبا ہے۔حضرت ابراہیم ادھم رحمہ اللہ نے جواب دیا میرے پاس بڑی سواریاں ہیں جو تمہیں نظر نہیں آ رہیں اس نے بڑے تعجب سے پوچھا وہ کون سی سواریاں تمہارے پاس ہیں؟ آپ نے فرمایا:

” اذا نزلت على بلية ركبت مركب الصبر “

”جب مجھ پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو میں صبر کی سواری پر سوار ہو جاتا ہوں“۔

” واذا نزلت على نعمة ركبت مركب الشكر “

''جب مجھ پر کوئی نعمت نازل ہوتی ہے تو شکر کی سواری پر میں سوار ہو جاتا ہوں''۔

" واذا نزل بی القضاء رکبت مرکب الرضاء "

''جب کوئی تقدیر مجھ پر نازل ہوتی ہے تو میں رضاء کی سواری پر سوار ہو جاتا ہوں''۔

" واذا دعتنی النفس الی شئی علمت ان مابقی من العمر اقل مما مضی "

''اور جب مجھے نفس کسی برائی کی طرف بلائے تو میں اپنے آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ زیادہ عمر گزر گئی اور تھوڑی رہ گئی''۔

" فقال الاعرابی سر باذن اللہ فانت الراکب وانا الراجل "

''اس دیہاتی شخص نے کہا اے میرے بزرگ آپ اللہ کے حکم، اس کی اجازت، اس کی مہربانی سے چلئے یقینی بات ہے کہ آپ سوار ہیں اور میں پیدل ہوں'' (ماخوذ از تفسیر)

''اھدنا'' کہنے میں حکمت:

بعض اوقات انسان اکیلے نماز پڑھ رہا ہوتا ہے یا اکیلے ہی دعاء کر رہا ہوتا ہے۔ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کہے "اھدنی" مجھے ہدایت دے لیکن وہ پھر بھی کہتا ہے "اھدنا" ہمیں ہدایت دے اس میں چند وجہ سے حکمت پائی گئی ہے کہ جمع کا صیغہ ذکر کرنا ہی بہت مفید ہے:

(۱) " ان الدعاء کلما کان اعم کان الی الاجابۃ اقرب " بیشک دعاء جب بھی عام ہو یعنی اس میں اور لوگوں کو بھی شامل کیا جائے وہ قبولیت کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کسی عاقل متقی، عالم نے اپنے شاگردوں کو کہا کہ کسی خطبہ میں کسی خاص بزرگ کا تذکرہ کرتے ہوئے جب تم یہ پڑھو "رضی اللہ عنک وعن جماعۃ المسلمین "(اللہ تم سے راضی ہو اور مسلمان کی جماعت سے راضی ہو) تو "رضی اللہ عنک " میں میری نیت بھی کر لینا کہ اے استاذ اللہ تم سے بھی راضی ہو۔ اگر تم ان الفاظ کو پڑھتے ہوئے میری نیت کر لو گے تو بہتر ہوگا لیکن اگر تم نے ان الفاظ کو پڑھتے ہوئے میری نیت نہ کی تو کوئی حرج بھی نہیں لیکن جب تم "وعن جملۃ المسلمین " پڑھو تو مجھے بھی نہ بھلانا اس لئے کہ "رضی اللہ عنک "میں تخصیص پائی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ دعاء میرے حق میں قبول نہ ہو۔ لیکن " عن جماعۃ المسلمین " چونکہ تمام مسلمانوں کے لئے دعاء ہے جس کی

قبولیت واضح طور پر نظر آتی ہے۔اس لئے کہ تمام مسلمانوں میں کتنے ہی نیک لوگ پائے جاتے ہیں جن کے حق میں دعا کی قبولیت تقریباً درجہ یقین میں ہوتی ہے" واذا اجاب الله الدعاء فی البعض فهو اکرم من ان یرده فی الباقی "اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی شان کریمی سے یہ بعید ہے کہ وہ بعض کے حق میں دعا قبول کرے اور بعض کے حق میں رد کر دے۔

" ولهذا السبب فان السنة اذا اراد ان یذکر دعاء ان یصلی اولا علی النبی صلی الله علیه وسلم ثم یدعو ثم یختم الکلام بالصلوة علی النبی صلی الله علیه وسلم ثانیا ، لان الله تعالیٰ یجیب الداعی فی صلوته علی النبی صلی الله علیه وسلم ، ثم اذا اجیب فی طرفی دعائه امتنع ان یرد فی وسطه "

" اسی وجہ سے مسنون طریقہ یہ ہے کہ جب انسان دعاء کا ارادہ کرے تو پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھے، پھر دعاء کرے، پھر اپنی دعا کو درود شریف پر ختم کرے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کریم ﷺ پر پڑھا ہوا درود شریف قبول فرماتا ہے۔ جب دونوں طرفوں کو قبول فرمائے گا، تو اس کی شان کریمی کے لائق یہی ہوگا، کہ وہ درمیان والی دعاء کو رد نہیں فرمائے گا"۔

(۲) نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: " ادعوا الله بألسنة ما عصیتموه بها " اللہ تعالیٰ سے دعاء ان زبانوں سے کرو، جن سے تم نے اس کی نافرمانی نہیں کی۔

" قالوا یا رسول الله ومن لنا بتلک الألسنة " صحابہ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ ایسی زبانیں ہم میں کیسے حاصل ہوسکتی ہیں؟

(یعنی صحابہ کرام نے تعجب کیا کہ ہر انسان سے کوئی نہ کوئی غلطی ہوسکتی ہے کہ وہ لغو ، بیہودہ بات کبھی نہ کبھی کرسکتا ہے، یہ تو بہت مشکل ہے کہ سوائے انبیاء کرام کے اور کسی انسان کو یہ منصب حاصل ہو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے تعجب کا جواب دیا)۔

" قال یدعو بعضکم ، لبعض ، لانک ما عصیت بلسانه وهو ما عصیٰ بلسانک "

آپ نے فرمایا کہ تم میں سے بعض ،بعض کے لئے دعا کرے، کیونکہ تم نے اس کی زبان سے

کوئی نافرمانی نہیں کی اوراس نے تمہاری زبان سے کوئی نافرمانی نہیں کی ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ تم ایک دوسرے کے لئے دعا کیا کرو، اسے مقام قبولیت حاصل ہوتا ہے ۔ کیونکہ اپنے حق میں کی گئی دعاء کوممکن ہے کہ مقبولیت کا وہ مقام حاصل نہ ہو، جو دوسرے کے حق میں حاصل ہوتا ہے، اس لئے کہ اپنی زبان اپنے حق میں لغزش کا شکار ہوسکتی ہے، لیکن دوسرے کے حق میں وہی زبان معصیت سے پاک ہے۔

(۳) انسان نے جب شروع میں "الحمد للہ" کہا احمد اللہ، نہیں کہا، تو اس کا مطلب یہ تھا کہ سب تعریف کرنے والوں کی تعریفیں اللہ تعالٰی کی ذات کے ساتھ خاص ہیں ۔تو گویا کہ دعائیہ کلمات سکھاتے ہوئے بھی رب تعالٰی نے فرمایا کہ اے میرے بندے جب حمد میں تو نے اور لوگوں کی حمد کو اپنے ساتھ اس غرض سے ملایا تھا کہ دوسرے لوگوں کی حمد جب قبول ہوگی تو میری حمد بھی قبول ہوگی ۔اس نکتہ کو دعاء میں بھی نہ بھول کہ جب تو دعاء میں بھی اور لوگوں کی دعاء کو اپنی دعاء سے ملائے گا تو دوسرے نیک لوگوں کی دعاء کی برکت سے تیری دعاء کو بھی مقام مقبولیت حاصل ہوگا۔

(۴) بندہ رب تعالٰی کے حضور گویا کہ یہ عرض کر رہا ہے" اے مولائے کائنات جب تیرے رسول ﷺ نے جماعت کو رحمت قرار دیا، اور فرقت (علیحدگی) کو عذاب" تو اسی لئے میں نے جب تیری حمد بیان کی تو تمام حمد کرنے والوں کی حمد کو ساتھ ملایا، تا کہ میری حمد انبیاء کرام اور صلحاء کی حمد کے ساتھ مل کر شرف قبولیت حاصل کر لے۔اور جب میں نے عبادت کی اور عبادت کا ذکر کیا تو پھر بھی اپنی عبادت کو تیری عبادت کرنے والے تمام لوگوں کی عبادت کے ساتھ ذکر کیا، تا کہ میری عبادت انبیاء کرام اور صلحاء کی عبادت کے ساتھ مل کر مقبول ہوجائے۔اور جب میں نے استعانت کا ذکر کیا تو اپنی استعانت کو تمام کی استعانت کے ساتھ ملایا تا کہ میری استعانت انبیاء کرام اور نیک لوگوں کی استعانت کے ساتھ مل کر تیرے حضور مقام مقبولیت اختیار کرلے۔اور جب میں نے صالحین کی اقتداء طلب کی تو سب کی اقتداء طلب کرتے ہوئے کہا ﴿ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ تا کہ مجھے انبیاء کرام اور متقین کی اقتداء حاصل ہوجائے، جس کی وجہ سے میرے اعمال ترے نزدیک قبولیت کے درجہ میں پہنچ جائیں۔اور جب میں نے مردود لوگوں سے دور رہنے کا مطالبہ کیا تو تمام سے دور رہنے کا مطالبہ کیا، اس لئے کہ انبیاء کرام اور صالحین حضرات تمام مردودوں سے ہی دوری اختیار کرتے رہے، تو میں نے

چاہا کہ میرا افرار بھی انبیاء کرام اور صالحین کے فرار سے مل کر مقبولیت کے درجہ کو حاصل کر لے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے بغیر کسی استثناء کے کہا:

﴿ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ﴾

اے مولائے کائنات جب میں ہدایت طلب کر رہا ہوں، تو سب کے لئے طلب کر رہا ہوں گویا کہ اپنی ہدایت کے مطالبہ کو انبیاء کرام اور صلحاء کے مطالبہ ہدایت سے ملا کر شرف قبولیت کے امید رکھتا ہوں۔

تمام کو ہر موقع پر ساتھ ملانے کی اصل وجہ اپنی بگڑی بنانا ہے: " فلما لم افارق الانبیاء والصالحین فی الدنیا فارجو ان لا افارقهم فی القیامة " اس لئے کہ جب میں اپنی تحمید، عبادت، استعانت، طلب ہدایت، طلب اقتداء اور طلب فرار کو انبیاء کرام اور صالحین کی ان صفات سے دنیا میں اپنے آپ کو جدا نہیں کیا، تو میں امید کرتا ہوں کہ مجھے قیامت کے دن بھی ان سے مفارقت حاصل نہیں ہوگی بلکہ ان کی معیت (نزدیکی) حاصل ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ بندے کی اس امید اور اس التجاء کو قبول کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا ﴾

اور جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے تو اسے ان کا ساتھ ملے گا، جن پر اللہ نے فضل کیا یعنی انبیاء اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ، یہ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں: (از کبیر)

کاش کہ یہ نکات سمجھ آجائیں:

اجتماعی دعا کے فوائد میں جو حکمتیں اور نکات علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان فرمائے ہیں۔ اللہ کرے کہ یہ ان لوگوں کو بھی سمجھ میں آجائیں جو فرض نماز کے بعد اجتماعی دعاء کے قائل نہیں۔ تمام نماز سے فارغ ہونے پر اجتماعی دعاء کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہ ثابت نہیں۔ کبھی نماز جنازہ کے بعد دعاء کرنے پر جھگڑا، فساد برپا کرتے ہیں۔ خدا سے مانگنے پر بھی اعتراض، درحقیقت ان کی جہالت وحماقت پر واضح ثبوت ہے۔

طلب صراط مستقیم کی وجوہ:

علم ریاضی والوں کے نزدیک خط مستقیم اس خط کو کہتے ہیں جو دو نقطوں کو قریب ترین سے ملا دے۔ یہ خط بنسبت ٹیڑھے خطوط کے چھوٹا ہوتا ہے۔اس تمہید کے بعد سمجھا یہ جائے کہ بندہ رب تعالیٰ سے صراط مسقیم کا مطالبہ کرتا ہے اس کی چند وجوہ ہیں:

☆ جب یہ واضح ہوا کہ صراط مستقیم قریب ترین راہ ہے اور دوسرے راستوں کی بنسبت چھوٹا راستہ ہے، تو اسی وجہ سے بندہ رب تعالیٰ سے اسی راہ پر قائم رہنے کی درخواست کرتا ہے، گویا کہ بندہ یوں کہہ رہا ہوتا ہے " وانا عاجز فلایلیق بضعفی الا الطریق المستقیم "کہ اے اللہ میں عاجز ہوں اپنے عجز وضعف کی وجہ سے سوائے صراط مستقیم کے اور راستوں پر چلنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

☆ چونکہ صراط مستقیم ایک ہی ہوتا ہے۔لیکن ٹیڑھے راستے کئی ہوتے ہیں، اور ٹیڑھا پن میں وہ ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں، انسان کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا کہ کس راستہ پر چلوں، لیکن صراط مستقیم کسی اور راستہ کے مشابہ نہیں ہوتا، اس لئے اس پر چلنے کا فیصلہ کرنا آسان ہوتا ہے کیونکہ وہ راستہ متعین ہوتا ہے، شکوک وشبہات سے محفوظ ہوتا ہے:

" فکان ابعد عن الخوف والآفات واقرب الی الامان "

یہاں تک کہ صراط مستقیم خوف اور آفات سے محفوظ ہوتا ہے اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے آسان اور قریب ہوتا ہے۔

☆ صراط مستقیم منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے، لیکن دوسرے ٹیڑھے راستے منزل مقصود تک نہیں پہنچاتے۔

☆ یہ بھی واضح ہے کہ صراط مستقیم ایک ہی ہوتا ہے، اس میں تبدیلی نہیں ہوتی، لیکن صراط مستقیم سے ہٹ کر، دوسرے چھوٹے چھوٹے ٹیڑھے راستے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

جب منزل تک پہنچنے کی ایک ہی راہ ہو تو انسان بغیر بھٹکنے کے اور بغیر بھولنے کے منزل تک پہنچ سکے گا لیکن جب وہ راستے تبدیل ہوتے رہے تو ان راستوں پر چلنے والا کبھی دائیں اور کبھی بائیں بھٹکتا رہے گا، اس کا منزل تک پہنچنا دشوار ہو جائے گا۔ (از کبیر)

اے اللہ راقم کی بھی یہی دعاء قبول فرما "اھدنا الصراط المستقیم بحرمة النبی الرؤف الرحیم ".

﴿ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾

(۱) راستہ ان کا جن پر تو نے احسان کیا (۲) راستہ ان کا کہ انعام کیا ہے تو نے ان پر

یہاں " صراط " بدل الکل ہے، پہلے صراط سے، یا عطف بیان ہے دینی مدارس کے طلباء بدل الکل اور عطف بیان کی تعریفوں اور فرق سے بخوبی واقف ہیں ۔یہاں نحوی مسائل کی بحث مقصود نہیں۔مطلب یہ ہوا کہ "ہمیں صراط مستقیم پر قائم رکھ،صراط مستقیم ان لوگوں کی راہ ہے جن پر تیرا انعام ہے۔
(ابو سعود، روح المعانی)

اَنْعَمْتَ: " الانعام ایصال الاحسان الی الغیر من العقلاء "

انعام کا مطلب یہ ہے کہ ذوی العقول میں سے کسی دوسرے پر احسان کرنا ، ذوی العقول کی قید لگائی ،اس لئے کہ غیر ذوی العقول کے لئے انعام کے لفظ کا استعمال نہیں ہوتا۔اسی لئے یہ نہیں کہا جاتا "انعم علی فرسه " اس نے اپنے گھوڑے پر انعام کیا۔اسی طرح نعمت کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ کسی سے نفع حاصل ہو ،بغیر عوض کے ، یعنی جس چیز کا کوئی بدلہ حاصل کرلیا جائے اسے نعمت نہیں کہا جاتا۔
(روح المعانی)

" **نعمة** " جس میں نون کے نیچے کسرہ (زیر) ہے یہ مشتق ہے " **نعمة** " سے جس میں نون پر فتح (زبر) ہے ۔اس کا معنی ہے نرم ہونا ، لذت حاصل کرنا ۔نعمتوں سے بھی چونکہ لذت حاصل ہوتی ہے ۔گویا کہ نعمت کی وجہ تسمیہ (نام رکھنے کی وجہ) بھی یہی ہے ۔ از بیضاوی وحاشیۃ الشہاب)

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اگرچہ کثیر ہیں جو شمار میں نہیں آسکتیں کیونکہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ﴾ اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتیں شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کر سکتے۔

لیکن ان کی دو قسمیں بیان کی جاسکتی ہیں: (۱) دنیوی (۲) اخروی

دنیوی کی پھر دو قسمیں ہیں۔ (۱) موہبی (۲) کسبی۔

موہبی کی پھر دو قسمیں ہیں: (۱) روحانی (۲) جسمانی۔

روحانی: جن کا تعلق روح سے ہوگا جس طرح بدن میں روح پھونکنا، اور عقل کے ذریعے روشن ہونا، اس لئے کہ روح کا تعلق بدن سے ہو بھی جائے تو پھر بھی ادراک اس وقت تک حاصل نہیں ہوگا، جب تک نور عقل سے منور نہیں ہوگا۔ یعنی روح کے بدن سے تعلق کے بعد جب عقل کی نورانیت حاصل ہوگی، تو فہم حاصل ہوگا، جس سے انسان کو تصورات اور تصدیقات کا ادراک حاصل ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" ان اللہ خلق الخلق فی ظلمۃ ثم رش علیھم من نورہ فمن اصابہ ذلک النور فقد اھتدی ومن اخطأ فقد ضل "

بیشک اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو تاریکی میں پیدا کیا، پھر ان پر اپنے نور کی پھوار برسائی، جسے وہ نور پہنچ گیا، وہ ہدایت پر آ گیا، اور جسے وہ نور نہیں پہنچا وہ بھٹک گیا۔

جسمانی: موہبی کی دوسری قسم جسمانی ہے اس کی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بدن کی تخلیق کر کے، پھر اس میں مختلف قوتیں رکھ دی ہیں۔ قوۃ خادمہ، قوۃ مخدومہ متصرفہ، پھر کچھ قوتیں کسی شخص سے متعلق ہوتی ہیں۔ اور کچھ کسی نوع سے جیسی قوۃ نامیہ، قوۃ غاذیہ، قوۃ جاذبہ، قوۃ دافعہ، اسی طرح کچھ ہیئتیں عارضی ہوتی ہیں۔ جیسے صحت اور اعضاء کی سلامتی، یہ تمام چیزیں نعمت موہبی جسمانی سے متعلق ہیں۔

کسبی: دنیوی نعمتوں کی ایک قسم موہبی کی دونوں قسمیں روحانی اور جسمانی کا بیان ہو چکا ہے۔ اب دنیوی نعمتوں کی دوسری قسم کسبی کو بیان کیا جاتا ہے۔

کسبی نعمتیں وہ ہیں جن میں انسان کے کسب کو دخل ہو اگر چہ انسان کا عمل اس نعمت کے حاصل کرنے میں مستقل تو نہیں، وہ نعمت بھی رب تعالیٰ کی طرف سے ہی عطا ہوتی ہے تاہم ظاہر طور پر اس میں انسان کا عمل ذریعہ اور سبب نظر آتا ہے۔ جس طرح مریض نے کسی طبیب سے علاج کرالیا تو شفا حاصل ہوگئی، شفا تو اللہ تعالیٰ نے دی لیکن بظاہر علاج سبب نظر آتا ہے۔ اگر چہ مفسر علیہ الرحمۃ نے کسبی کی بظاہر تقسیم تو نہیں کی لیکن مثالوں سے اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ کسبی بھی عام ہے روحانی اور

جسمانی کوشامل ہے۔ کبھی روحانی نعمتیں جیسا کہ اپنے آپ کو رذیل، گھٹیا کاموں سے پاک رکھنا، اچھے اخلاق سے مزین کرنا، ہرقسم کے ایسے کام کرنا جواللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہوں۔

کبھی جسمانی جیسا کہ بدن کو مزین کرنا کہ لوگ اسے اچھا سمجھیں، میل کچیل کو دور کرنا، صاف ستھرا ہونا، مونچھیں کاٹنا، ناخن کاٹنا وغیرہ، اسی طرح اچھے لباس وغیرہ کے ذریعے اپنے آپ کو مزین کرنا ،لوگوں میں اچھا مرتبہ حاصل کرنا، اور حلال طریقہ سے مال ودولت حاصل کر کے لوگوں میں ایک مقام پیدا کرنا۔

نعمت اخروی : ابھی تک نعمت دنیوی کی تمام قسموں کا ذکر ہوا نعمت اخروی کا ذکر اب کیا جارہا ہے۔اخروی نعمتیں، جس طرح کہ ایسی چیزوں کا علم حاصل ہو، جن سے اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل ہو۔اور اسکی کوتاہیوں کو اللہ تعالیٰ کا معاف کرنا، اور اس کی روح کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا کرنا ،تاکہ یہ مقرب فرشتوں کے ساتھ ہمیشہ کے لئے رہے اور جنت میں مقام عطاء کرنا، اس طرح کی تمام نعتیں اخروی ہیں۔ان تمام نعمتوں سے اعلیٰ نعمت ایمان ہے جس پر باقی تمام نعمتوں کے حاصل ہونے کا دارومدار ہے۔

کون سی نعمت مراد ہے؟ تمام نعمتیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ان میں سے **انعمت علیهم** میں نعمت اخروی مراد ہے۔یانعمت اخروی تک پہنچانے کے ذرائع ہیں۔جیسا کہ تزکیہ نفس وغیرہ۔

(از بیضاوی ، شیخ زاده ، حاشية الشهاب)

وہ کون لوگ ہیں جن پر انعام ہے؟

اس میں مختلف قول ہیں کہ وہ کون سے حضرات ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے:

1)...... بعض حضرات نے کہا کہ اس سے مراد مطلقاً مومن لوگ ہیں۔

۲)...... بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس سے مراد انبیاء کرام ہیں۔

۳)...... بعض حضرات نے کہا کہ تحریف اور نسخ سے پہلے جو موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب تھے وہ مراد ہیں۔

۴)...... بعض حضرات نے کہا کہ اس سے مراد نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام ہیں۔

۵)...... بعض حضرات نے کہا کہ اس سے مراد نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔

۶)...... بعض نے کہا کہ اس سے مراد نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام اور آپ کے اہل بیت ہیں۔

(روح المعانی ،خازن)

تمام اقوال کا جامع قول:

جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے ان کا ذکر قرآن پاک میں دوسرے مقام پر موجود ہے لھذا وہی لوگ مراد ہیں۔ تمام اقوال اسی میں سمٹ کر آجائیں گے۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ وَمَنْ يُطِعِ اللهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُوْلٰئِکَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّنَ وَالصِّدِيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ وَحَسُنَ اُوْلٰئِکَ رَفِيْقًا ﴾

اور جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے تو اسے ان کا ساتھ ملے گا جن پر اللہ نے فضل کیا یعنی انبیاء اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ ، یہ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول بھی اسی کی تائید کرتا ہے:

" وقال الضحاک عن ابن عباس صراط الذين انعمت عليهم بطاعتک وعبادتک من ملائکتک وانبيائک والصديقين والشهداء والصالحين "

ضحاک نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ " صراط الذين انعمت عليهم " کا مطلب یہ ہے کہ (ہمیں صراط مستقیم پر چلا) وہ راستہ ہے ان لوگوں کا جن پر تیرا انعام ہے بوجہ اس کے کہ وہ تیری طاعت اور عبادت کرتے ہیں وہ کون لوگ ہیں؟ وہ ملائکہ، انبیاء کرام ،صدیقین ،شہداء اور صالحین ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

فائدہ جلیلہ: رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی (اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ،صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ) يدل على امامة ابی بکر رضی اللہ عنہ" حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر دلالت کر رہا ہے ،اس لئے کہ جب یہ واضح کیا جاچکا ہے کہ جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے وہ انبیاء کرام

صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں تو اسی سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ:

" ولاشک ان رأس الصديقين ورئيسهم ابوبكر الصديق رضي الله عنه ، فكان معنى الآية ان الله امرنا ان نطلب الهداية التي كان عليها ابوبكر الصديق وسائر الصديقين ،ولو كان ابوبكر ظالما لما جائز الاقتداء به فثبت بما ذكرناه دلالة هذه الآية على امامة ابي بكر رضي الله عنه " (تفسیر کبیر)

'' اس میں کوئی شک نہیں کہ صدیقین کے سردار اور رئیس ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ آیت کا معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اس راہ کی ہدایت طلب کریں، جس پر ابوبکر صدیق اور دوسرے تمام صدیقین ہیں۔ اگر (معاذ اللہ) ابوبکر ظالم ہوتے تو ان کی اقتداء جائز نہ ہوتی''۔

اسی بحث سے یہ واضح ہو گیا جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت وخلافت پر دلالت کر رہی ہے۔

تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہیں:

ہر وہ چیز جو مخلوق کو نفع کے لئے عطا ہو اور ضرر کو دور کرے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور وہی نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وما بكم من نعمة فمن الله" جو نعمت بھی تمہیں حاصل ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے نعمت کی تین قسمیں ہیں سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ ان میں ایک قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ایجاد میں منفرد (اکیلا) ہے۔ جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور رزق دیا۔ ان میں سے دوسری قسم یہ ہے کہ وہ نعمت بظاہر اللہ تعالیٰ کے غیر سے حاصل ہوتی ہے، لیکن حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اس نعمت کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے اور بظاہر جو نعمت دینے والا ہے اس کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے، اور اس کے دل میں انعام عطاء کرنے کی محبت ڈالنے والا بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ لیکن بظاہر وہ نعمت اللہ تعالیٰ بندے سے دلاتا ہے اس لئے بندے کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اگرچہ حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ کا ہی شکریہ ادا کرنا چاہیے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اَنِ اشْکُرْلِیْ وَلِوَالِدَیْکَ ﴾ میرا شکریہ ادا کرو اور اپنے والدین کا (بھی شکریہ ادا کرو) رب تعالیٰ اپنا ذکر پہلے کر کے واضح کر دیا کہ کوئی انعام بھی اللہ تعالیٰ کی مہربانی کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ان نعمتوں میں تیسری قسم یہ ہے کہ جو ہماری طاعت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے۔وہ نعمت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی حاصل ہوتی ہے،اس لئے کہ طاعت کی توفیق اس نے عطاء کی اس کی امداد سے ہم طاعت کر سکتے ہیں۔طاعت کی ہدایت وہی دیتا ہے۔ہم سے عذر وہی زائل کرتا ہے۔

اس بحث سے یہ مسئلہ کھل کر واضح ہوگیا کہ تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ سے ہی حاصل ہیں کوئی بالواسطہ ،اور کوئی بلاواسطہ۔ (از کبیر)

انسان کے لئے سب سے پہلی نعمت:

اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب سے پہلی نعمت اپنے بندوں پر یہ ہے کہ ان کو زندگی عطاء کی ،عقل کا بھی یہی تقاضا ہے کہ نعمت اس وقت تک اپنے کمال کو نہیں پہنچتی جب تک اس سے نفع حاصل کرنا ممکن نہ ہو اور نفع انسان اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا جب تک اسے زندگی حاصل نہ ہو،اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر وہ چیز جس میں حیات ہی نہیں وہ نفع حاصل نہیں کر سکتی جس طرح پتھر ،غیرہ۔اس سے ثابت ہوا کہ تمام نعمتوں کی اصل حیات ہے۔نقلی دلیل بھی اس پر موجود ہے،رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿ کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَکُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ ﴾ تم اللہ تعالیٰ سے کیسے کفر کرتے ہو حالانکہ تم کچھ نہیں تھے اس نے تمہیں زندگی عطاء کی۔اس کے بعد فرمایا:

﴿ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ﴾

''وہ ذات جس نے تمہارے نفع کے لئے زمین میں تمام چیزوں کو پیدا کیا''

جب رب تعالیٰ نے پہلے حیات کے عطاء کرنے کا ذکر کیا پھر تمام چیزوں کا نفع مند ہونا ذکر فرمایا ،یہ انداز بیان ہی اس پر دلالت کر رہا ہے کہ تمام نعمتوں کی اصل اور پہلی نعمت انسان کو جو عطا ہوئی وہ حیات ہے:

فائدہ: جب یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بے شمار ہیں ﴿ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ ﴾ میں جو نعمت مراد ہے وہ اخروی نعمتیں ہیں۔ خصوصاً ایمان کا حاصل ہونا جس پر تمام نیکیوں اور مدارج کا دارومدار ہے۔ اور آیۃ کریمہ سے جب یہ بھی واضح ہے کہ یہ نعمت عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے تو اسی سے معتزلہ کا قول بھی باطل ہو گیا کہ ان کے نزدیک بندہ خود خالق افعال ہے۔ اگر ان کے قول کو صحیح مانا جائے تو لازم آئے گا کہ سب نعمتوں سے عظیم نعمت عطاء کرنے والا بندہ ہے، اس طرح بندے کے انعام کا مقام اللہ تعالیٰ کے انعام سے بلند ہوگا، حالانکہ یہ ممکن نہیں تو پتہ چلا کہ ایمان جیسی عظیم نعمت کا خالق اور معطی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

اثر عظیم: جب ہر مومن صراط مستقیم کی ہدایت طلب کرتا ہے، اور صراط مستقیم ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے تو گویا کہ ہر مومن کی دعاء کو شرف قبولیت عطا فرماتے ہوئے رب تعالیٰ انعام سے نوازتا ہے۔ اور رب تعالیٰ کا انعام معمولی انعام نہیں بلکہ عظیم انعام ہے اور انعام اس وقت تک عظیم انعام نہیں بن سکتا جب تک عذاب مندفع نہ ہو، تو اس سے یہ مسئلہ سمجھ آ گیا کہ کوئی مؤمن ہمیشہ آگ میں نہیں رہے گا۔

رب تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں:

اسی آیۃ کریمہ سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہو گیا کہ رب تعالیٰ پر یہ لازم اور واجب نہیں کہ وہ بندوں کی بہتری اور بھلائی کے مطابق انہیں کوئی چیز عطاء کرے البتہ وہ مہربان ہے رحیم و کریم ہے اپنی تمام مخلوق پر نوازشیں کرتا رہتا ہے۔ اور مؤمنین کو خصوصی انعامات سے نوازتا ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے مؤمنین پر انعامات ہیں تو یہ خود بخود واضح ہو گیا کہ رب تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں کیونکہ واجب کی ادائیگی انعام نہیں۔

مؤمنین پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی انعام:

اللہ تعالیٰ کی بعض مہربانیاں عام ہیں جن سے مؤمن اور کافر سب ہی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جیسا

کہ انسان کوکام کرنے کی قدرت عطا کرنا ،اس کی راہنمائی کرنا ،اس سے عذر اور تکالیف کو دور کرنا وغیرہ، اسی قسم کی مہربانیاں عام ہیں جو مؤمنین کے ساتھ خاص نہیں ۔لیکن یہاں جن مہربانیوں اور انعامات کا ذکر ہے وہ ان چیزوں سے بڑھ کر اخروی نعمتیں اور ایمان جیسی عظیم نعمت سے سرفراز کرنا ہے یہ صرف ایمان والوں کو ہی نصیب ہیں۔

تنبیہ : قرآن پاک میں کوئی تعارض نہیں ۔لیکن بعض اوقات اپنی کم علمی کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے کہ قرآن پاک میں تعارض ہے وہ اپنی جہالت کا تو علاج نہیں کرتا البتہ قرآن پاک پر اعتراض کرتا رہتا ہے۔ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ رحمن ہے اس کی رحمت عامہ مؤمنین اور کفار سب کو شامل ہے۔اسی طرح رب تعالیٰ کا رب العلمین ہونا بھی واضح کر رہا ہے کہ اس کی ربوبیت سے فائدہ حاصل کرنے والے جس طرح مؤمنین ہیں اسی طرح کفار بھی ہیں ۔رب تعالیٰ نے انسانوں کو جو سب سے پہلی نعمت عطا کی یعنی حیات وہ بھی سب کو حاصل ہے ۔اس میں بھی مؤمنین کی کوئی تخصیص نہیں بلکہ یہ کفار کو بھی حاصل ہے۔

اسی طرح کام کرنے کی طاقت عطا کرنا ، عذر کو دور کرنا وغیرہ ایسی نعمتیں بھی مؤمنین اور کفار کو حاصل ہیں ۔لیکن رب تعالیٰ کا یہ ارشاد ......

﴿ ولا یحسبنّ الّذین کفرُوْا انّما نُملی لھُمْ خیرٌ لانفُسھمْ انّما نُملی لھُمْ لیزْدادُوْا اثْمًا ﴾

کفار یہ گمان نہ کریں کہ ہم ان کو مہلت ان کے نفع کے لئے دیتے ہیں ہم تو ان کو مہلت دیتے ہیں کہ وہ اور ہی زیادہ گناہ کرلیں۔

...... اس پر دلالت کر رہا ہے کہ کافروں کو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں حاصل نہیں ۔بظاہر تعارض نظر آرہا ہے لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ دنیا کی زندگی آخرت کی زندگی کے مقابل قلیل ہے اور دنیا کی نعمتیں آخرت کی نعمتوں کے مقابل قلیل ہیں۔ (اسی لئے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ قُلْ متاعُ الدُّنیا قلیْلٌ ﴾ اے محبوب فرما دو دنیا کا سامان قلیل ہے) تو واضح ہوجاتا ہے کہ کفار پر دنیا میں اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں،نعمتیں ہیں لیکن آخرت میں نہیں ہوں گی لہذا ان پر نعمتیں ہونے کے باوجود نہ ہونے کے برابر ہیں۔

﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلاَ الضَّالِّيْنَ﴾

(۱) ''نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ بھکے ہوؤں کا''

(۲) ''نہ ان کا (راستہ) جن پر غضب کیا گیا اور نہ گمراہوں کا''

مطلب یہ ہوا کہ اے اللہ تعالیٰ ہمیں ان لوگوں کی راہ پر نہ چلانا جن پر تیرا غضب ہے اور ان لوگوں کی راہ پر بھی نہ چلانا جو گمراہ اور بھٹکے ہوئے ہیں۔اسی سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ جن پر غضب ہے اور جو گمراہ ہیں ان کی راہ صراط مستقیم نہیں، بلکہ ان کی راہ ٹیڑھی راہ ہے۔اور یہ بھی واضح ہوگیا کہ جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے وہ رب تعالیٰ کے غضب اور گمراہی سے محفوظ ہیں۔

غضب: لغت میں غضب کا معنیٰ ہے ''شدت'' کہا جاتا ہے "رجل غضوب" شدید خلق والامرد (یعنی بد اخلاق انسان) اور خبیث سانپ کو بھی الغضوب کہا جاتا ہے کہ اس میں شدت پائی جاتی ہے۔اونٹ کے چمڑے کے ٹکڑے کو جس کے بعض حصے کو بعض سے لپیٹا جائے، شدت کی وجہ سے کہا جاتا ہے "الغضبة" اسی طرح پہاڑ میں مرکب سخت پتھر کو بھی "الغضبة" کہا جاتا ہے۔غضب کی تفسیر بیان کی گئی ہے " هو ثوران دم القلب لارادة الانتقام " دل کے خون کا جوش مارنا اور انتقام لینے کے ارادہ سے دل کی آگ کا بھڑکنا۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

'' اتقوا الغضب فانه جمرة تتوقد فی قلب ابن آدم الم تروا الی انتفاخ اوداجه وحمرة عينيه ''

غضب سے بچو، بیشک یہ ایک آگ کی چنگاری ہے جو انسان کے دل میں بھڑک اٹھتی ہے کیا تم دیکھتے نہیں کہ اس انسان کی گردن کی رگیں پھول جاتی ہیں اور آنکھیں سرخ ہوجاتی ہیں۔اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔" ان الصدقة لتطفی غضب الرب " بیشک صدقہ رب تعالیٰ کے غضب (کی آگ) کو بجھا دیتا ہے۔ (ماخوذ از قرطبی، روح المعانی، خازن)

اعتراض: اللہ تعالیٰ کی طرف غضب کی نسبت کس طرح درست ہوسکتی ہے جب وہ ''انتقام کی غرض سے خون کے جوش مارنے'' سے پاک ہے؟

جواب: ایک قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ تمام اعراض نفسانیہ جیسے رحمۃ، فرح، سرور، غضب، حیاء،

غیرۃ، مکر، خداع، تکبر، استہزاء ان کی ابتدائی حالت بھی ہے اور انتہائی حالت بھی۔ رب تعالیٰ کی طرف ان کی ابتدائی حالت منسوب نہیں ہوسکتی لیکن ان کی انتہائی حالت کا رب تعالیٰ کی طرف منسوب ہونا جائز ہے۔ غضب کی ابتدائی حالت ''دل کے خون کا جوش مارنا'' اور اس کی انتہاء اور مقصد یہ ہے کہ جس پر غضب کیا جائے اسے ضرر (نقصان) پہنچایا جائے اس معنی کے لحاظ سے ہی کہا جاتا ہے ''فلاں پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے''۔

اسی طرح مثال کے طور پر حیاء کی ابتدائی حالت ''نفس میں انکسار حاصل ہونا'' اور اس کا مقصد اور انتہائی حالت ''کام کو چھوڑ دینا'' حیاء کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لئے ''کام کو چھوڑ دینے'' کے معنی میں ہوتا ہے۔ لیکن نفس کو انکسار حاصل ہونا، یعنی طبیعت کا سکڑ جانا، اس معنی میں حیاء کو رب تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ (از کبیر)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" هو صفة لائقة لله تعالىٰ بجلال ذاته لا اعلم حقيقتها ولا كيف هي والعجز عن درک الادراک ادراک " (روح المعانی)

سلف صالحین نے یہی کہا کہ غضب اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جس طرح اس کی شان کے لائق ہے اس کی حقیقت اور کیفیت کا علم نہیں یہ پتہ چل جانا کہ میں اسے نہیں سمجھ سکتا یہ بھی ایک علم ہے۔ یہ قاعدہ یاد رکھا جائے اور دیکھا جائے کہ قرآن پاک کا ترجمہ کرنے والے حضرات کہاں کہاں بھٹکے ہیں جب بعض مترجمین کئی مقامات پر صحیح ترجمہ نہیں کر سکے تو ان متراجم کو دیکھ کر یہ دعوی کرنے والے قرآن ہمیں بھی سمجھ میں آتا ہے کیسے ان کو عالم مان لیا جائے، اور کیسے یہ کہا جائے کہ ان کی سمجھ درست ہے۔

ضَلَال: ضالین چونکہ ضلال سے ماخوذ ہے۔ ضلال کے مختلف معانی ہیں۔ درمیانے طریقہ سے ہٹ جانا اور حق راہ سے ہٹ جانا اور کبھی اس کا معنی ہوتا ہے گم ہونا کہا جاتا ہے ''ناقة ضالة'' گم شدہ اونٹنی۔ اور کہا جاتا ہے ''ضل اللبن فی الماء ای غاب'' دودھ پانی میں گم ہوگیا۔ یہی معنی مراد ہے ''ء اذا ضللنا فی الارض'' کیا ہم موت کی وجہ سے غائب ہو جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کہا:

الم تسال فتخبرک الدیار ، عن الحی المضلل این ساروا

کیا تم نے نہیں پوچھا؟ تمہیں شہر خبر دیتے، گم شدہ قبیلہ کی کہ وہ کہاں گئے ہیں۔

کن پر غضب اور کون گمراہ؟

• " عن عدی بن حاتم قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان المغضوب علیھم الیھود و ان الضالین النصاری "

(مسند احمد، صحیح ابن حبان، والترمزی، وقال الترمذی ھذا حسن، مظھری)

ابن مردویہ نے ابو ذر رضی اللہ عنہ سے اسی قسم کی روایت ذکر کی ابن جریر اور ابن حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر یہی بیان کی۔ کہ جن لوگوں پر غضب ہے وہ یہود ہیں۔ اور گمراہ ہونے والے نصاری (عیسائی) ہیں۔ (مظہری)

" واخرج ابن مردویہ من طریق عبد اللہ بن شقیق عن ابی ذر قال سألت رسول اللہ ﷺ عن المغضوب علیھم قال الیھود ولا الضالین النصاری " (در منثور)

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا "المغضوب علیھم" کون لوگ ہیں؟ تو آپ نے فرمایا وہ یہود ہیں۔ اور ضالین سے مراد نصاری ہیں۔

" واخرج سفیان بن عینیہ فی تفسیرہ وسعید بن منصور عن اسمعیل بن ابی خالد ان النبی ﷺ قال المغضوب علیھم الیھود و الضالون ھم النصاری "

سفیان ابن عینیہ نے اپنی تفسیر میں اور سعید ابن منصور نے اسمعیل ابن ابی خالد سے روایت بیان کی بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جن پر غضب ہے وہ یہود ہیں اور جو گمراہ ہیں وہ نصاری ہیں۔ (درمنثور)

یہ مسئلہ اتفاقی ہے: "قال ابن ابی حاتم لا اعلم فی ذلک خلافا بین المفسرین "

(در منثور ۔ مظھری)

ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ مجھے کوئی معلوم نہیں کہ اس میں مفسرین کے درمیان کوئی اختلاف ہو یعنی تمام مفسرین کرام کا اتفاق ہے کہ غضب جن پر ہے وہ یہود ہیں اور جو ضالین ہیں وہ نصاری ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ میں جب واضح طور پر موجود ہے تو کسی کو اختلاف کی کیسے مجال ہے؟

اختلاف ہے، تو دلائل میں :

جن پر غضب ہے وہ یہود ہیں اس سے مراد یہود کیوں ہیں؟ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہود پر "غضب" کا ذکر دوسری آیت میں بھی کیا ہے ﴿ مَنْ لَعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ ﴾ یہاں یہود پر غضب کا ذکر ہے۔ اسی طرح نصاریٰ پر ضلالت کا ذکر اس آیت میں پایا گیا ہے ﴿ وَقَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴾ ان دلائل کا بعض مفسرین نے ضعف بیان کیا ہے کہ رب تعالیٰ نے تو قاتل کے لئے بھی غضب کا ذکر کیا ہے۔ کفار کے لئے بھی اور اسی طرح ضلال کا استعمال فساق اور کفار کے لئے بھی ہوا۔ ان مفسرین کا مطلب تقریباً یہ ہے کہ دلیل صرف احادیث مبارکہ کو بنانا کافی ہے۔ قرآن پاک میں دوسرے مقام پر یہود کے لئے غضب کا ذکر ہے اور نصاریٰ کے لئے ضلال کا، یہ دلیل نامکمل ہے۔ ہاں اگر کسی کا اصل مسئلہ میں اختلاف ہو تو وہ درست نہیں کیونکہ اس میں احادیث کی مخالفت لازم آئے گی، راقم کی اس بحث سے روح المعانی کے جلالیہ انداز سے لوگ جلال میں نہیں آئیں گے۔

اعتراض : تقریباً تمام مفسرین اسے بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہاں کفار، یہود، نصاریٰ، فساق لوگوں کی راہ پر نہ چلانے کی دعا ہے جب یہ عام ہے تو احادیث مبارکہ میں یہود اور نصاریٰ کی تخصیص کیسے؟ بلکہ یوں کہا جائے کہ جب احادیث مبارکہ میں یہود و نصاریٰ کی تخصیص تو مفسرین نے اس میں عموم ثابت کر کے کیا احادیث کی مخالفت نہیں کی۔

جواب: "واللفظ عام یعم الکفار والعصاۃ والمبتدعۃ" (مظہری)

لفظ عام ہیں اس لئے یہ اپنے عموم معنی کے لحاظ سے کافروں، نافرمانوں، بدعتیوں کو شامل ہیں۔ اب معنی مقصودی اس طرح ہو جائے گا کہ اے اللہ تعالیٰ ہمیں یہود و نصاریٰ کے راستہ پر نہ چلانا، اور اسی طرح ہمیں کافروں، نافرمانوں، بدعتیوں کے راستہ پر نہ چلانا۔ یہی ضابطہ قرآن پاک میں جا بجا استعمال ہوتا ہے کہ آیت کریمہ شان نزول کے لحاظ پر خاص ہوتی ہے لیکن عموم الفاظ اور عموم معانی کے لحاظ پر عام ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ احکام تا قیامت جاری و ساری ہیں۔

عجیب نکتہ:

" ان الیهود علموا الحق فترکوه وحادوا عنه علی علم ، فاستحقوا غضب الله ، والنصاری حادوا عن الحق جهلا فکانوا علی ضلال مبین فی شان عیسی علیه السلام " (زبدة التفسیر من فتح القدیر)

یہودیوں نے حق کو جانتے ہوئے چھوڑا اور علم کے باوجود حق کو ماننے سے دور رہے، اور اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہوئے اور نصاریٰ نے حق سے روگردانی جہالت کی وجہ سے کی اور عیسیٰ علیہ السلام کی جاہلانہ انداز پر شان بیان کر کے کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔

واضح ہوا کہ انسان عالم ہو یا جاہل ہو راہ راست سے بھٹک سکتا ہے۔اس لئے رب تعالیٰ سے دعاء کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے راہ راست پر قائم رکھ مجھے خود کوئی طاقت حاصل نہیں کہ میں ہمیشہ راہ راست پر قائم رہ سکوں۔

مودودی صاحب کا غلط ترجمہ:

ابھی تک یہ واضح کیا جاچکا ہے کہ ﴿ اَلْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ﴾ سے مراد اصل میں یہود ہیں۔ البتہ عموم لفظ کے لحاظ سے کفار اور فساق بھی مراد ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ ہمیں اس راہ پر نہ چلا جو راستہ ان لوگوں کا ہے جن پر غضب کیا گیا یعنی یہود، کفار اور فساق ہیں لیکن مودودی صاحب ﴿ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ﴾ کا ترجمہ لکھتے ہیں ''جو معتوب نہیں ہوئے''۔یہ ترجمہ اس لئے غلط ہے کہ عتاب تو دوستوں کو پیار سے جھڑکنے کو بھی کہا جاتا ہے۔یعنی انبیاء کرام کو بھی عتاب ہوا جب انبیاء کرام بھی معتوب ہوئے تو مودودی صاحب کے ترجمہ سے یہ پتہ چلا کہ مومن دعا یہ کرتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں انبیاء کے راستہ پر نہ چلا کیونکہ وہ تو معتوب ہیں ہم تو ان کی راہ پر چلنا چاہتے ہیں جو معتوب نہیں ہوئے۔(معاذ اللہ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عاتبنی فیه ربی " (خازن، بغوی ج ۷ ص ۱۷۴) میرے رب نے مجھے اس میں عتاب کیا۔" فعتب الله علیه موسی علیه السلام " (بخاری ج اول ص ۶۳)

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر عتاب فرمایا۔ "فعتب الله علیه" (مسلم ج ۲ ص ۲۷۷) موسیٰ علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے عتاب فرمایا۔

ضالین ،مومنین نہیں ہوسکتے:

" لما حکم الله علیهم بکونهم ضالین امتنع کونهم مؤمنین والالزم انقلاب خبر الله الصدق کذبا " (کبیر)

جن لوگوں کو رب تعالیٰ نے ضالین (گمراہ) کہہ دیا ہے وہ مومنین نہیں ہوسکتے ۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کی سچی خبر کا (معاذ اللہ) جھوٹا ہونا لازم آئے گا یہ محال ہے اور یہ بھی قانون ہے جو چیز محال تک پہنچائے وہ بھی محال ہوتی ہے۔

اس آیۃ کریمہ سے انبیاء کرام اور ملائکہ کا معصوم ہونا ثابت ہے﴿ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّالِّیْنَ ﴾ سے پتہ چل رہا ہے کہ انبیاء کرام اور فرشتوں کا کوئی عمل اور کوئی عقیدہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے انعام کے مستحق نہ رہیں اگر معاذ اللہ ان کا عقیدہ یا عمل اس قسم کا ہو جس کی وجہ سے وہ انعام کے مستحق نہ رہیں تو یہ ضلال ہے۔ ضالین کی اقتداء جائز نہیں ان سے ہدایت حاصل کرنا ممکن ہی نہیں ۔ اور ضالین اللہ تعالیٰ کے انعام سے دور ہیں ۔ لہذا یہ ممکن نہیں کہ انبیاء کرام اور ملائکہ میں یہ وصف باطل پایا جائے لہذا ان کا معصوم ہونا بھی ثابت ہوگیا۔

" ولما کان ذلک باطلا علمنا بهذه الآیة عصمة الانبیاء والملائکة علیهم السلام " (از کبیر)

فائدہ: سورۃ کے اول میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور مدح کا ذکر کیا ، اور آخر میں ان لوگوں کی مذمت بیان کی جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے سے اعراض کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طاعت کا اقرار نہیں کرتے۔

اس سے یہ واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیرات کا حصول اور سعادات کا حاصل ہونا اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے سے ہے اور آفات اور خوف وعذاب کا مسلط ہونا اللہ تعالیٰ سے اعراض اور اس کی طاعت سے دوری اور اس کی خدمت سے اجتناب کی وجہ سے ہے۔

آیۃ کریمہ سے تین فرقوں کا ثبوت:

جس طرح پہلے ثابت کیا جاچکا ہے کہ عموم الفاظ سے یہود، نصاریٰ، کفار اور فساق سب سمجھ آرہے ہیں۔اسی کو ذہن میں رکھتے ہوئے توجہ کی ضرورت ہے کہ آیۃ کریمہ میں مکلفین کے تین فرقوں کا ذکر ہے۔ایک اہل طاعت ہیں۔ان کا ذکر ﴿اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ میں ہے۔اور دوسرے اہل معصیت ہیں ان کا پتہ ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ سے چلا۔اور تیسرا فرقہ اہل جہالت کا یعنی جو اللہ تعالیٰ کے دین سے جاہل ہیں اور کافر ہیں اس کا اشارہ ﴿وَلَا الضَّالِّيْنَ﴾ سے ملتا ہے۔
(از کبیر)

حکمت: تین فرقے جن کا ذکر کیا گیا ان میں اہل طاعت کا ایک فرقہ ہے۔اور اہل معصیت کے دو فرقے ہیں اس میں عجیب حکمت یہ ہے کہ جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان والے ہیں اور ان کے اعمال بھی نیک ہیں۔تو گویا کہ اہل طاعت وہ ہیں جن میں ایمان اور اعمال صالحہ مجموعی طور پر پائے جاتے ہوں۔لیکن اہل معصیت کے دو فرقے اس لئے ہیں کہ ایک فرقہ وہ ہے جو ایمان تو رکھتے ہیں لیکن ان کے اعمال برے ہیں ان کو فساق کہا جاتا ہے اور دوسرا فرقہ وہ ہے جو ایمان ہی نہیں رکھتا وہ کفار ہیں۔ (از کبیر)

"آمین" قرآن پاک کا حصہ نہیں:

"ولیست من القرآن وفاقا ولکن یسن ختم سورۃ الکریمۃ بھا" (ابو سعود)

اس پر تمام کا اتفاق ہے کہ آمین قرآن پاک کا حصہ نہیں۔البتہ مسنون طریقہ یہی ہے کہ سورۃ کے آخر میں آمین پڑھی جائے۔اس پر دلیل نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "علمنی جبرآئیل آمین عند فراغی من قراءۃ الفاتحۃ" جب میں فاتحہ (کے پڑھنے) سے فارغ ہوا تو جبرائیل نے مجھے آمین سکھائی (یعنی مجھے آمین پڑھنے کے متعلق کہا) اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے "الٓہ کالختم علی الکتاب" جس طرح خط پر مہر ہوتی ہے اسی طرح آمین سورۃ فاتحہ کی مہر ہے۔
(از بیضاوی وشیخ زادہ)

''آمین'' کو سورۃ فاتحہ کے ساتھ نہ لکھا جائے:

" لانه لم يكتب في الامام ولم ينقل احد من الصحابة والتابعين ومن بعدهم رضى الله عنهم انه قرآن" (شیخ زادہ)

اس لئے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصحف میں آمین کو فاتحہ کے اختتام پر نہیں لکھا گیا۔ تمام صحابہ کرام اور تابعین اور ان کے بعد میں آنے والے اہل علم میں سے کسی ایک سے بھی ثابت نہیں کہ کسی نے کہا ہو کہ آمین قرآن پاک کا حصہ ہے۔

پڑھنے میں بھی فرق کیا جائے:

" وليست من القرآن اجماعا ولذا سن الفصل بينها وبين السورة بسكتة لطيفة " (روح المعانی)

آمین کا قرآن پاک سے نہ ہونا جب اتفاقی مسئلہ ہے تو اسی وجہ سے اس میں سنت طریقہ یہی ہے کہ سورۃ فاتحہ کے پڑھنے کے بعد معمولی سکتہ (خاموشی) اختیار کرے پھر آمین پڑھے۔ راقم کے نزدیک پسندیدہ صورت یہ ہے کہ آواز میں بھی تھوڑا سا فرق کیا جائے، عام تلاوت میں سورۃ فاتحہ کو جس لہجہ سے پڑھ رہا ہے، آمین کو اسی لہجہ سے نہ پڑھے تاکہ پڑھتے ہوئے فرق سمجھ آجائے۔

آمین کا معنی: مشہور معنی تو یہ ہے " استجب " قبول کر۔ تاہم اور معانی بھی ذکر کئے گئے ہیں وہ یہ ہیں۔ اسی طرح کر'' ہم تیری طرف ہی ارادہ کرتے ہیں'' ہم تیری ثناء کو تجھ تک پہنچانے سے عاجز ہیں'' ہم تجھ سے دعاء کی قبولیت کی امید کرتے ہیں'' ہم تمام چیزوں سے اعراض کر کے تیری طرف ہی رجوع کرتے ہیں۔ جو بھی تو ہمارے لئے فیصلہ کرے ہم اسی پر راضی ہیں۔

تمام معانی میں درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف کامل طور پر اپنے عجز کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہی ہر بھلائی کی اصل ہے۔ اور اسی سے حق کی طرف پہنچنے کے راستہ کی تکمیل ہوتی ہے اور آفات سے سلامتی حاصل ہوتی ہے۔

" سلمنا الله عنها بمحض فضله ومنه انه ارحم الرحمين وصلى الله على سيدنا محمد وآله اجمعين " (تفسیر الرحمن)

تنبیہ: " ذکر غیر واحد ان من قال ﴿ان آمین من القرآن کفر﴾ بہت سے اہل علم نے یہ واضح کیا ہے کہ اگر کسی شخص نے کہا کہ آمین قرآن پاک کا حصہ ہے تو وہ کافر ہو جائے گا۔

(روح المعانی)

آمین کا تلفظ: مد سے بھی پڑھا گیا ہے اور یہی مشہور ہے اور نبی کریم ﷺ سے بھی زیادہ اسی طرح پڑھنا ثابت ہے کیونکہ " ومدبها صوته " کے الفاظ احادیث مبارکہ میں موجود ہیں۔ کہ آپ نے اپنی آواز کو لمبا کیا۔ تاہم بغیر مد کے امین بروزن فعیل پڑھنا بھی جائز ہے۔ (بیضاوی بزیادۃ ونقصان)

آمین کہنے کی فضیلت:

" عن ابی میسرة ان جبریل علیه السلام اقرأ النبی صلی الله علیه وسلم الفاتحة فلما قال ولا الضالین قال له قل آمین " (بیهقی فی الدلائل، ابی ابن شیبه، مظهری)

" ابو میسرہ سے مروی ہے بیشک جبرائیل علیہ السلام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فاتحہ پڑھنے کے متعلق عرض کیا جب آپ نے " ولا الضالین " پڑھا تو جبرائیل نے عرض کیا آپ آمین بھی کہیں"۔

" کان النبی ﷺ اذا قرأ ولا الضالین قال آمین" (ابو داود، ترمذی، دار قطنی، صحیح ابن حبان، مظهری)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ولا الضالین پڑھتے تو آمین (بھی) کہتے۔

نماز میں آمین آہستہ کہی جائے:

" عن ابی موسی الاشعری قال، قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا قرأ (یعنی الامام) غیر المغضوب علیهم ولا الضالین فقولوا آمین یحبکم الله " (مسلم، ابو داود، نسائی، ابن ماجه، ابن ابی شیبه، روح المعانی)

" حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب امام ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ﴾ پڑھے تو تم کہو آمین اللہ تعالیٰ تم سے محبت رکھے گا"۔

" واخفائها مذهب سادتنا الحنفية وهو مذهب امير المؤمنين علی کرم الله

تعالیٰ وجهه وعبد الله بن مسعود وعند الشافعية يجهر بها " (روح المعانی)

ہمارے سادات حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ آمین آہستہ کہی جائے ،اور یہی مذہب امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا بھی ہے اور یہی مذہب حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا بھی ہے۔البتہ اس مسئلہ میں شافعیہ کا اختلاف ہے وہ آمین بلند آواز سے پڑھنے کا مذہب رکھتے ہیں۔

" وروی الاخفاء عن رسول الله ﷺ عبد الله بن مغفل وانس رضی الله عنهما " (کشاف ، روح المعانی)

'' آمین آہستہ کہنے والی روایات عبد اللہ ابن مغفل اور انس رضی اللہ عنھما نے رسول اللہ ﷺ سے بیان کی ہیں''۔

" ورواية الجمهور محمولة على التعليم " جن حضرات نے بلند آواز سے کہنے والی روایات کو ذکر کیا ہے ان میں تعلیم امت کے لئے کبھی کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معمولی آواز سے آمین کہا ہے جیسا کہ قراءت میں کبھی ایسا ثابت ہے۔ (روح المعانی)

☆ " عن ابی هريرة ان رسول الله ﷺ قال اذا قال الامام غير المغضوب عليهم ولا الضالين فقولوا آمين فانه من وافق قوله تعالىٰ قول الملائكة غفرله ماتقدم من ذنبه " (بخاری باب جهر الماموم بالتامين)

'' حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ۔ بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب امام ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ﴾ کہے تو آمین کہو۔ بیشک جس کا قول (آمین کہنا) ملائکہ کے قول کے موافق ہو گیا اس کے اس سے پہلے گناہ معاف کر دیئے گئے''۔

☆ " عن ابی هريرة ان رسول الله ﷺ قال اذا قال احدكم آمين وقالت الملائكة في السماء آمين فوافقت احداهما الاخرى غفرله ما تقدم من ذنبه " (بخاری باب فضل التامين)

'' حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ نے کہا بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی ایک آمین کہے تو آسمانوں میں فرشتے آمین کہتے ہیں جب ایک آمین دوسری آمین کے موافق ہوگئی تو اس کے پہلے گناہ معاف کر دیئے گئے''۔

وضاحت: " وقد اجتمعت الامة على ان المنفرد يؤمن وكذالك الامام والماموم فی الصلوة السرية وكذالك قال الجمهور في الجهرية " (نووی علی مسلم ج ۱ ص ۱۹۲)

امت کا اس مسئلہ پر اجماع ہے کہ بیشک منفرد، امام اور مقتدی آمین کہیں سری (آہستہ آواز سے پڑھنے والی) نمازوں میں اور جہری (بلند آواز سے پڑھنے والی) نمازوں میں بھی سب کا آمین پڑھنا ہی جمہور علماء کا مذہب ہے"۔

وانه ينبغي ان يكون تامين الماموم مع تامين الامام لاقبله ولا بعده لقوله ﷺ واذا قال الامام " غير المغضوب عليهم ولا الضالين ......

روایة اذا امن فامنوا فمعناها اذا اراد التامین" (نووی ج ۱ ص ۱۹۴)

حدیث پاک کا معنیٰ یہ ہے مناسب یہ ہے کہ امام جب آمین کہے تو ساتھ ہی مقتدی بھی آمین کہیں نہ پہلے اور نہ بعد اور جن روایات میں یہ ہے " **واذا امن الامام فامنوا** " جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔ ان کا مطلب یہ نہیں کہ امام جب آمین کہہ چکے (اور تم اس کی آمین کو سن لو) تو تم آمین کہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب امام آمین کہنے کا ارادہ کرے تو تم بھی آمین کہو۔

حدیث پاک میں ذکر ہے جس کی آمین ملائکہ کی آمین کے موافق ہوگی اس کے پہلے گناہ معاف ہوں گے، اس سے بھی واضح ہو رہا ہے کہ ملائکہ کی آمین کے موافق ہونے میں چند احتمال ہیں۔ انسان کی آمین اور ملائکہ کی آمین ایک وقت میں ہو، ایک طرح ہو یعنی ریاء کاری نہ ہو، انداز تکبرانہ نہ ہو کسی کو سنانا اور چرچا کرنا مقصود نہ ہو۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ آہستہ آواز میں آمین کہی جائے کیونکہ فرشتوں کی آمین آہستہ آواز میں ہوتی ہے۔ اگر یہ بات کسی کو تسلیم نہ ہو تو وہ شخص کوئی ایک صحیح حدیث، احادیث کی کتب میں سے نکال کر دے، جس میں یہ ذکر ہو کہ فرشتے بلند آواز سے آمین کہتے ہیں۔ جب یہ کوئی بھی نہ ثابت کر سکے تو سمجھ لیجئے کہ حدیث پاک سے آہستہ آواز میں آمین کہنا ثابت ہو رہا ہے، بلند آواز سے آمین کہنے پر اس حدیث کو دلیل بنانا درست نہیں۔

خیال رہے کہ بخاری نے اس حدیث کا عنوان قائم کیا ہے۔ "**باب جهر الامام بالتامين**" (**امام** کے بلند آواز سے آمین کہنے کا باب) لیکن بخاری کا یہ عنوان قائم کرنا صحیح نہیں، اس لئے کہ اس عنوان میں جو حدیث قائم کی گئی اس میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس کا معنیٰ بلند آواز سے آمین کہنا ہو۔ وہی حدیث بخاری رحمہ اللہ سے پہلے امام محمد رحمہ اللہ نے ذکر فرمائی اور آمین آہستہ آواز سے کہنا ثابت کیا ہے:

" عن ابی ہریرة ان رسول اللہ ﷺ قال اذا آمین الامام فامنوا فانه من وافق تامینه تامین الملائکة غفرله ماتقدم من ذنبه قال (مالک) فقال ابن شہاب کان النبی ﷺ یقول آمین "

" حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب امام آمین کہنے کا ارادہ کرے تو تم بھی آمین کہو بیشک جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوگئی اس کے پہلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے "۔

امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ابن شہاب نے کہا کہ نبی کریم ﷺ آمین کہتے تھے ۔اس حدیث پاک کو بیان کرنے کے بعد امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا:

" قال محمد وبھذا نأخذ ینبغی اذا فرغ الامام من ام الکتاب ان یؤمن الامام ویؤمن من خلفه ولا یجھرون بذلک " (مؤطا امام محمد باب آمین فی الصلوة)

امام محمد رحمہ اللہ نے کہا ہم اسی پر عمل کرتے ہیں کہ جب امام فاتحہ پڑھنے سے فارغ ہو تو وہ بھی آمین کہے اور جو اس کے پیچھے ہیں وہ بھی آمین کہیں اور بلند آواز سے نہ کہیں ۔

" عن ابی ہریرة قال کان رسول اللہ ﷺ یعلمنا یقول لا تبادروا الامام اذا کبر فکبروا واذا قال ولا الضالین فقولوا آمین واذا رکع فارکعوا واذا قال سمع اللہ لمن حمده فقولوا اللھم ربنا لک الحمد " (مسلم باب ائتمام الماموم بالامام)

" حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (نماز کا طریقہ) ہمیں سکھاتے تھے آپ فرماتے امام سے پہلے کوئی کام نہ کرو ،امام جب تکبیر کہے تو تم تکبیر کہو ،اور جب ولاالضالین کہے تو تم آمین کہو اور جب امام رکوع کرے تو تم رکوع کرو اور جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم " اللھم ربنا لک الحمد " کہو ۔

اس حدیث پاک سے پتہ چلا کہ آمین آہستہ آواز میں کہی جائے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے جب نماز کا طریقہ بتایا تو آمین بلند آواز سے کہنے کا ذکر نہیں فرمایا۔اور حدیث پاک کے دوسرے احکام سے بھی پتہ چل رہا ہے کہ آمین آہستہ کہی جائے کیونکہ ربنالک الحمد آہستہ کہنا ہے تو آمین کو بھی آہستہ کہا جائے گا کیونکہ حکم ایک ہے۔

" عن ابراھیم قال خمس یخفیھن الامام سبحانک اللھم وبحمدک والتعوذ وبسم اللہ الرحمن الرحیم وآمین واللھم ربنا لک الحمد "

(مصنف عبد الرزاق ج ۲ ص ۸۷ ، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۵۳۶)

حضرت ابراہیم نخعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں پانچ چیزیں امام مخفی رکھے۔

۱ ...... سبحانک اللھم وبحمدک (ثناء)۔ ۲......تعوذ (اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم)۔

۳......بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ۴......آمین۔ ۵......اللھم ربنا لک الحمد۔

اس مسئلہ پر اگر کوئی تفصیلی بحث دیکھنا چاہے تو راقم کی کتاب ''نماز حبیب کبریاء'' کا مطالعہ کرے۔

امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کا مسئلہ:

احناف کا مسلک: نماز میں قراءت کا مسئلہ احناف کے نزدیک یہ ہے کہ اگر ایک شخص نماز اکیلے پڑھ رہا ہے یا وہ امام ہے دوسروں کو نماز پڑھا رہا ہے تو اس شخص کے لئے مطلقاً قراءت فرض ہے۔ یعنی فاتحہ پڑھ لی یا اور کوئی سورۃ کہیں سے پڑھ لی یا چھوٹی تین آیتیں، یا بڑی کوئی آیت پڑھ لی تو اس کا فرض ادا ہو گیا۔

فاتحہ پڑھنا واجب ہے اسی طرح اور سورۃ ملانا واجب ہے۔ اگر اور کہیں سے قراءۃ کر لی اور فاتحہ کو جان بوجھ کر چھوڑ دیا تو واجب چھوڑ دیا لہذا نماز کا دوبارہ پڑھنا واجب ہے۔ اگر فاتحہ کو بھول کر چھوڑ دیا تو نماز سجدہ سہو سے درست ہو جائے گی کیونکہ بھول کر واجب کے چھوٹ جانے پر سجدہ سہو واجب ہوتا ہے۔ یہی حکم اور سورۃ کا ہے۔ فاتحہ پڑھ لی اور کہیں سے قراءۃ نہ کی۔ اگر جان بوجھ کر ایسا کیا تو نماز کا لوٹانا واجب ہے۔ بھول کر ایسا ہوا تو سجدہ سہو واجب ہوگا۔

مقتدی کی قراءت کا حکم:

جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہے اسے فاتحہ پڑھنا یا کوئی اور سورۃ پڑھنا منع ہے۔ امام کا پڑھنا ہی مقتدی کا پڑھنا سمجھا جائے گا۔ یہ حکم سب نمازوں کا ایک جیسا ہے خواہ امام بلند آواز سے قرآن پاک پڑھ رہا ہو یا آہستہ آواز سے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ وَاِذَا قُرِیَٔ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾

''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور خاموش رہو کہ تم پر رحم ہو''۔

" عن ابن مسعود انه صلى باصحابه فسمع انا سا يقرء ون خلفه فلما انصرف قال اما ان لكم ان تفقهوا اما آن ان تعقلو واذا قرئ القران فاستمعوا له وانصتوا كما امركم الله تعالىٰ "(روح المعانی وهكذا في المظهری)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھا رہے تھے، آپ نے سنا کہ کچھ لوگ ان کے پیچھے قراءت کر رہے ہیں نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے فرمایا کیا تمہارے لئے سمجھنے اور عقل رکھنے کا وقت نہیں آیا کہ جب قرآن پڑھا جائے تو غور سے سنو اور خاموش ہو جاؤ۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے۔

" عن ابی موسی قال علمنا رسول الله ﷺ قال اذا قمتم الى الصلوة فليؤمكم احدكم واذا قَرَأَ الامام فانصتوا "

(مسلم باب التشهد في الصلوة ج ا ص ۱۷۴ مسند احمد ج ا ص ۴۱۵)

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہمیں نبی کریم ﷺ نے (نماز کی) تعلیم دی آپ نے فرمایا جب تم نماز ادا کرنے کا ارادہ کرو تو تم میں سے ایک شخص تمہاری امامت کرے اور جب امام قرآن پڑھے تو تم خاموش رہو۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ امام جب قرات کرے تو مقتدی خاموش ہو کر سنیں۔''قال النیموی وھو حدیث صحیح'' علامہ نیموی نے کہا کہ حدیث صحیح ہے۔ (آ ثار سنن ص ۱۷۲)

" عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ انما جعل الامام ليئو تم به فاذا كبر فكبروا واذا قرأ فانصتوا " (ابوداود ،نسائی ، ابن ماجه ، مسند احمد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بیشک امام اسی لئے بنایا جاتا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ قرآن پڑھے تو تم خاموش رہو۔''وھذا حدیث صحیح ...... (آ ثار سنن ص ۱۷۵) یہ حدیث صحیح ہے یعنی قابل حجت واستدلال ہے۔

" قال محمد اخبرنا داؤد بن قيس القراء المدني ،اخبرني بعض ولد سعد بن ابی وقاص انه ذكر له ان سعدا قال وددت ان الذی یقرأ خلف

الامام فی فیہ جمرۃ " (موطا امام محمد ص ۹۸)

حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ پسند ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے پڑھے اس کے منہ میں چنگاری ہو۔

" قال محمد اخبرنا داؤد بن قیس القراء اخبرنا محمد بن عجلان ان عمر بن الخطاب قال لیت فی فم الذی یقرأ خلف الامام حجرا "

(موطا امام محمد ص ۹۸)

حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کاش کہ اس آدمی کے منہ میں پتھر ہو جو امام کے پیچھے قراءت کرتا ہے۔

اعتراض : نبی کریم ﷺ کے ایک ارشاد میں مطلقاً ذکر ہے کہ فاتحہ پڑھنے کے بغیر نماز ہوتی ہی نہیں:

" عن عبادۃ بن الصامت ان رسول اللہ ﷺ قال لاصلوۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب " (بخاری ،مسلم)

عبادہ ابن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو فاتحہ نہ پڑھے۔

جواب : جب پہلے احادیث سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ امام کے پیچھے قراءت سے منع کیا گیا ہے۔ تو یقینی بات یہ ہے کہ اس حدیث میں مقتدی کے بغیر امام اور اکیلے شخص کا ذکر ہے۔ مقتدی کو قراءت حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ وہ امام کے پیچھے اس کی اقتداء میں ہوتا ہے۔ امام کی قراءت کی وجہ سے مقتدی کو قراءت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس پر حدیث پاک دیکھیں۔

" ابو حنیفہ عن موسی عن عبد اللہ بن شداد عن جابر بن عبد اللہ ان رسول اللہ ﷺ قال من کان لہ امام فقراءۃ الامام لہ قراءۃ " (مسند امام اعظم)

حضرت جابر ابن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کا امام ہو تو امام کی قراءت اسی کی قراءت ہے۔

واضح ہو گیا کہ امام کی اقتداء میں مقتدی کو قراءت کرنا منع ہے۔ کیونکہ امام کی قراءت مقتدی کی قراءت ہے۔

تنبیہ: یہ بھی خیال رہے کہ " لاصلوة لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب " کا یہ معنی درست نہیں ''جو شخص فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ہوتی ہی نہیں'' بلکہ اس کا صحیح معنی یہ ہے ''جو شخص فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز کامل نہیں ہوتی'' یعنی نفی نماز کی نہیں بلکہ نماز کے کمال کی نفی ہے۔ کئی احادیث میں لفظ ''لا'' کمال کی نفی کے لئے آیا ہوا ہے۔ اس کی ایک مثال دیکھئے:

" عن انس قال قلما خطبنا رسول الله ﷺ الا قال لاایمان لمن لا امانة له ، لا دین لمن لاعهد له (بیهقی فی شعب الایمان ، مشکوة ص ۱۵)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے اکثر اوقات ہمیں خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا جس شخص کو امانت کا پاس نہیں اس کا ایمان کامل نہیں اور جس شخص کو وعدہ کا پاس نہیں اس کا کامل دین نہیں۔ فاتحہ والی حدیث میں بھی کمال کی نفی کرنا ہی درست ہے۔ اس لئے کہ اس معنی پر ایک اور حدیث دلالت کر رہی ہے:

" عن ابی هریرة عن النبی ﷺ قال من صلی صلوة لم یقرأ فیها بام القرآن فهی خداج ثلاثا غیر تمام" (مسلم ج ۱ باب وجوب قراء ة الفاتحة)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے نماز ادا کی اور اس میں سورۃ فاتحہ کو نہ پڑھا اس کی نماز ناقص ہے۔ یہ آپ نے تین مرتبہ فرمایا۔

حدیث پاک میں لفظ استعمال ہوا "خداج ، بکسر الخاء المعجمة هو النقصان (من نووی) یعنی خداج کا معنی نقصان ہے۔ خود حدیث پاک میں وضاحت کر دی گئی کہ ''خداج'' کا معنی ''غیر تمام'' نامکمل ہونا ہے۔ حدیث پاک میں یہ نہیں کہا گیا کہ جو شخص نماز میں فاتحہ نہیں پڑھے گا اس کی نماز سرے سے نہیں ہوگی یہ بھی نہیں فرمایا گیا کہ اس کی نماز فاسد ہوگی بلکہ یہ فرمایا گیا اس کی نماز ناقص ہوگی۔

اب واضح ہوا کہ مسلک احناف کا ہی حق ہے کہ فاتحہ پڑھنا واجب ہے، رکن نہیں۔ کیونکہ ترک واجب سے نقصان لازم آتا ہے اور ترک رکن سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ اس مسئلہ کو بہت تفصیل سے بفضلہ تعالیٰ راقم نے اپنی کتاب ''نماز حبیب کبریاء'' میں بیان کیا ہے اس کا مطالعہ ضرور کریں تمام اعتراضات وجوابات کا انشاء اللہ آپ کو بخوبی علم حاصل ہوگا۔

فضائل فاتحہ:

" عن ابی هریرة قال فانی سمعت رسول الله ﷺ یقول قال الله تعالی قسمت الصلوة بینی وبین عبدی نصفین ولعبدی ما سأل فاذا قال العبد الحمد لله رب العلمین قال الله تعالی حمدنی عبدی واذا قال الرحمن الرحیم قال الله تعالیٰ اثنی علی عبدی فاذا قال مالک یوم الدین قال مجدنی عبدی وقال مرة فوض الی عبدی فاذا قال ایاک نعبد وایاک نستعین قال هذا بینی وبین عبدی ولعبدی ماسال فاذا قال اهدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیهم غیر المغضوب علیهم ولاالضالین قال هذا لعبدی ولعبدی ما سأل " (مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کوفرماتے ہوئے سنا اللہ تعالیٰ نے فرمایا نماز میں نے اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دوحصوں میں تقسیم کردی۔ میرے بندے کے لئے وہ ہے جواس نے سوال کیا:

☆ جب بندہ کہتا ہے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ رب تعالیٰ کہتا ہے میرے بندے نے میری حمد بیان کی۔

☆ جب بندہ کہتا ہے ﴿اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری ثناء بیان کی۔

☆ جب بندہ کہتا ہے ﴿مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ رب قدوس کہتا ہے میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔ پھر رب تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے اپنے تمام معاملات میرے سپرد کردیئے۔ جب بندہ کہتا ہے ﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ رب تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے میرے بندے کے لئے وہ ہے جواس نے سوال کیا۔

☆ پھر جب بندہ کہتا ہے ﴿اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ﴾ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے بندے کے لئے ہے (یعنی اس کے سوالات ہیں) میرے بندے کے لئے وہی ہے جو اس نے سوال کیا (یعنی میں اپنے بندے کو وہی عطا کرتا ہوں جو مجھ سے مانگ رہا ہے)۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی سے سورۃ فاتحہ کی شان اور اہمیت بیان کی۔

وضاحت حدیث: اللہ تعالیٰ کا قول جو حدیث پاک میں ذکر ہے " قسمت الصلوۃ بینی وبین عبدی نصفین " (نماز میں نے اپنے اور اپنے بندے کے درمیاں دو حصوں میں تقسیم کردی) اس سے پتہ چل رہا ہے کہ شریعت کی دار ومدار، مخلوق کی مصلحتوں کی رعایت پر ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ﴾

''اگر تم بھلائی کرو گے اپنا بھلا کرو گے اور اگر برا کرو گے تو اپنا''۔

انسان کے لئے سب کاموں سے اہم کام یہ ہے کہ وہ اپنے دل کو رب تعالیٰ کی معرفت سے منور کرے، پھر اپنے آپ کو عبد سمجھے کہ میں عاجز ہوں اور رب کی عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔ یہی بات رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے سمجھ میں آ رہی ہے:

﴿ وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾

﴿ اور میں نے جن اور انسان اس لئے ہی پیدا کئے ہیں کہ وہ میری عبادت کریں ﴾

جب یہ سمجھ آ جائے تو خود بخود یہ واضح ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نبی کریم ﷺ پر نازل فرمائی اور اس کا پہلا نصف حصہ اپنی ربوبیت کی معرفت کا ذکر فرمایا اور دوسرے حصہ میں عبودیت کی معرفت کا ذکر فرمایا تا کہ اس سورۃ میں انسان کو کامل طریقہ سے معلوم ہو جائے کہ میں نے عبادت کرنی ہے اور عبادت بھی اس ذات کی کرنی ہے جو خالق، رب، رحمٰن اور رحیم ہے۔ جب بندہ کہتا ہے "الحمد للہ" تو اللہ تعالیٰ فرماتا "حمدنی عبدی" میرے بندے نے میری حمد کی۔ یہ دلالت کرتا ہے اس پر کہ حمد کا مقام ذکر کے مقام سے اعلیٰ ہے۔ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے تمہیدی طور پر یہ سمجھا جائے جب بندہ کہتا ہے ﴿بسم اللہ الرحمن الرحیم﴾ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " ذکرنی عبدی " میرے بندے نے میرا ذکر کیا (مجھے یاد کیا) یہاں سے چند چیزیں حاصل ہوئیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿ فَاذْكُرُوْنِىْ اَذْكُرْكُمْ ﴾ تم میری یاد کرو میں تمہارا چرچا کروں گا۔ یہاں بندے کو ذکر کرنے کا پہلے حکم ہے اس کے ذکر کے بعد رب تعالیٰ کے ذکر کو بیان کیا گیا جس سے واضح ہو گیا کہ بندہ اگر کسی جماعت میں رب تعالیٰ کا ذکر کرے گا تو یقیناً رب تعالیٰ کا فرشتوں کی جماعت میں اس بندے کا ذکر بہتر ہوگا۔

(۲) عبودیت میں ذکر کا مقام بہت ہی بلند حیثیت رکھتا ہے کیونکہ بندے کے ذکر سے ابتداء ہوئی ہے اس لحاظ پر اللہ کے ذکر میں کمال پایا گیا ہے کہ رب تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ جب حکم دینے والا خالق کائنات، مالک کائنات اور رب العلمین ہے تو یقیناً اس کا حکم بھی کامل درجہ رکھتا ہے۔ اس آیت ﴿فَاذْكُرُوْنِىْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ کے علاوہ اور آیات میں بھی ذکر کا حکم دیا گیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا﴾ اے ایمان والو اللہ کو بہت یاد کرو۔ اور فرمایا ﴿اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ﴾ جو اللہ کی یاد کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے۔ اور فرمایا ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَاهُمْ مُّبْصِرُوْنَ﴾ بیشک وہ جو ڈر والے ہیں جب انہیں کسی شیطانی خیال کی ٹھیس لگتی ہے ذکر کرتے ہیں (ہوشیار ہوجاتے ہیں) اسی وقت ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ آسان لفظوں میں یوں سمجھیں کہ مقام عبودیت میں کسی چیز کا بھی اتنا بیان نہیں جتنا کہ ذکر کو بیان کیا گیا ہے۔

(۳) "ذکرنی عبدی" (میرے بندے نے میرا ذکر کیا) سے پتہ چلتا ہے کہ "اللّٰہ" رب تعالیٰ کا ذاتی نام ہے اس کے ساتھ مختص ہے صفاتی نام نہیں اور رحمٰن ورحیم صفاتی نام ہیں۔ جب بندہ نے ﴿بسم الله الرحمن الرحیم﴾ پڑھا تو رب تعالیٰ نے کہا میرے بندے نے مجھے یاد کیا ہے۔ تو واضح ہوا کہ بسم اللہ میں لفظ اللہ سے ہی یہ پتہ چلا کہ وہ صرف رب تعالیٰ کا ہی ذکر کر رہا ہے۔ یہ تب ہی پتہ چلا جب کہ یہ تسلیم کیا کہ "اللّٰہ" رب تعالیٰ کا ذاتی نام ہے اسی کے ساتھ خاص ہے۔ اس تمہید کے بعد پتہ چلا کہ بندہ جب کہتا ہے "الحمد للّٰہ" رب تعالیٰ کہتا ہے ﴿حَمِدَنِىْ عَبْدِىْ﴾ میرے بندے نے میری حمد کی۔ "هذا يدل على ان مقام الحمد اعلى من مقام الذكر" یہ دلالت کرتا ہے کہ مقام حمد، مقام ذکر سے اعلیٰ ہے۔ کیونکہ اس عالم کی تخلیق میں سب سے پہلے جس کلام کا ذکر ہوا وہ "الحمد" ہی ہے اس پر دلیل یہ ہے کہ فرشتوں نے آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے کہا ﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾ ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح بیان کرتے ہیں اور تیری پاکیزگی کا ذکر کرتے ہیں۔ اور جب یہ جہان فنا ہوجائے گا اس وقت بھی جس کلام کا ذکر ہوگا وہ "الحمد" کا ذکر ہی ہوگا۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت والوں کے کلام

کا ذکر ان الفاظ مبارکہ سے فرمایا ﴿وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ اور ان کی دعاء کا خاتمہ یہی ہے کہ سب حمدیں اللہ کے لئے ہیں جو رب ہے سارے جہان کا۔ اور حمد کی افضلیت پر عقل کا بھی تقاضا ہے کیونکہ فکر اللہ تعالیٰ کی ممکن نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

" تفکروا فی الخلق ولا تفکروا فی الخالق "

'' مخلوق میں تفکر کرو اور خالق میں تفکر نہ کرو''۔

اس لئے کہ کسی چیز میں تفکر کے لئے ضروری ہے کہ اس چیز کا تصور پہلے آئے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات وحقیقت کا تصور وادراک ممکن نہیں۔ بھذا اس کی ذات میں تفکر بھی ممکن نہیں اسی وجہ سے تفکر صرف اس کے افعال اور اس کی مخلوقات میں ہوسکتا ہے پھر یہ بھی دلائل سے ثابت ہے کہ خیر مطلوب بالذات ہے۔ اور شر مطلوب بالعرض ہے ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی مخلوقات ومصنوعات میں تفکر کرے گا اسے رب تعالیٰ کے فضل اس کی رحمت اور اس کے احسانات کا علم حاصل ہوگا اور اسے یہ بھی علم حاصل ہوگا کہ اس کے احسانات ان گنت ہیں۔ لہٰذا ان کی حمد اور ان کا شکر بھی بہت ہی زیادہ ہونا چاہیے اسی وجہ سے کہا ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ سب حمدیں اللہ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا مالک ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رب تعالیٰ بھی اس کی حمد کی تعریف کرتا ہے کہ "حمدنی عبدی" میرے بندے نے میری حمد کی ہے۔ گویا کہ رب تعالیٰ نے گواہی دے دی کہ بندہ دنیا اور آخرت کے میرے فضل اور احسانات پر واقف ہو چکا ہے۔ اسی وجہ سے وہ میری حمد کر رہا ہے اس کی زبان اس کے دل کی ترجمان ہے۔ اور وہ شخص ایمان کے دریا میں مستغرق ہے اور اللہ تعالیٰ کے کرم کا دل سے بھی اقرار کر رہا ہے، زبان سے بھی، عقل سے بھی اور بیان سے بھی اس کی نعمتوں کا اقرار کر رہا ہے اس وضاحت کے بعد یہ مسئلہ روز روشن کی طرح نکھر کر سامنے آ گیا کہ حمد کو بہت بڑی فضیلت حاصل ہے۔

جب بندہ "الرحمن الرحیم" کہتا ہے تو رب تعالیٰ فرماتا ہے "عظمنی عبدی" میرے بندے نے میری عظمت بیان کی خیال رہے کہ بسم اللہ میں بھی رحمٰن ورحیم کا ذکر ہے بندہ جب بسم اللہ پڑھتا ہے تو رب تعالیٰ فرماتا ہے "ذکرنی عبدی" بندے نے مجھے یاد کیا ہے اس میں "عظمنی عبدی" (میرے بندے نے میری عظمت بیان کی) نہیں کہا اس میں حکمت کیا ہے؟ اس میں حکمت

یہ ہے کہ حمد میں رحمن ورحیم کے ذکر سے پہلے جب بندہ کہتا ہے الحمد للہ تو وہ اللہ کے کمالات ذاتیہ کا اقرار کرتا ہے اور یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ دوسروں کو کمال عطا کرنے والا اور ان کی تکمیل کرنے والا بھی وہی ہے پھر اس کے بعد جب بندہ کہتا ہے: "رب العلمین" تو یہ دلیل ہے اس پر کہ "اللہ تعالیٰ کامل لذاته" غیروں کو کامل کرنے والا شریک سے پاک ہے یعنی اس کا کوئی شریک نہیں۔

پھر جب بندہ کہتا ہے "الرحمن الرحیم" تو یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کامل لذاتہٖ ہے غیروں کو کامل کرنے والا ہے وہ شریک، نظیر، مثل وغیرہ سے پاک ہے اور بہت زیادہ رحم کرنے والا، فضل فرمانے والا اپنے بندوں پر کرم کرنے والا ہے یقینی بات ہے کہ عقل وفہم میں رب تعالیٰ کا کمال وجلال اور اس کا فضل واحسان حمد کے بعد رحمن ورحیم کے الفاظ مبارکہ سے سمجھ آیا جو بسم اللہ سے سمجھ نہیں آیا۔ اسی وجہ سے اس مقام پر ہی رب تعالیٰ نے فرمایا "عظمنی عبدی" میرے بندے نے میری عظمت بیان کی۔ جب بندہ کہتا ہے ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ رب تعالیٰ فرماتا ہے ﴿مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ﴾ میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی یعنی جو چیزیں میری شان کے لائق نہیں ان سے میرے بندے نے میری تقدیس پاکیزگی بیان کی۔

اللہ تعالیٰ کی تقدیس بیان کرنے کا مطلب کیا ہے؟ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے یہ سمجھا جائے کہ انسان جب دنیا میں دیکھتا ہے کہ ظالم لوگوں کو مظلوموں پر تسلط حاصل ہے۔ طاقت ور لوگوں کو ضعیفوں پر غلبہ حاصل ہے عالم، زاہد، کامل، متقی حضرات عیش کی تنگی میں ہوتے ہیں اور کافر، فسق راحت میں ہوتے ہیں قابل رشک عظیم نعمتوں میں ہوتے ہیں۔ یہ حال دیکھ کر بڑے بڑے نیک لوگ بھٹک جاتے ہیں وہ کہتے ہیں کیا یہی ارحم الراحمین کی رحمت کا تقاضا ہے؟ کیا یہی احکم الحاکمین کے فیصلے ہیں کہ کافروں اور فاسقوں کو نوازا جائے اور مومنوں کو محروم کیا جائے (معاذ اللہ)۔ اسی حال کو ایک شاعر احمد ابن یحیٰ ابن اسحاق روا ندی نے یوں بیان کیا:

کم عاقل عاقل اعیت مذاهبه ، وجاهل جاهل تلقاه مرزوقا

هذا الذی ترک الاوهام حائرة ، وصیر العالم النحریر زندیقا

کتنے ہی کامل عاقل ایسے ہوتے ہیں جن کا ذریعہ معاش تنگ کر دیتا ہے کتنے کامل جاہل عیش وعشرت میں ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے جس نے وہموں کو متحیر (حیرت زدہ) کردیا ہے اور پختہ علم رکھنے والے علما کو بے دین کردیا ہے۔اس نازک صورت حال میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر خاص رحم وکرم فرماتا ہے انہیں روز جزاء کی سمجھ عطا کرتا ہے وہ انسان سمجھ جاتے ہیں کہ ہاں قیامت کے دن ظالموں سے مظلوموں کوانصاف دلایا جائے گا۔نیک لوگوں کو ثواب ،اجر عظیم عطاء کیا جائے گا۔کافروں کو عذاب دیا جائے گا۔جب اللہ تعالیٰ کے بندوں کو یہ سمجھ عطا ہوجاتی ہے۔تو وہ کہتے ہاں اللہ تعالیٰ یقیناً ارحم الرامین ہے اس کے احکم الحاکمین ہونے میں کوئی شک نہیں۔وہ ہر شخص کو قیامت کے دن اس کے اعمال کے مطابق جزاء عطاء کرے گا۔تو اس طرح باطل تصورات سے دور رہ کر گویا کہ رب تعالیٰ سے ظلم کرنے اور ظلم کے تشبیہ سے بھی اسے پاک تصور کر کے اس کی شان کے لائق جو نہیں تھا اس سے رب تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کی۔

اسی وجہ سے بندے کے ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ کہنے پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "مجدنی عبدی" میرے بندے نے میری تقدیس بیان کی۔جب بندہ کہتا ہے ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ھذا بین وبین عبدی" یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے یعنی خالق میں ہوں حکم میں دیتا ہوں عبادت کی توفیق میں عطا کرتا ہوں بندے کی امداد میں کرتا ہوں۔بندہ میری دی ہوئی قدرت سے عمل کرتا ہے میری عبادت کرتا ہے مجھ سے ہی امداد طلب کرتا ہے۔جب بندہ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ کہتا ہے رب تعالیٰ فرماتا ہے ﴿هٰذَا لِعَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَاسَاَلَ﴾ یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے سوال کیا ہے۔بندہ جب دیکھتا ہے کہ مسائل الالٰھیہ ہوں یا نبوت کے مسائل ہوں یا قیامت کے ساتھ متعلق مسائل ہوں تمام میں لوگ اختلاف کا شکار ہیں۔کسی کا تعلق نفی سے اور کسی کا اثبات سے اس مشکل سے نکلنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت حاصل نہ ہو تو وہ رب تعالیٰ کے حضور عرض کرتا ہے۔﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ تو رب تعالیٰ بھی اپنی مہربانی سے اپنے بندے کو ہدایت عطا فرمادیتا ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ تمام ملائکہ اور انبیاء کرام بھی اپنی التجائیں رب کے حضور ہی کرتے رہے۔لہٰذا

امت کو بھی چاہیے کہ وہ بھی رب تعالیٰ سے مانگنے میں غافل نہ ہوں۔اسی حدیث سے یہ بھی فائدہ حاصل ہوگیا کہ سورۂ فاتحہ کی آیات سات ہیں اور نماز میں ظاہری اعمال بھی سات ہیں۔قیام،رکوع رکوع کے بعد کھڑا ہونا پہلا سجدہ، پہلے سجدہ کے بعد بیٹھنا، دوسرا سجدہ، اور قعدہ فاتحہ کی آیات ان اعمال کی تعداد کے مساوی ہیں اور اعمال جسم کی مثال ہیں اور فاتحہ ان میں روح کی حیثیت رکھتی ہے۔کمال اسی وقت حاصل ہوگا جب روح جسم سے ملے۔﴿بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ قیام کے مقابل ہے چند وجہ سے اسے قیام کے مقابل سمجھا جاسکتا ہے۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ با جب ''اسم اللہ'' کے ساتھ ملتی ہے تو اسے مرتفع رکھا جاتا ہے۔یعنی بلند کر کے لکھا جاتا ہے جس سے قیام کی طرف اشارہ ملتا ہے۔اور وجہ یہ ہے کہ کاموں کی ابتداء میں ''بسم اللہ'' شریف وخیر وبرکت کے لئے پڑھی جاتی ہے۔ورنہ کام بے برکت ہوتا ہے نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ''کل امر ذی بال لایبدأ فیہ ببسم اللہ فھو ابتر'' ہر ذی شان کام جس کی ابتداء بسم اللہ سے نہ ہو وہ بے برکت ہوتا ہے۔اور رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَاسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى﴾

''بیشک مراد کو پہنچا جو ستھرا ہوا اور اپنے رب کا نام لے کر نماز پڑھی''۔

اسی طرح اعمال کی ابتداء بھی اکثر اوقات قیام سے ہوتی ہے۔لہذا قیام اور بسم اللہ میں مناسبت پائی گئی ہے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کو رکوع کے مقابل ہونے کی حیثیت حاصل ہے اس لئے کہ بندہ مقام تحمید میں رب تعالیٰ کی طرف بھی نظر کرتا ہے اور مخلوق کی طرف بھی۔کیونکہ حمد کا مطلب ہے تعریف کرنا اکثر طور پر لوگ انعام کے حاصل ہونے پر کسی کی تعریف کرتے ہیں بندہ گویا کہ حمد کرنے میں کبھی منعم کی طرف توجہ کرے گا اور کبھی نعمت کی طرف۔جب وہ منعم کی طرف نظر کرے گا تو اسے بحر توحید میں مستغرق ہونے کی کیفیت حاصل ہوگی اور جب نعمت کی طرف نظر کرے گا تو یہ نظر مخلوق کی طرف ہوگی کیونکہ ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے گویا یہ مقامِ اعراض ہوگا یعنی خالق سے نظر پھیر کر مخلوق کی طرف نظر کی گئی۔جس طرح یہ حالت، استغراق اور اعراض کے درمیان ہے اسی طرح رکوع بھی قیام اور سجود کے درمیان ہوتا ہے۔ تو پتہ چلا کہ حمد کو رکوع کے مقابل ہونے کا مقام حاصل ہے۔اور وجہ یہ

بھی ہے کہ حمد کثیر نعمتوں پر دلالت کرتی ہے اور کثیر نعمتیں، پیٹھ پر بوجھ کی حیثیت رکھتی ہیں اور بوجھ سے پیٹھ ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔اسی طرح رکوع کے حال میں بھی انسان کی پیٹھ جھکی ہوتی ہے۔جس سے واضح ہوتا ہے کہ حمد اور رکوع میں ایک خاص مناسبت پائی جاتی ہے۔الرحمٰن الرحیم جب بندہ کہتا ہے تو اسے رکوع کے بعد کھڑا ہونے کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔اس لئے کہ رکوع میں انسان رب کے حضور جھک کر اپنے عجز کا اظہار کرتا ہے اس کی عظمت بیان کرتا ہے اس کے بعد کھڑا ہو جاتا ہے۔اسی طرح رب تعالیٰ اپنی رحمت ومہربانی سے عاجز لوگوں، جھکے ہوئے لوگوں کو سیدھا کھڑا کر دیتا ہے۔یعنی ان کی حالت کو سنوار دیتا ہے۔

﴿ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ کو پہلے سجدہ سے مناسبت حاصل ہے۔اس لئے کہ ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ سے رب تعالیٰ کے کامل قہر اور جلال اور کبریائی کا پتہ چلتا ہے اس سے شدید خوف حاصل ہوتا ہے۔جس سے بہت زیادہ خشوع وخضوع حاصل ہوتا ہے کامل خشوع وخضوع پر دلالت کرنے والا نماز کا رکن سجدہ ہی ہے۔﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ دو سجدوں کے درمیان بیٹھنے کی حالت کے مناسب ہے اس لئے کہ "ایاک نعبد" سے پہلے سجدہ کی خبر حاصل ہوتی ہے اور ﴿اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ سے دوسرے سجدہ کی توفیق حاصل کرنے کی دعا کی جاتی ہے۔﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾ دوسرے سجدہ کے مناسب ہے اس لئے کہ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾ سے بہت اہم چیزوں کا سوال کیا جاتا ہے یہ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے۔جب بہت زیادہ خشوع وخضوع پایا جائے چونکہ کامل خشوع وخضوع دوسرے سجدہ میں ہی پایا جاتا ہے۔﴿ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ سے لے کر آخر تک قعدہ کے مناسب ہے اس لئے کہ بندہ جب بہت ہی عجز کا اظہار کرتا ہے۔تو اللہ تعالیٰ اسے اکرام عطا فرماتا ہے اور اپنے سامنے بیٹھنے کا حکم دیتا ہے یہ رب تعالیٰ کی طرف سے بندے پر عظیم انعام ہے یہ کیفیت ﴿ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ کے بہت ہی مناسب ہے۔

فائدہ جلیلہ: نبی کریم ﷺ کو جب رب تعالیٰ نے معراج کرایا اور عظیم انعام سے نوازا کہ آپ کو قاب قوسین کی رفعت عطا فرمائی تو آپ نے رب تعالیٰ کے حضور اپنی عبادات قولیہ، بدنیہ اور مالیہ کا تحفہ پیش فرماتے ہوئے عرض کیا "التحیات للہ والصلوات والطیبات" یا ایک روایت کے مطابق

یہ عرض کیا"التحیات المبارکات الصلوات الطیبات للہ" یہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج اور رفعت کی بات ہے۔لیکن مومن کی معراج کیا ہے؟

" الصلوۃ معراج المؤمن " "نماز مؤمن کی معراج ہے"۔

جب مؤمن اپنی معراج کے انتہائی اکرام کے درجے پر پہنچتا ہے کہ اسے رب تعالیٰ کے حضور بیٹھنے کا شرف حاصل ہوتا ہے تو اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ رب تعالیٰ کے حضور اپنا نذرانہ عقیدت ان الفاظ سے ہی پیش کرے جو رسول اللہ ﷺ نے پیش فرمائے۔ بندہ جب یہ الفاظ پڑھے گا تو اسے نبی کریم ﷺ کے معراج کے شمس (سورج) سے ایک ادنی سی جھلک حاصل ہو جائے گی۔اور آپ کے معراج کی برکات کے سمندر سے ایک قطرہ حاصل ہو جائے گا۔کیا ہی خوب مقام ﴿فاولٰئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبین﴾ کا اسے حاصل ہو جائے گا۔

یاد رکھئے! سورۃ فاتحہ کی سات آیات ہیں جو سات اعمال (جن کا ذکر ابھی ہوا) کی روح کی حیثیت رکھتی ہیں۔اور یہ سات اعمال انسان کی تخلیق میں سات مراتب کی روحیں ہیں۔وہ سات مراتب جن کا ذکر ان آیات مبارکہ میں ہے:

﴿ ولقد خلقنا الانسان من سللۃ من طین ☆ ثم جعلنہ نطفۃ فی قرار مکین ☆ ثم خلقنا النطفۃ علقۃ فخلقنا العلقۃ مضغۃ فخلقنا المضغۃ عظما فکسونا العظم لحما ثم انشانہ خلقا اخر فتبرک اللہ احسن الخلقین﴾

"اور بے شک ہم نے آدمی کو چنی ہوئی مٹی سے بنایا پھر اسے پانی کی بوند کیا ایک مضبوط ٹھہراؤ میں۔پھر ہم نے اس پانی کی بوند کو خون کی پھٹک کیا۔پھر خون کی پھٹک کو گوشت کی بوٹی،پھر گوشت کی بوٹی کو ہڈیاں پھر ان ہڈیوں پر گوشت پہنایا پھر اسے اور صورت میں اٹھان دی تو بڑی برکت والا ہے اللہ سب سے بہتر بنانے والا ہے"۔

اسی سے ایک اور مسئلہ سمجھ میں آ گیا کہ جس طرح جسموں کے کثیر مراتب ہیں اسی طرح روحوں کے مراتب بھی کثیر ہیں۔روح الارواح اور نور الانوار، اللہ تعالیٰ ہی ہے اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا﴿ وان الی ربک المنتھی ﴾۔

فائدہ عظیمہ : الصلوۃ معراج العارفین ، نماز عارفین کی معراج ہے۔

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے کچھ تفصیل ہے۔ نبی کریم ﷺ کے معراج کی دو قسمیں ہیں ایک ظاہری اور دوسری باطنی۔ معراج ظاہری کی پھر دو قسمیں ہیں۔ ایک مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک اور دوسری مسجد اقصیٰ سے لے کر اللہ تعالیٰ کی ملکوت کی بلندیوں تک۔ باطنی معراج جس کا تعلق عالم ارواح سے ہے اس کی بھی دو قسمیں ہیں ایک عالم شہادۃ سے لے کر عالم غیب تک اور دوسرا عالم غیب سے لے کر عالم غیب الغیب تک۔ یہ دونوں دو قوسوں کے درجہ میں ہیں جو آپس میں ملی ہوں، نبی کریم ﷺ نے ان دو قوسوں کے فاصلہ کو بھی پھلانگ کر ختم کر دیا اور زیادہ قرب اختیار کر لیا۔ رب تعالیٰ کے ارشاد ﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى﴾ پھر وہ (جلوہ) نزدیک ہوا پھر خوب اتر آیا تو اس جلوے اور اس محبوب میں دو ہاتھ کا فاصلہ رہا بلکہ اس سے بھی کم) کا بھی یہی مطلب ہے گویا کہ "او ادنی" کا اشارہ فناء فی اللہ کی طرف ہے کہ وہ محبوب رب تعالیٰ کے جلوہ میں مستغرق ہو گیا۔ انتقال عالم شہادۃ سے عالم غیب تک کو یوں سمجھئے کہ ہر وہ چیز جس کا تعلق جسم اور جسمانیات سے ہے وہ عالم شہادت ہی ہے کیونکہ انسان اپنی بصر سے ان کا مشاہدہ کرتا ہے۔ پھر روح کا انتقال عالم اجساد (جسموں والے جہاں) سے عالم ارواح کی طرف یہ عالم شہادۃ سے عالم غیب کی طرف انتقال اور سفر ہے۔

عالم ارواح ایسا عالم ہے جس کی انتہا نہیں۔ عالم اجساد سے تعلق رکھنے والی ارواح میں اعلیٰ درجہ ارواح بشریہ کا ہے پھر آسمانوں سے متعلق ارواح، پھر کرسی، پھر عرش سے متعلقین ارواح ملائکہ، پھر انتہا اس ذات کی طرف ہوتی ہے جسے مسبب الاسباب، مبدأ الکل، منبع الرحمۃ، مبدأ الخیر اور نور الانوار کہا جاتا ہے۔ وہ ذات کبریاء ہے یہاں سے ثابت ہوا عالم ارواح حقیقت میں عالم غیب ہے۔ حضرت جلال ربوبیت غیب الغیب ہے۔ ابھی تک جو بیان کیا ہے اس سے یہ واضح ہوا کہ معراج کی دو قسمیں ہیں۔ عالم شہادۃ سے عالم غیب کی طرف معراج اور عالم غیب سے عالم غیب الغیب تک معراج، یہ ثبوت برھان یقینی سے ہے۔

اب اس تمہید کے بعد مقصد کو بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج کو پہنچے اور واپس لوٹنے کا ارادہ فرمایا تو رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے رب العزۃ مسافر جب اپنے وطن کو لوٹنے کا ارادہ کرتا ہے تو اپنے اصحاب واحباب کے لئے تحفے لے کر جاتا ہے۔ میں کیا تحفہ

لے کر جاؤں؟ تو رب تعالیٰ کی طرف سے کہا گیا "ان تحفة امتک الصلوة "بیشک تیری امت کا تحفہ نماز ہے کیونکہ یہ معراج جسمانی اور معراج روحانی کی جامع ہے۔اس لئے کہ جسمانی معراج افعال سے ہوتی ہے اور روحانی اذکار سے۔اے بندے! جب تم اس معراج کو شروع کرنے کا ارادہ کرو تو پہلے پاکیزگی اختیار کرو کیونکہ یہ مقام مقدس مقام ہے اس لئے تم اپنے کپڑے پاکیزہ رکھو، جسم پاکیزہ رکھو، اس لئے کہ تمہیں اب ایسا مقام حاصل ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کو نبوت کے حاصل ہوتے وقت حاصل تھا۔جیسا کہ رب تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى﴾

تم اپنے جوتے اتار ڈالو بیشک تم پاک وادی طوی میں ہو۔

اے انسان تو یہ بات کبھی نہ بھول کہ تیرا ساتھی فرشتہ بھی ہے اور شیطان بھی تو خود فیصلہ کر کہ تو نے کس کا ساتھ دینا ہے۔ دین اور دنیا میں سے تو نے کس کا انتخاب کرنا ہے۔عقل اور خواہشات سے تو نے کسے اختیار کرنا ہے۔خیر وشر، صدق وکذب، حق وباطل، حلم (بردباری) وطیش، قناعت (تھوڑی چیز پر اکتفاء) وحرص، غرضیکہ تمام صفات متضادہ (ایک دوسرے کی مخالف صفات) میں سے تو نے کسے حاصل کرنا ہے۔یقیناً تو نے ایک جانب کو اختیار کرنا ہے اور دوسری جانب کو چھوڑنا ہے۔اے انسان اگر تو معراج کا مقام حاصل کرنا چاہتا ہے تو یقیناً تجھے وہ راہ اختیار کرنی پڑے گی جو نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کی ہے۔پھر تجھے کون سا مقام حاصل ہوگا؟ اسے ان واقعات کی روشنی میں دیکھ اور اپنی قسمت پر ناز کر "الاترى ان الصديق اختار صحبة محمدعليه السلام فلزمه فى الدنيا وفى القبر وفى القيامة وفى الجنة" کیا تم دیکھتے نہیں کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی صحبت کو اختیار کیا دنیا میں ہر مقام پر ان کے ساتھ رہے سفر ہو یا حضر، مکہ ہو یا مدینہ، مقام امن ہو یا مقام جنگ تو آپ کو نبی کریم ﷺ کا ساتھ قبر میں بھی حاصل ہو گیا اور قیامت میں بھی ساتھ حاصل ہوگا اور جنت میں بھی۔"وان كلب اصحاب الكهف صحبهم فلزمهم فى الدنيا وفى الآخرة" بیشک اصحاب کہف کے کتے نے ان کی مصاحبت کی تو دنیا میں ہمیشہ کے لئے اسے ان کا ساتھ حاصل ہوا اور آخرت میں بھی ان کا ساتھ حاصل ہوگا۔یہی راز اس آیت کریمہ سے سمجھ آ رہا ہے:

﴿ يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ ﴾

''اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ''۔

اے اللہ کے بندے جب تو پاکیزہ صفات کو حاصل کر کے پاکیزگی بھی حاصل کر لے اب تو اپنے ہاتھوں کو کانوں تک اٹھا۔ ہاتھ اٹھانے میں اس طرف اشارہ ہوگا کہ تو دنیا اور آخرت کو الوداع کر رہا ہے۔ ان سے مکمل طور پر نظر کو ہٹا رہا ہے اب تیرے دل، روح، نفس، عقل، فہم اور ذکر وفکر کا مل توجہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہو۔ پھر تو کہہ "اللہ اکبر" معنی یہ ہے کہ تمام موجودات سے بڑا ہے تمام سے اعلیٰ ہے تمام سے زیادہ عظیم المرتبۃ ہے ہر ایک سے بڑھ کر عزیز ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ وہ قیاس سے بلند تر ذات ہے۔

پھر تو کہہ "سبحانک اللھم وبحمدک" جب تجھے تسبیحات کے نور کی تجلیات حاصل ہوں گی اور پھر تو تسبیح سے تحمید کے مقام پر جب پہنچ جائے گا۔ تو پھر تو کہہ "وتبارک اسمک" اس سے تجھ پر ازلی اور ابدی نور منکشف ہوگا۔ اس لئے کہ "تبارک" سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ وہ ذات معدوم ہونے اور فنا ہونے سے پاک ہے اسے ہمیشہ کے لئے بقا حاصل ہے۔ پھر تو کہہ "وتعالیٰ جدک" اس سے یہ واضح ہوگا کہ رب تعالیٰ تمام موجودات سے زیادہ علم رکھتا ہے اور وہ تمام موجودات سے زیادہ عظمت کا مالک ہے۔ اس لئے کہ تمام صفات جلالیہ اور تمام صفات کمالیہ کا صرف وہی مالک ہے۔ پھر تو کہہ "ولا الہ غیرک" اس سے یہ پتہ چل جائے گا کہ تمام صفات کمالیہ اور تمام صفات جلالیہ صرف اسے ہی حاصل ہیں اس کے بغیر کسی اور کو حاصل نہیں۔ کامل صرف وہی ذات ہے اس کے بغیر کوئی کامل نہیں۔ مقدس صرف وہی ذات ہے اس کے بغیر کوئی مقدس نہیں "وفي الحقيقة لاهو الاهو ولا اله الا هو" حقیقت میں اس کے بغیر کسی کو حقیقی وجود حاصل نہیں۔ اس کے بغیر اور کوئی معبود نہیں۔ اس ذات کو سمجھنے سے عقل عاجز ہے۔ اس کی تعریف کما حقہ کرنے سے زبان گنگ ہے۔ اس ذات پاک کا ادراک کرنے سے فہم قاصر ہوتی ہے اس کا کامل کما حقہ تصور کرنے سے خیال متحیر ہے۔

ان چیزوں کو سمجھنے کے بعد تو کہہ ﴿ اِنِّی وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ

والْاَرْضِ﴾ بیشک میں نے اپنے آپ کو زمین وآسمان کے بنانے والے کی طرف متوجہ کیا۔اب اس تمہید کے بعد اے بندے تو یہ سمجھ کہ "سبحانک اللھم وبحمدک "ملائکہ مقربین کی معراج ہے کیونکہ انہوں نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا" ونحن نسبح بحمدک ونقدس لک "اور نبی کریم ﷺ کی معراج بھی ہے کیونکہ نماز آپ کی بھی معراج ہے اور نماز کی ابتداء "سبحانک اللھم وبحمدک " سے ہے اور "انی وجھت وجھی ......الخ" ابراہیم علیہ السلام کی معراج ہے۔اور اے بندے تو نماز کی ابتداء میں جب "انی وجھت ......الخ " اور "ان صلوتی ......الخ "اور ثناء کے ذکر کو جمع کرے گا تو تجھے ملائکہ مقربین اور عظیم انبیاء کرام کا معراج حاصل ہوگا۔

جب تو ثناء پڑھ لینے سے فارغ ہوجائے تو ﴿اَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ﴾ پڑھ تاکہ تجھے اپنے مقام کی بلندی کے حصول پر فخر اور تکبر حاصل نہ ہو اور شیطان کے مکر سے بھی محفوظ رہے۔

اے بندے تو یہ بھی خیال کر کہ تجھے کتنا بلند مقام حاصل ہوجائے گا کہ ثناء اور فاتحہ پڑھنے سے تیرے لئے جنت کے آٹھ دروازے کھول دیئے جائیں گے۔اسے یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔کہ جب معرفت کے آٹھ دروازے سورۃ فاتحہ سے کھل جاتے ہیں تو جنت کے آٹھ دروازے بھی کھول دیئے جاتے ہیں۔

پہلا : باب معرفۃ ثناء سے کھل جاتا ہے۔

دوسر : باب ذکر ہے جو ﴿بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ سے کھل جاتا ہے۔

تیسرا : باب شکر ہے وہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ سے کھل جاتا ہے۔

چوتھا : باب رجاء ہے جو الرحمٰن الرحیم سے کھل جاتا ہے۔

پانچواں : باب خوف ہے جو مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ سے کھل جاتا ہے۔

چھٹا : باب اخلاص ہے جو معرفت عبودیۃ اور معرفت ربوبیۃ سے حاصل ہوتا ہے وہ ﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ سے کھل جاتا ہے

ساتواں : باب دعاء وتضرع ہے جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ

اِذَا دَعَاہُ ۰ (یا وہ جولاچار کی دعا کوقبول کرتا ہے) اورارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ﴾ مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا ان آیات سے باب تضرع ودعاء کا پتہ چلا اور یہ دروازہ ﴿اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ﴾ سے کھلتا ہے۔

آٹھواں: باب اقتداء ہے جوارواح طیبہ کی اقتداء کے انوار سے ہدایت حاصل کرنے کا ہے یہ ﴿صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ﴾ سے کھل جاتا ہے۔اے بندے جب تو سورہ فاتحہ کواس تصور سے پڑھے گا۔نماز کوخشوع اورخضوع سے ادا کرے گا اورابھی معرفت کے جن آٹھ دروازوں کاذکرکیا جب ان کاتصور تجھے حاصل ہوگا تو تیرے لئے جنت کے آٹھ دروازے کھول دیئے جائیں گے۔

یعنی اب "جنات عدن مفتحة لھم الابواب "(جنات عدن کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے جائیں گے) کامقام حاصل ہوجائے گا۔جب یہ واضح ہوگیا کہ معرفت ربانیہ کی جنت کے دروازے فاتحہ سے کھل جاتے ہیں اور معرفت ربانیہ کے دروازے کھل جانے سے جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں تو یہی معراج روحانی ہے جونماز ادا کرنے اوراس میں سورۂ فاتحہ پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے اسی کانام عارفین کی معراج ہے۔کیونکہ عارفین نماز میں سورۂ فاتحہ کو پڑھتے وقت اسرارمعرفت کواپنے دل میں جمائے ہوتے ہیں۔

معراج جسمانی: پہلا مرتبہ معراج جسمانی کا یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کے حضوراس طرح کھڑا ہو جس طرح اصحاب کہف کے قیام کاذکرکرتے ہوئے رب تعالیٰ نے ارشادفرمایا ﴿اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ جب کھڑے ہوکر بولے کہ ہمارا رب وہ ہے جوآسمان اور زمین کارب ہے بلکہ تیرا قیام ان لوگوں کی طرح ہو جورب تعالیٰ کے حضور قیامت کے دن بڑی انکساری سے کھڑے ہوں گے جن کاذکررب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۰ (اس دن لوگ رب العلمین کے حضور کھڑے ہوں گے) جب تجھے اس طرح قیام حاصل ہوجائے تو ﴿اِنِّیْ وَجَّھْتُ اور اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ ﴾ پڑھتے ہوئے نماز کوشروع کرکے ثناء پڑھ پھر فاتحہ پڑھ پھر قرآن پاک جہاں سے آسان ہو وہاں سے پڑھ:

" واجتهد فی ان تنظر من اللہ الی عبادتک حتی تستحقرھا وایاک ان تنظر من عبادتک الی اللہ "

پھر کوشش کر کہ تیری توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی عبادت کی طرف ہو یہاں تک کہ تو اسے حقیر سمجھے اور تو اس سے اجتناب کر کہ اپنی عبادت سے رب تعالیٰ کی طرف توجہ کرے۔یعنی تیری نظر عبادت کی طرف نہ ہو اپنی عبادت کو عظیم نہ سمجھنا بلکہ اپنی عبادت کو حقیر سمجھنا اور تمہاری نظر صرف رب تعالیٰ کی طرف ہو اور یہ خیال کرنا کہ مجھے عبادت کی توفیق بھی ذات باری تعالیٰ سے حاصل ہوئی ہے۔اگر تو نے عبادت کو اولیت دی اور رب تعالیٰ کو پیچھے کیا تو تو خسارہ میں ہوگا اور تو ﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ کے راز کو سمجھنے سے قاصر رہا کیونکہ اس کا تو راز ہی یہ ہے کہ اے اللہ ہم عبادت بھی تیری امداد سے ہی کرتے ہیں۔

پھر جب تو رکوع اور دونوں سجدے کر لے گا ،اور رکوع میں رب تعالیٰ کی تسبیحات اور اس کی عظمت کو ذکر کر لیا اور سجود میں رب تعالیٰ کی تسبیحات اور علو مرتبت (بلند مرتبہ) کا ذکر جب تو نے کر لیا تو تین قسم کی طاعتیں تو نے حاصل کر لیں اور تین قسم کی مہلک چیزوں سے تو نے نجات حاصل کرنے کی سعی جمیل کر لی۔تین قسم کی طاعتیں یہ ہیں ایک رکوع اور دو سجدے اور تین مہلک چیزیں اور باعث عذاب ہر ایک شہوات جو عذاب کا سبب بنتی ہیں ان سے نجات رکوع کے ذریعے حاصل ہوتی ہے اور دوسری چیز غضب ہے جو تمام موذی چیزوں میں سے رئیس ہے۔اس سے نجات پہلے سجدہ سے حاصل ہوتی ہے۔اور تیسری چیز وہ خواہش ہے جو تمام مہلک چیزوں اور گمراہ کن چیزوں تک پہنچانے والی ہو اس سے نجات دوسرے سجدہ سے حاصل ہوتی ہے۔جب اے انسان تو ان تینوں ہلاک کرنے والی چیزوں سے نجات حاصل کر لے گا تو تجھے بلند درجات حاصل ہو جائیں گے۔جب تو یہ عظیم منصب حاصل کر لے گا تو تجھے رب تعالیٰ کی رحمت کے دروازہ کی دہلیز پر پہنچنے کا موقع مل گیا اب تو رب تعالیٰ کے حضور اپنی عبادات قولیہ ،بدنیہ ،مالیہ کا تحفہ پیش کرتے ہوئے یوں ادب سے عرض کر "التحیات للہ والصلوت والطیبات "اس کے بعد اے بندے تیری روح کی نورانیت بلندی کی طرف چڑھتی ہے لیکن اسے وہ بلندی حاصل نہیں ہوسکتی کہ وہ روح محمد ﷺ کی نورانیت سے فائدہ حاصل کر سکے اس

لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی رحمت کا تو کیا اندازہ کر سکتا ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کی نورانیت خود تیچے آ کر تیرے روح کی نورانیت کو گلے لگا لے گی۔ اب تجھے راحت حاصل ہوگی سرور حاصل ہوگا جنت کی خوشبودار ہوائیں تیری پاس آنے لگیں گی اس لئے کہ تجھے روح محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانیت سے عظیم مقام حاصل ہوگیا۔ اب تیرا بھی حق ہے کہ تو اپنے پیارے مصطفےٰ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور نذرانہ سلام پیش کرتے ہوئے یوں عرض کر "السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"۔

اب تیرے سلام پیش کرنے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یوں ارشاد فرمائیں گے:

" السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین "

اس کے بعد گویا کہ تجھے یوں کہا جائے گا کہ ذرا تو غور کر کہ تجھے یہ نعمتیں کس نے عطا کیں اور کس کے وسیلہ جلیلہ سے تو نے ان نعمتوں کو پایا ہے؟ ہاں تو اس بات کو نہ بھول یہ نعمتیں تجھے رب تعالیٰ نے عطا کی ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے وسیلہ سے تجھے یہ حاصل ہوئی ہیں۔ اب تیرے لئے یہ ضروری ہو چکا ہے کہ تو یوں عرض کر "اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمد اعبدہ ورسولہ" اب تجھ سے گویا کہ یوں سوال ہوگا کہ نبی کریم ﷺ کی ان مہربانیوں پر تو کیا ہدیہ پیش کرنا چاہتا ہے؟ پھر خود ہی تیری راہنمائی کرتے ہوئے تجھے یوں کہا جائے گا کہ تو کہہ "اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد" پھر تجھے یاد دلایا جائے گا کہ تجھ پر ساری مہربانیوں نبی کریم ﷺ کی ہیں لیکن ان کے آنے کی دعاء ابراھیم علیہ السلام نے کی عرض کیا ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ﴾ (اے ہمارے رب ان میں ان سے ہی رسول مبعوث فرما) تجھے رسول معظم ملے تو ابراہیم علیہ السلام کی وجہ سے اب تجھے چاہیے کہ تو کہہ "کماصلیت علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم" ابراہیم علیہ السلام کی دعاء سے تجھے رسول اللہ ﷺ ملے اور رسول اللہ ﷺ کے واسطہ سے تجھے عظمت ملی اور تجھے انعامات سے نوازا گیا۔ لیکن سب کچھ عطا تجھے رب تعالیٰ نے ہی کیا ہے لہذا تو کہہ "انک حمید مجید" بندہ جب رب تعالیٰ کو جماعت میں یاد کرتا ہے تو رب تعالیٰ اس سے بہتر ملائکہ کی جماعت میں اپنے بندے کو یاد کرتا ہے۔ رب تعالیٰ کے یاد کرنے پر فرشتے بندے کو ملنے کے لئے مشتاق ہوتے ہیں۔ گویا کہ وہ

اس کے قریب آ گئے اسی وجہ سے بندے کو کہا جاتا ہے تو فرشتہ کو سلام دے اور کہہ "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" اب تک جو بیان کیا اس سے واضح ہو گیا کہ بندے کو نماز پڑھنے سے معراج جسمانی حاصل ہوتی ہے۔ بیان کردہ حدیث سے جو بحث امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کی ہے اس کو راقم کی کتاب "نماز حبیب کبریاء" میں دیکھیں۔ (ماخوذ از کبیر)

اعتراض: عام طور پر یہ مشہور ہے کہ مشبہ کم درجہ رکھتا ہے مشبہ بہ سے۔ نماز میں جو درود شریف پڑھنے کا حکم دیا گیا اس میں نبی کریم ﷺ کو صلوۃ کے لحاظ پر ابراہیم علیہ السلام سے تشبیہ دی گئی تو کس طرح نبی کریم ﷺ کا افضل الانبیاء ہونا ثابت ہوگا؟

اور یہ بھی خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ نے خود اسی طرح نماز میں درود شریف پڑھنے کا حکم دیا حدیث شریف ملاحظہ ہو

" عن کعب بن عجرۃ قال قلنا یارسول اللہ ھذا السلام علیک قد علمنا فکیف الصلوۃ علیک قال قولوا اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد کماصلیت علی ابراھیم انک حمید مجید وبارک علی محمد وعلی آل محمد کمابارکت علی ابراھیم انک حمید مجید " (ترمذی باب ما جاء فی صفہ الصلوۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

کعب ابن عجرہ کہتے ہیں ہم نے کہا یارسول اللہ یہ آپ پر سلام ہے جس کو ہم نے پہچان لیا ہے۔ آپ پر صلوۃ کیسے بھیجیں آپ نے فرمایا تم کہو " اللھم صل علی محمد.....الخ" یہ سوال نماز میں درود شریف کے متعلق تھا اسی حدیث پر حاشیہ ترمذی میں ہے "ھذا السلام علیک قد علمنا ای فی التحیات للہ بواسۃ لسانک " یعنی التحیات للہ (تشہد) میں سلام آپ پر پیش کرنے کا طریقہ تو آپ کی زبان مبارک سے ہی معلوم ہو گیا اس لئے اب آپ (تشہد کے بعد) صلوۃ کا طریقہ بھی اپنی زبان ذیشان سے ہی ارشاد فرمادیں۔ اور یہ بھی ذہن سے نہ نکلنے دیں کہ رب تعالیٰ نے صلوۃ اور سلام دونوں چیزوں کا حکم دیا ہے ارشاد فرمایا ہے "صلوا علیہ وسلموا تسلیما" آپ پر صلوۃ اور سلام بھیجو۔ نماز میں تو سلام کا ذکر "السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ " میں آ گیا ہے۔ اور بعد میں درود ابراہیمی میں صرف صلوۃ کا ذکر ہے۔ اس لئے رب

تعالیٰ کے حکم پر کامل طور پر عمل ہو گیا۔لیکن نماز کے باہر صرف درود ابراہیمی پڑھنے کی رٹ لگانے والے یہ خیال نہیں کرتے کہ نماز کے باہر اگر درود ابراہیمی پڑھیں گے تو اس میں سلام کا ذکر نہیں تو رب تعالیٰ کے حکم پر کیسے عمل ہو گا۔

راقم نے یہ بحث علامہ نووی رحمہ اللہ کی شرح مسلم ج اول کے پہلے صفحہ سے لی ،اس لئے راقم کے نزدیک اگر کسی کو ندائیہ الفاظ سے درود شریف میں الرجی ہوتی ہو وہ صرف درود ابراہیمی ہی پڑھنا چاہتا ہے تو نماز کے باہر درود پڑھنے پر لفظ سلام کا اضافہ کرے اور یوں پڑھے:

" اللھم صل وسلم علی محمد وعلی آل محمد کماصلیت وسلمت علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم انک حمید مجید "

پہلا جواب: اب ذرا اصل سوال کے جوابات کی طرف توجہ کریں کہ نبی کریم مشبہ ہیں اور ابراہیم علیہ السلام مشبہ بہ ہیں تو حضور کی افضلیت کیسے ثابت ہے؟اس کا پہلا جواب یہ ہے "انہ قال تواضعا " نبی کریم ﷺ نے یہ عاجزی کے طور پر ارشاد فرمایا اور ساتھ ساتھ اپنے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ادب واحترام کا لحاظ فرمایا اس سے ابراہیم علیہ السلام کی نبی کریم ﷺ سے افضلیت ثابت نہیں ہوتی۔

دوسرا جواب: "ان التشبیہ فی الاصل لافی القدر کما فی قولہ تعالیٰ واحسن کما احسن اللہ الیک " یہاں تشبیہ اصل صلوۃ میں ہے قدرِ صلوۃ میں نہیں ۔یعنی مطلب یہ ہے کہ اے اللہ تو صلوۃ بھیج محمد (ﷺ) پر جیسا کہ تو نے ابراہیم (علیہ السلام) پر صلوۃ بھیجی ۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ تو اتنی مقدار میں صلوۃ آپ پر بھیج جتنی مقدار میں ابراہیم علیہ السلام پر بھیجیں۔یقینی بات ہے جب صلوۃ زیادہ مقدار میں نبی کریم ﷺ پر ہوگی تو شان بھی آپ کی ہی زیادہ ہوگی ۔یہاں تشبیہ کی وہی صورت ہے جو کہ قرآن پاک میں" قارون کی قوم کا مطالبہ قارون سے" مذکور ہے۔" احسن کما احسن اللہ الیک " تو احسان کر جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ پر احسان کیا۔یہ کہنے والے لوگ نیک تھے ان کا یہ مطلب نہیں تھا کہ تو لوگوں پر اتنے احسان کر جتنے تجھ پر رب تعالیٰ نے کئے ہیں بلکہ ان کا مطلب یہ تھا کہ تو بھی لوگوں پر احسان کر کیونکہ رب تعالیٰ نے تجھ پر احسان کیا ہے۔

تیسرا جواب: "ان الکاف للتعلیل " کماصلیت " میں "کاف" تعلیل کے لئے ہے تشبیہ کے لئے نہیں ۔اب معنی یہ ہوگا اے اللہ تو صلوۃ بھیج محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کیونکہ تو نے صلوۃ بھیجی ہے ابراہیم علیہ السلام پر۔ جب تشبیہ ہی ثابت نہیں تو مشبہ بہ کی افضلیت ثابت ہو رہی ہے مشبہ افضل کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ سوال ہی وارد نہیں ہوسکتا۔

چوتھا جواب: "ان التشبیه یتعلق بقوله وعلی آل محمد " تشبیہ کا تعلق آل محمد سے ہے اب معنی یہ ہوگا کہ اے اللہ محمد ﷺ پر صلوۃ بھیج (یہاں وقف) پھر۔اے اللہ صلوۃ بھیج آل محمد پر جیسا کہ تو نے ابراہیم علیہ السلام پر صلوۃ بھیجی۔ اس معنی کے لحاظ پر ابراہیم علیہ السلام کی افضلیت نبی کریم ﷺ پر ثابت نہ ہوئی بلکہ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر افضلیت ثابت ہوئی یہ درست ہے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔

پانچواں جواب: اعتراض میں جو تم نے ضابطہ بیان کیا ہے وہ اکثر یہ ہے کلیہ نہیں کبھی اس کے خلاف بھی واقع ہوتا ہے "قد یکون التشبیه بالمثل وبما دونه "کبھی تشبیہ مثل سے بھی ہوتی ہے اور کبھی کم درجہ سے بھی ہوتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں ہے "مثل نوره کمشکوۃ فیها مصباح "اس کے نور کی مثال ایسی جیسے ایک طاق کہ اس میں چراغ ہو۔

یقینی بات ہے کہ یہاں چھوٹی الماری طاق جس میں چراغ ہو اس سے تشبیہ اللہ کے نور کو اللہ تعالیٰ نے دی بہت چھوٹی واضح ہے کہ یہاں مشبہ بہ گھٹیا ہے۔اور مشبہ افضل ہے۔

(حاشیہ ترمذی بر حدیث مذکور)

☆ "عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ والذی نفسی بیده ما انزل فی التوراة ولا فی الانجیل ولا فی الزبور ولا فی القرآن مثلها وانها فهی السبع المثانی التی آتانی الله عزوجل " (ترمذی ،مستدرک حاکم ،مظهری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے نہ تو رات میں ایسی (کوئی سورت) نازل ہوئی ۔اور نہ ہی انجیل میں اور نہ ہی زبور میں اور نہ ہی قرآن میں بیشک وہ سورۃ فاتحہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا کی۔

☆ "وعن ابن عباس قال بینا رسول اللہ ﷺ وعندہ جبریل اذ سمع نقیضا من فوقہ فرفع جبریل علیہ السلام بصرہ الی السماء فقال ھذا باب فتح من السماء مافتح قط قال فنزل منہ ملک فاتی النبی ﷺ فقال ابشر بنورین اوتیتھما لم یؤتھما نبی قبلک فاتحۃ الکتاب وخواتیم سورۃ البقرۃ لن تقرأ حرفا منھا الا اعطیتہ" (رواہ مسلم ،مظھری)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ایک مرتبہ ہمارے درمیان رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے اور آپ کے پاس جبرائیل تھے جب انہوں نے اوپر سے ایک آواز سنی تو جبرائیل نے اپنی نظر کو آسمان کی طرف اٹھایا اور کہا یہ آسمانوں کا دروازہ جو کھولا گیا ہے وہ اس سے پہلے کبھی نہیں کھولا گیا اور کہا وہاں سے ایک فرشتہ نازل ہوا وہ نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور کہنے لگا۔ آپ کو دو نوروں کی بشارت ہو۔ یہ دونوں آپ کو ہی دیئے گئے آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے۔ وہ سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کی آخری آیات ہیں۔ آپ ہرگز کوئی ایک حرف بھی نہیں پڑھیں گے مگر یہ کہ آپ کو اس کے مطابق عطاء کر دیا جائے گا۔

☆ رواہ البخاری والبیھقی والحاکم من حدیث انس " افضل القرآن الحمد للہ رب العلمین " قرآن پاک میں سے افضل الحمد للہ رب العلمین (یعنی مکمل سورۃ فاتحہ) ہے۔ (مظھری)

☆ روی البخاری فی مسندہ من حدیث ابن عباس "فاتحۃ الکتاب تعدل ثلثی القرآن" سورۃ فاتحہ قرآن پاک کے دوتہائی مرتبہ کے ثواب کا درجہ رکھتی ہے۔ (مظہری)

☆ "عن السائب بن یزید قال عوذنی رسول اللہ ﷺ بفاتحۃ الکتاب فی تفلا ......رواہ الطبرانی فی الاوسط"

سائب ابن یزید سے مروی ہے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ فاتحہ سے دم کیا اور میرے منہ میں اپنا لعاب مبارک لگایا (مظہری) (فاتحہ کے ذریعے دم کرنا اور شفاء حاصل کرنا سنت ہے فاتحہ کے اسماء کی بحث میں یہ ذکر ہو چکا ہے۔

☆ وعن انس اذا وضعت جنبک علی الفراش وقراءت فاتحۃ الکتاب وقل ھو اللہ احد فقد امنت کل شئی الاالموت" (رواہ البزار)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب تم بستر پر لیٹو تو سورۃ فاتحہ اور قل ھو اللہ احد پڑھو تو تم ہر چیز سے امن میں ہو گے (یعنی ہر چیز سے محفوظ ہو جاؤ گے) سوائے موت کے۔

النبذۃ : سورۃ فاتحہ ام القران ہے اصل القرآن ہے اور رئیس القرآن ہے قرآن پاک کے تفصیلی مسائل کو اجمالی طور پر شامل ہے۔ اس لئے کہ اسے قرآن پاک کے عنوان اور دیباچہ کی حیثیت حاصل ہے۔ عنوان اور دیباچہ سے اجمالی طور پر علم حاصل ہو جاتا ہے۔ سورۃ فاتحہ سے فقہی احکام حاصل ہو سکتے ہیں اعتقاد واصول کے قواعد حاصل ہو سکتے ہیں اور علم الکلام کے مسائل کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسی سورۃ سے یہ حاصل ہو رہا ہے کہ رب تعالیٰ واجب الوجود ہے۔ اور وہ **وحدہ لاشریک لہ** ہے ساری حمدیں اسی کی ذات کے ساتھ خاص ہیں۔ بندوں کے تمام افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ رازق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے انسان خواہ وہ رزق حلال ذرائع سے حاصل کرے یا حرام طریقہ سے یہ اس کے اپنے دیئے ہوئے اختیارات کے استعمال کی وجہ ہے۔ طاعت کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ انعامات سے نوازتا ہے اور کفار کو عذاب دیتا ہے یوم حشر نے یقیناً قائم ہونا ہے اور حساب کا ہونا حق ہے پل صراط سے گزرنا بھی یقینی جنت دوزخ پیدا کی جا چکی ہیں۔ عبادت کو خلوص سے ادا کیا جائے عبادت کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے اللہ تعالیٰ جسے چاہے ہدایت عطا فرمادے اور جسے چاہے ہدایت سے محروم رکھے۔

ہم نے اپنے نبی کریم ﷺ کی شریعت پر ہی عمل کرنا ہے اگر کوئی اعمال پہلی شریعتوں کے ہماری شریعت میں آجائیں تو ہم ان پر صرف اس لئے عمل کریں گے کہ یہ ہمارے نبی کریم ﷺ کی شریعت کا مسئلہ ہے اس لئے نہیں کہ یہ تورات یا انجیل کا مسئلہ ہے ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اہل سنت وجماعت مسلمانوں کے طریقہ کی تابعداری کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے مجتہدین ،علماء صالحین ،کاملین کا اجماع امت ہے جو حجت ودلیل ہے جس سے احکام ثابت ہوتے ہیں۔ یہ تمام مسائل جو النبذۃ (خلاصہ کلام) میں ذکر کئے ہیں ان کو پہلے ذکر کی ہوئے بحثوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ غور وفکر سے ان مسائل کو حاصل کرنا کوئی مشکل نہیں۔ (ماخوذ از تفسیرات احمدیہ)

مسائل ضروریہ : بسم اللہ شریف کا پڑھنا ہر رکعت میں فاتحہ سے پہلے مسنون ہے "**وان قرأھا مع کل سورۃ فحسن**" ہر سورۃ کے شروع میں "بسم اللہ کا پڑھنا مستحسن ہے۔ بسم اللہ کا پڑھنا

واجب نہیں سورۃ فاتحہ سے پہلے بھی اور ہر سورۃ سے پہلے بھی اس لئے کہ یہ ہر سورۃ کا حصہ نہیں اور ہر سورۃ میں تکرار کی احتیاج نہیں:

" عن ابن عباس قال کان النبی ﷺ لایعرف فصل السورتین حتی ینزل بسم الله الرحمن الرحیم "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کو دو سورتوں کے درمیان فرق کی پہچان کے لئے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" نازل کی گئی۔ جن نمازوں میں امام نے قراءت بلند آواز سے کرنی ہے۔ بسم اللہ ان میں بلند آواز سے نہیں پڑھی جائے گی بسم اللہ کا بلند آواز سے پڑھنا بدعت ہے۔" روی حماد عن ابراھیم قال کان عمر یخفیھا ثم یجھر بفاتحة الکتاب " حضرت ابراہیم سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مخفی پڑھتے (یعنی ثناء، تعوذ، تسمیہ آہستہ آواز میں پڑھتے) پھر بلند آواز سے فاتحہ پڑھتے۔" قال ابراھیم کان عبد الله بن مسعود و اصحابه یسرون قراءة بسم الله الرحمن الرحیم لایجھرون بھا" ابراہیم نے کہا عبد اللہ ابن مسعود اور ان کے احباب "بسم اللہ الرحمن الرحیم" آہستہ آواز میں پڑھتے تھے بلند آواز سے نہیں پڑھتے تھے۔" روی انس ان ابابکر وعمر کانا یسران بسم الله الرحمن الرحیم " حضرت انس سے روایت ہے کہ بیشک حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بسم اللہ آہستہ پڑھتے تھے:

" وکذالک روی عنه عبد الله بن المغفل وروی المغیرة عن ابراھیم قال جھر الامام ببسم الله الرحمن الرحیم فی الصلوة بدعة "

عبد اللہ بن مغفل نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی اور مغیرہ نے ابراہیم سے روایت بیان کی کہ امام کا بلند آواز سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا پڑھنا بدعت ہے۔ (از احکام القرآن للجصاص)

خاتمہ بالخیر: سورۃ فاتحہ کی تفسیر کو ایک عظیم قول پر ختم کر رہا ہوں۔ جس کا تعلق سورۃ فاتحہ کی فضیلت سے بھی ہے اور نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت سے بھی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے ذکر خیر میں میرے روح جان میرے دل کی دھڑکن، میرے قلب کا سرور، ہر وقت میرے دل میں موجود رہنے والی ایک عظیم ہستی محسن اہل سنت، مفکر اسلام، مفسر قرآن ضیاء الامت حضرت علامہ پیر محمد کرم شاہ بھیروی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف بے مثال "ضیاء النبی"

میں درج فرمایا۔علامہ ابوالقاسم سہیلی لکھتے ہیں:

" ان ابلیس لعنه الله رن اربع رنات ،رنة حین لعن ، رنة حین اهبط ورنة حین ولد رسول الله صلی الله علیه وسلم ورنة حین انزلت فاتحة الکتاب قال والرنین والنخار من عمل الشیطن" (روض الانف جلد اول ص ۱۸۱)

ابلیس ملعون زندگی میں چار مرتبہ چیخ مار کر رویا پہلی مرتبہ جب اس کو ملعون قرار دیا گیا دوسری مرتبہ جب اسے بلندی سے پستی کی طرف دھکیلا گیا۔تیسری مرتبہ جب سرکار دوعالم کی ولادت باسعادت ہوئی۔چوتھی مرتبہ جب سورۂ فاتحہ نازل ہوئی۔علامہ ابن کثیر نے بھی علامہ سہیلی کی اس عبارت کو السیرۃ النبویہ ص ۲۱۲ جلد اول میں جوں کا توں نقل کیا ہے۔اور ابن سید الناس نے "عیون الاثر" ص ۲۷ جلد اول میں بھی اس روایت کو بعینہ درج کیا ہے۔ (ضیاء النبی ج ۲ ص ۵۶)

شکرِ باری تعالیٰ:

نبی کریم ﷺ کی رحمت کاملہ اور میرے مرشد حضرت پیر غلام محی الدین المعروف بابو جی گولڑوی رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان کے پوتے حضرت پیر نصیر الدین نصیر مدظلہ العالی کی نظر عنایت اور میرے والدین کی دعاؤں اور اساتذہ کرام کی مہربانیون بالخصوص رئیس المحققین والمدرسین استاذی المکرم حضرت علامہ محمد اشرف صاحب سیالوی مدظلہ العالی کی نظر شفقت سے اللہ تعالیٰ نے عظیم انعام سے نوازا کہ میں نے 6 جمادی الاولی 1412ھ 7 اگست 2000ء بروز پیر بوقت سحر سورۂ فاتحہ کی تفسیر کو شروع کیا تھا۔آج 28 رجب 1412ھ 27 اکتوبر 2000ء بروز جمعہ مبارک بعد از نماز فجر ختم کیا ابھی مقدمہ ترتیب دینا ہے رب تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آئندہ بھی قرآن پاک کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین بجاہِ سید المرسلین ﷺ

(عبد الرزاق بھترالوی ، حطاروی ابن قاضی عبد العزیز)

(ابن قاضی فیض احمد ابن غلام نبی رحمهم الله تعالی)